جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کامیاب ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2015ء

www.urdudigest.pk

ہندو سے مسلمان
پروفیسر بننے تک

ہزاروں برس کی زندگی کا آرزومند انسان کیا مشین کے قالب میں ڈھل جائے گا؟

صفحہ ۸۷

PDFBOOKSFREE.PK

پنڈت نہرو کا عشق

کارگل جنگ میں ایک
مجاہد کی داستان شجاعت

موبائل بیٹری محفوظ
رکھنے کے نادر گر

www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ

اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو ادب سے روشناس کرائیے، آپ گزشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفتاً بھی بھجوا سکتے ہیں، یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

کامیاب افراد کے حالات زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ، خصوصی انٹرویوز، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالات حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، اسلامی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کیمیا، سیرت نبویؐ، اُردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ.....

ایک شمارہ ۵۰ روپے میں

۱۲ شمارے	۶۰۰ روپے
۲۴ شمارے	۱۰۰۰ روپے
۳۶ شمارے	۱۵۰۰ روپے

ڈاک خرچ، کوریئر چارجز اس کے علاوہ ہوں گے

پہلے پائیے

شمارے حاصل کرنے کے لیے اپنا ایڈریس اور موبائل نمبر میسج کریں

subscription@urdu-digest.com

www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

معبود

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے ارشاد فرمایا: اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔ (الانبیاء:۲۵)

اللہ کی مدد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی مدد کریں گے جس دن اعمال لکھنے والے فرشتے گواہی دینے کھڑے ہوں گے۔

(المومن:۵۱)

رسول ﷺ کا فرمان

اہل جنت

حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”خطاب کے بیٹے! جاؤ، لوگوں میں یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے۔“

(رواہ مسلم، باب غلظ تحریم الغلول، رقم: [illegible])

ایمان کا مزا

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ”ایمان کا مزا اس نے چکھا (اور ایمان کی لذت اُسے ملی) جو اللہ کو رب، اسلام کو دین اور محمد ﷺ کو رسول ماننے پر راضی ہو جائے۔“

(رواہ مسلم، باب الدلیل علی أن من رضی باللہ ربا، رقم: [illegible])

www.pdfbooksfree.pk

مئی 2015ء
رجب المرجب 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 5
urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
قاسم محمود
[illegible]
حافظ [illegible]
فاروق اعجاز قریشی
افنان کامران قریشی
[illegible]
عبدالرحمن، اشرف [illegible]

[illegible]: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

advertisement@urdu-digest.com
[illegible] 0300-4005579
[illegible] اعجاز الحق [illegible]

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
فون 042 37500957 [illegible]
[illegible] 1500 [illegible] 1000 [illegible]
[illegible] 60 [illegible]
[illegible]
[illegible]
URDU DIGEST Current A/C No. 600380
[illegible] (Samanabad, Lahore.)
[illegible] Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325، G-[illegible] جوہر ٹاؤن، لاہور
+92-42-35290738 [illegible] +92-42-35290731 :فیکس
editor@urdu-digest.com
[illegible]

غیر جذباتی، پراسرار چینی قوم

شنگھائی میں مصروف ترین ایک ہفتہ گزارنے کے بعد ہماری اگلی منزل شینڈونگ کا دارالحکومت، جینان شہر تھا۔ ہماری ہنستی مسکراتی چینی میزبان یانگ، جو جینان شہر کے دو روزہ دورے کے دوران مترجم کا کردار ادا کرتی رہی نے ریلوے اسٹیشن کے باہر ہمیں الوداع کہا۔ میں اور برادر ذکی اعجاز آرام دہ وین سے نکل کر اپنا سامان تھامے بیجنگ جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف بڑھے [illegible] ایک [illegible] عمارت کی پیشانی پر آویزاں ایک بہت بڑی اسکرین پر [illegible] کا سرکاری چینل (CCTV) چینی صدر شی جن پنگ کے دورۂ پاکستان کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ چینی بڑی توجہ سے اپنے لیڈر کا پاکستان میں پرتپاک استقبال [illegible] کر خوش ہو رہے تھے۔

پچھلے بیس سال میں مجھے متعدد بار [illegible] اور مختلف صوبوں، شہروں اور قصبوں کی سیاحت کے ساتھ ساتھ ان کی [illegible] قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اب ہر کاروباری شعبے کی سب سے بڑی نمائش [illegible] چینی شہر میں منعقد ہوتی ہے۔ چند سال پہلے تک یہ نمائش امریکا یا یورپ [illegible] شہروں میں [illegible] ہوتی تھی لیکن اب حالات بدل چکے۔ خصوصاً شنگھائی کا [illegible] انٹرنیشنل [illegible] سنٹر بین الاقوامی نمائشوں کا مرکز بن چکا۔ اس دفعہ بھی دورے کا اہم مقصد شنگھائی میں منعقدہ ایک نمائش اور کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔

دورے کے دوران بہت سے کاروباری اور [illegible] اداروں کے سربراہان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ سب چینی صدر کے دورۂ پاکستان سے بہت خوش تھے۔ [illegible] کہ پاکستان سے معاشی تعلقات میں مزید مضبوطی آئے۔ چین کو اپنی معاشی ترقی کو برقرار رکھنے کے لیے پاک چین اقتصادی راہداری کی اشد ضرورت [illegible] ہے۔ وہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم مصمم کر چکے۔ اس حوالے سے چینی حکومت نے پاکستان کے تمام سیاست دانوں خصوصاً مذہبی راہنماؤں [illegible] بارہا چینی [illegible] کے شکوک و شبہات ختم کیے۔ اکنامک کوریڈور [illegible] منصوبوں سے سنکیانگ کے لاکھوں مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ پاکستان کے جھنگ جیسے کم ترقی یافتہ علاقے بھی بے انتہا فوائد پائیں گے۔ اکنامک کوریڈور کے منصوبوں میں [illegible] چینی کمپنیاں ہی کام کریں گی۔ منصوبوں کی تکمیل کے بعد اپنا سرمایہ [illegible] اپنے ملک لے جائیں گی۔ لیکن بہرحال یہ منصوبے طویل مدت تک پاکستان کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

پست قامت، گول چپٹی آنکھوں اور ننھے منے ہاتھوں والے چینی جنہیں

www.pdfbooksfree.pk

انگریزی زبان کے چند فقرے سیکھنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں، انھوں نے کرشمے کر دکھائے ہیں۔ ان کے کامیاب ہونے کی ایک بڑی وجہ ریاست اور حکومت کا طاقتور اور مستعد ہونا ہے۔ چین کی آبادی ایک ارب ۳۶ کروڑ ہے۔ پھر وہاں کروڑوں سیاح آتے ہیں۔ ان سب کی نقل و حرکت پر جگہ جگہ نصب کے سی سی ٹی وی کیمروں اور خفیہ اداروں کے ذریعے ریاست ہر وقت نظر رکھتی ہے۔ کوئی بزنس مین، فنکار اور مذہبی شخصیت ریاست سے زیادہ طاقتور نہیں۔ وردی میں ملبوس کم عمر، پست قامت اور کمزور سے چینی کے سامنے امیر و غریب سب قطار لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

چین میں شہری گوگل، واٹس ایپ، وائبر اور فیس بک کا استعمال نہیں کر سکتے، کیونکہ حکومت نے اپنے تیار کردہ متبادل سافٹ ویئر انھیں دیے ہیں تاکہ ان کے ڈیٹا پر اپنا کنٹرول رکھ سکے۔ ای میل کے نظام پر بھی حکومت کی کڑی نظر ہے اور کئی فلٹروں کے بعد ہی ای میل متعلقہ کمپیوٹر تک پہنچ پاتی ہے۔

چینی دراصل غیر جذباتی اور پُراسرار قوم ہے۔ نئی نسل مذہب سے بہت دور ہو چکی۔ آبادی پر کنٹرول کے لیے چین نے ایک بچے کی پالیسی اپنائی۔ اس کا فائدہ تو بہت پہنچا، لیکن اب حالت یہ ہے کہ ایک نوجوان کو اوسطاً ۱۲ بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ صحت کی اچھی سہولتوں سے عمریں طویل ہو گئیں اور اب بوڑھوں کا بوجھ نوجوان اٹھا رہے ہیں۔ نوجوان نسل میں اسلام اور پاکستان سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن چینیوں کے دلوں میں پاکستان کے لیے احترام اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی نے چینی عوام کے لیے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مختلف وجوہ کی بنا پر امریکا، روس اور یورپ میں چینی اشیا کی ایکسپورٹ بتدریج کم ہو چکی جس کا منفی اثر چینی معیشت پر بھی پڑا۔ اسی لیے حکومت اکنامک کوریڈور جیسے منصوبوں پر تیزی سے عمل کر کے اپنی معیشت میں بہتری لانا چاہتی ہے۔

چینی ترقی کا بیشتر سہرا انفراسٹرکچر کی تعمیر پر ہے۔ بڑی بڑی ہائی ویز، تیز رفتار ریل کا نظام، بے شمار ہوائی اڈے، اونچے اونچے ٹاورز اور عمارتیں، آبی ڈیم اور سڑکیں، روڈز کسی اندرونی و بیرونی تنازع میں الجھے بغیر تعمیر کرتے چلے جانا بھی اس قوم کی ترقی کا راز ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے منصوبے بن تو رہے ہیں، لیکن چین اور پاکستان کے مابین براہ راست ذریعہ آمدورفت صرف پی آئی اے ہے۔ پی آئی اے کی ہفتے میں صرف دو پروازیں بیجنگ جاتی ہیں۔ تھائی ایئرویز کے ذریعے جائیں تو بنکاک ہوائی اڈے پر تو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چین کی تو کوئی پرواز پاکستان آتی ہی نہیں۔ یہ مسئلہ مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان اور چین کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ دیگر تمام بڑے پاکستانی و چینی شہروں کے لیے اپنی ایئر لائنوں کی براہ راست پروازوں کا بندوبست کریں۔ یوں سفر جلد طے ہونے سے باہمی کاروبار و تجارت میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے لافانی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

ہندو جو مسلمان ہو کر پروفیسر بنا

یہ ایک ایسے خوش قسمت انسان کی آپ بیتی ہے جو ہندو گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اوائل عمری ہی میں خواب کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کی خبر جب خاندان کو پہنچی، تو انھوں نے اُسے دوبارہ ہندو بنانے کے لیے بے شمار ہتھکنڈے آزمائے لیکن وہ مذہب اسلام پر سختی سے قائم رہا۔ یہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز داستان مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۳۶

میں نے کینسر کا مریض صحت یاب کر دیا

یہ انٹرویو ایک ایسے معالج کا ہے جو پردہ چشم کے دائروں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر قدرتی طریقہ علاج (جڑی بوٹیوں) سے تمام انسانی بیماریوں کا شافی علاج کرتے ہیں۔ بطور خاص سرطان، گھٹنوں کے درد، ذہنی دباؤ کے کئی مریض ان کی تحقیق سے شفا پا چکے۔ ان کی باتیں موذی مرض میں مبتلا مریضوں کے لیے مفید معلومات رکھتی ہیں۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۴۴

اردو ادب کی محتسب

راشد اشرف کا یہ مضمون اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور مزاح نگار مشفق خواجہ کی شخصیت، ادبی خدمات اور مزاحیہ تحریروں کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ روزنامہ جسارت اور تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ جن لوگوں پر آپ نے مزاحیہ کالم لکھے، ان کے انتقال پر وہ سب سے زیادہ یہ کہہ کر روئے کہ اب ہم پر کون قلم اٹھائے گا؟ یہ دلچسپ سوانحی مضمون مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۸۴

ایک مہیب کا سوال

اردو کے ممتاز کہانی کار، بلونت سنگھ کا یہ منفرد افسانہ ایک افسر اور وفادار ہیڈ کلرک رگوناتھ کے درمیان ہونے والی پراثر گفتگو اور انسانی مثبت رویے کو زیر بحث لاتا ہے۔ زلزلے میں سب کچھ تباہ ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہیڈ کلرک رگوناتھ کے گھر کچھ نہیں بچتا۔ لیکن غیرت نے اُسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہ دی۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۴۲

شیطانی وار

یہ ایسا معاشرتی موضوع اجاگر کرتی کہانی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا عمل کر گزرتا ہے جو اس کی شان اور عزت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ توقیر عائشہ کی اس کہانی میں بھی ایک معزز و محترم شخص کے ذہن میں [illegible] سوچ پیدا ہوئی جس سے وہ خود کو قصوروار ٹھہرا کر مجرم تصور کرنے لگا۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۵۶

www.pdfbooksfree.pk

کامیاب کاروباری بننے کی خواہش تو ہر دل میں موجود ہے لیکن جن راستوں پر چل کر یہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے، وہ ہر کسی کی دسترس میں نہیں آپاتے۔ طیب طارق نے اس مضمون میں تحقیق کے ساتھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو خصوصاً ایکسپورٹ کے کاروبار کی بابت ہر سطح پر قارئین کی بہت راہنمائی کرتی ہیں۔ مزید تفصیل جاننے کے لیے پڑھیے صفحہ نمبر: ۶۴ الف

اس منفرد سفرنامے میں مصنف نے دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان ''کھیوڑہ''، ہندومت کے تاریخی مقام ''کٹاس راج'' اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین ''کلرکہار'' کی تاریخ اور قدرتی مقامات اپنے قلم کا موضوع بناتے ہوئے ان کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کی ہیں۔ دلچسپ سفرنامہ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۴۶

بچے ہی ہر گھر میں رونق بڑھاتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص تحفہ ہیں۔ جہاں بچے نہ ہوں، وہ گھر ویرانے کی شکل دھار لیتا ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک والد نے اپنی حاضر دماغ بیٹی کی دلچسپ باتیں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کی ہیں۔ ان میں خوبصورتی، سادگی، محبت اور چاہت کا بھرپور احساس موجود ہے۔ اس دلچسپ اور محبتوں بھری کہانی کو مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۷۳

دنیا کے بلند اور مشکل ترین محاذ جنگ میں پاک فوج کے بہادر اور غیور جوانوں نے اپنے لہو سے بہادری کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں جن کا ذکر تا قیامت دنیا کی عسکری تاریخ میں ہوتا رہے گا۔ لیفٹیننٹ فیصل رضا گھمن جو بھارتی فوج سے برسرِ بدست جنگ کرتے ہوئے کارگل کے میدان میں شہید ہوئے۔ جرأت اور بہادری کی اس داستان کو مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۶۵

سلیم اختر کی یہ پراسرار کہانی دولت کی ہوس اور لالچ کے اندھے پن میں مبتلا ایک نوجوان جبار کے گرد گھومتی ہے جو چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا اور اس وقت واپس آیا جب والد سمیت جائداد کے تمام حقیقی وارث فوت ہو چکے تھے۔ اسی لالچ میں وہ اپنی بیگم کو ساتھ لیے تابوت خانے میں اتر گیا جہاں اس کے باپ دادا اور پردادا تابوتوں میں دفن تھے۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۹۰

www.pdfbooksfree.pk

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

16 کچھ اپنی زبان میں 17 ہم کہاں کھڑے ہیں

33 [illegible] بشیر احمد بھٹی
ایک ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی آسانی سے حل کر ڈالی

42 [illegible] ڈاکٹر ندیم بھٹی
عالم اسلام میں پہنچنے والا دور جدید کا ایک المیہ

46 [illegible] پروفیسر خالد پرویز
نیکی کا راستہ دکھلانے والے نصیحت آموز واقعات

اردو ادب

58 [illegible] نیلم احمد بشیر
86 [illegible] جاوید بسام
92 [illegible] ابوالاثر حفیظ جالندھری
[illegible] [illegible] راحت عائشہ
120 [illegible] سلمیٰ اعوان
142 [illegible] تنویر اقبال واگھوارہ
182 [illegible] جیک رچی
[illegible] [illegible] ناہید ہاشمی
209 [illegible] محسن فارانی

189 [illegible] عالیہ فاطمہ

29 [illegible] محمد علی صدیقی
30 [illegible] صالحہ محبوب
[illegible] [illegible] عبدالغفار نوابشاہی
35 [illegible] ابوصارم
89 [illegible] ہادی خان
[illegible] [illegible] عائشہ ظاہر
103 [illegible] محمد خلیل چودھری
123 [illegible] فقیر اللہ خان
131 [illegible] محمد اسلم لودھی
152 [illegible] سراج دین
177 [illegible] رضی احمد سند
201 [illegible] حبیب اشرف صبوحی
206 [illegible] کنہیا لال کپور
[illegible] [illegible] ملک محمد شاہد اقبال
[illegible] [illegible] خادم حسین مجاہد
228 [illegible] پروفیسر شبانہ اصغر

[illegible] قصہ کوئز [illegible] چمن خیال [illegible] تبصرہ کتب
[illegible] مشورہ حاضر ہے [illegible] پوچھو تو جانیں

www.pdfbooksfree.pk

صدر شی چن پنگ کے دورۂ پاکستان کے موقع پر جو حیات افروز مناظر طلوع ہوئے' ان سے امیدوں کا ایک چمن کھل اٹھا ہے۔ امید ہی نوجوانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اب پوری قوم کو شاہراہ امید پر ایک نئے عزم اور ایک نئے اعتماد کے ساتھ سفر کا آغاز کرنا چاہیے۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستان سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے ہمارے سب سے قابل اعتماد اور آزمودہ دوست نے ہمارا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہمیں اپنی اہلیت' صلاحیت اور عظمت کا احساس دلایا ہے اور یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ ہم جلد ایشین ٹائیگر بن سکتے ہیں۔ چین کے صدر نے پاکستان کو اپنا "فولادی بھائی" قرار دیا اور اعلان کیا کہ چین کے عوام اپنے بھائیوں کے استحکام' ترقی اور خوشحالی کے لیے تعاون کی راہیں کشادہ کرتے جائیں گے۔ پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے پاکستان کو خراج تحسین پیش کیا کہ آپریشن ضرب عضب دہشت گردی کے قلع قمع میں زبردست کردار ادا کر رہا ہے اور ہمارے مغربی علاقے بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس پر وزیراعظم نواز شریف نے اپنے اختتامی کلمات میں کہا "چین کی سلامتی پاکستان کی سلامتی ہے"۔ ان مخلصانہ جذبات پر مبنی تقاریر سے پہلے ۴۶ ارب ڈالر کے معاہدوں اور منصوبوں پر دستخط ہوئے اور چین کے صدر نے بعض منصوبوں کی نقاب کشائی بھی کی جن میں پارلیمان ہاؤس کو شمسی توانائی فراہم کرنے کا منصوبہ ایک بہت بڑی علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔

آئندہ دس پندرہ برسوں میں پاکستان کے اندر چھیالیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے ایک عظیم الشان اقتصادی تبدیلی سے ہمکنار ہو سکتی اور توانائی کے شعبے میں زبردست انقلاب لا سکتی ہے۔ ان معاہدوں میں ۳۲ ارب ڈالر توانائی کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ چین پاک اقتصادی راہداری' جس پر ۲۰۱۳ء میں وزیراعظم کے دورۂ چین کے موقع پر دستخط ہوئے تھے' اس میں گوادر سے کنجراب تک ریل اور سڑکوں کا جال بچھانا اور صنعتی منطقے قائم کرنا اور چین و گوادر کے ذریعے افریقہ اور یورپ کے براعظموں تک پہنچنے کا ایک مختصر اور محفوظ راستہ فراہم کرنا ہے۔ یہ وہی گزرگاہ ہے جہاں سے دنیا کی ساٹھ فیصد تجارت اور تیل کی رسد فراہم ہوتی ہے۔ چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی معاشی طاقت ہے۔ وہ اپنی تجارت کو فروغ دے کر سپر پاور بننے کی تیاری کر رہا ہے اور پاکستان اس کا اہم سنگ ہے۔ ان معاشی سرگرمیوں سے پورے خطے کی تقدیر بدل سکتی اور پاکستان علاقائی تجارت کا مرکز بن سکتا ہے۔ قوموں کی

www.pdfbooksfree.pk

زندگی میں ایسے نادر مواقع شاذونادر ہی آتے ہیں۔ پاکستان نے چین کا ہاتھ اس آن استقامت اور جرأت سے تھاما جب وہ دنیا میں تنہا تھا اور اس کے ساتھ رابطے پیدا کرنا عظیم طاقتوں کی نگاہ میں بہت بڑا جرم تھا۔ امریکہ نے چین کو آزادی کے تیس برس بعد تسلیم کیا جبکہ پاکستان نے تمام خطرات کو خاطر میں لائے بغیر اسے تسلیم کرنے میں پہل کی تھی۔ اب اس دوستی کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔

اتنی بڑی سرمایہ کاری کے ثمرات عام آدمی تک پہنچانے کے لیے حکومت پاکستان اپنے اندر بڑی تبدیلیاں لانے کا عمل فوری طور پر شروع کر سکتی ہے۔ ہمارا انتظامی ڈھانچہ انتہائی فرسودہ ہے اور سیاسی نظام کے اندر بھی شفافیت لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری کمپنیاں اور ہمارے مزدور عالمی معیار سے بہت نیچے ہیں اس لیے ہمیں اصلاحات کی ایک تحریک چلانا ہوگی اور استعداد کار میں اضافے کے لیے بڑے پیمانے پر تربیتی مراکز قائم کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ اچھی حکمرانی اور قابل اعتماد ڈیلیوری سسٹم کے قیام پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ ایک اہم بات یہ کہ قوم کے اندر چینی زبان سیکھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ منصوبوں پر کام کرنے کے لیے لاکھوں چینی پاکستان آئیں گے اور سنکیانگ کے پس ماندہ علاقوں میں کام کرنے کے لیے اتنی ہی تعداد میں پاکستانیوں کی مانگ پیدا ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ چینی زبان پڑھانے کے انتظامات اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شروع کر دیے جائیں جو دائمی دوستی کو ایک عظیم تہذیبی معنویت اور بلندی سے ہم کنار کریں گے۔

ہمیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہونا چاہیے کہ بعض ممالک اور عناصر کے لیے پاکستان اور چین کی اسٹریٹجک شراکت داری اور اتنے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ اقتصادی راہداری کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات کو ہوا دیں گے۔ اس کا سب سے مؤثر دفاع حکومت کے دانش مندانہ اور منصفانہ اقدامات ہی سے ہو سکے گا۔ اقتصادی راہداری کے مختلف نقشے گردش کر رہے ہیں جن سے خدشات جنم لے سکتے ہیں۔ وہ علاقے جہاں سے شاہراہیں گزریں گی اور ترقیاتی منصوبے شروع ہوں گے وہاں کے نمائندہ لوگوں اور پارلیمانی جماعتوں کے سربراہوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ اب جمہوریت کا دور دورہ ہے اور اس واقعے پر جائز گرفت ہو رہی ہے کہ معاہدوں پر دستخطوں کی تقریب میں تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کیوں شامل نہیں کیے گئے۔ یہ معاملات غیر معمولی احتیاط اور چابک دستی اور دور اندیشی کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ معاہدے اور منصوبے دونوں طرف کے عوام کی پُرجوش تائید برسوں کی ریاضت سے وجود میں آئے ہیں اس لیے انھیں عوام کی تائید حاصل ہے۔ انشاءاللہ یہ وقت پر تکمیل پذیر ہوں گے۔ فوجی قیادت نے چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک الگ ڈویژن قائم کر کے کامیابی کا سگنل دے دیا ہے۔

الطاف حسن قریشی

www.pdfbooksfree.pk

غیرذمے دارانہ رویوں کے شرارے

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہماری تاریخ میں جہاں اچھے فیصلوں کے سہانے مناظر دکھائی دیتے ہیں، وہاں جذباتی لمحات میں اختیار کیے گئے سیاسی رویوں کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہم جن مشکلات کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں، ان کے اسباب میں وقتاً فوقتاً حکمرانوں کی بے تدبیریوں کے علاوہ بعض خودسر اور خودپسند سیاست دانوں کے غیرذمے دارانہ فیصلے بھی شامل ہیں۔ ہم اگر دیانت داری سے ان کا محاسبہ نہیں کریں گے، تو تاریخ ہمارا تیاپانچا کر کے رکھ دے گی۔ قدرت نے پاک چین دوستی کی صورت میں ہمیں اپنی حالت بہتر بنانے کا ایک نادر موقع عطا کیا ہے۔ اس کا اولین تقاضا ہے کہ ہم امید کے چراغ فروزاں رکھیں۔ اپنی تاریخ کے مطالعے سے یہ تلخ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دو افراد کے درمیان اقتدار کی کشمکش یا حد سے بڑھی ہوئی نفرت نے ہماری سیاست میں بہت بگاڑ پیدا کیا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آتے ہی وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں اور حسین شہید سہروردی کے درمیان سیاسی رقابتوں کا سلسلہ چل نکلا جس سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان بدگمانیاں جنم لینے لگیں۔ اس کے ساتھ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین عوام کی حمایت حاصل کرنے کی خطرناک دوڑ شروع ہو گئی اور صوبائی خودمختاری کا مطالبہ علیحدگی کی حدوں کو چھونے لگا۔ مولانا بھاشانی نے ''جگتو فرنٹ'' بن جانے پر ۱۹۵۴ء ہی میں مغربی پاکستان کے عوام کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے السلام علیکم کہہ دیا تھا۔

پنجاب میں جناب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کے مابین سیاسی کشمکش ایک ایسی بھیانک شکل اختیار کر گئی تھی کہ بابائے قوم قائداعظم بھی اس کا مداوا نہ کر سکے۔ اسی رسہ کشی میں جمہوریت کا چراغ گل ہوا۔ آپ تاریخ پڑھتے جائیے اور آپ کو ہر مرحلے پر متحارب گروپ نظر آئیں گے جن کی حشر سامانیاں آج بھی آگ کو ہوا دے رہی ہیں اور شرارے شعلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ دہشت گردی کا عفریت کیسے پیدا ہوا، انتخابات میں منظم دھاندلی کی تحریک میں پس پردہ عناصر کہاں کہاں تھے، ہمارے سعودی عرب سے تعلقات میں نقب لگانے کی سازش کہاں پر تیار ہوئی اور ایم کیو ایم کو حیات نو بخشنے کی تیاریاں کس طرف سے ہو رہی ہیں۔ ان عجیب و غریب واقعات کے پس منظر میں ہمارے بعض سیاست دانوں اور اداروں کے آمرانہ اور انتہائی غیرذمے دارانہ رویے اور فیصلے شامل ہیں جن کی نشان دہی مستقبل میں پہنچنے والے نقصان کی روک تھام کے لیے ناگزیر ہے۔

٭٭٭

www.pdfbooksfree.pk

چین کے صدر کا دورۂ پاکستان ستمبر ۲۰۱۴ء میں طے پاچکا تھا جو آٹھ ماہ کی تاخیر سے ۲۰ اپریل ۲۰۱۵ء کو وقوع پذیر ہوا۔ یہ تاخیر ان دھرنوں کے باعث ہوئی جس کی دھول عمران خان اور علامہ طاہرالقادری کئی ماہ تک پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں اڑاتے اور شاہراہِ دستور پر رقص کناں رہے۔ چیئرمین صاحب جب بارہ اگست کی رات لاہور سے روانہ ہوئے تو انھیں کمک پہنچنے کے انتظار میں دس بارہ گھنٹے گوجرانوالہ میں قیام کرنا پڑا۔ انھیں معلوم تھا کہ ستمبر میں چین کے صدر پاکستان کا دورہ کرنے والے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے دارالحکومت میں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کیا، پارلیمان ہاؤس کے گیٹ کا محاصرہ کیے رکھا، ایوانِ صدر کی طرف جانے والے راستے کنٹینر لگا کر بند کر دیے اور وزیراعظم ہاؤس پر حملے جاری رکھے۔ کچھ روز بعد پی ٹی وی اسٹیشن پر بھی ہلہ بول دیا اور دنیا کو پیغام دیا کہ ان کا حکومت پر قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ ڈراما چار ماہ تک جاری رہا اور پولیس فورس کو بہت بڑے عذاب سے گزرنا پڑا۔ عمران خان اس دوران فرماتے رہے کہ چین کے صدر کا پاکستان آنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا اور حکومت نے ان کے فرضی دورے کا ایک افسانہ تراش رکھا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ امپائر کی انگلی اٹھنے کو ہے اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ وہ ان دنوں خواہشات کے گھوڑے پر سوار تھے اور سیاسی اخلاقیات اور انسانی قدریں بے دردی سے روندتے چلے جا رہے تھے۔ انھیں فوج کے اندر چند جرنیلوں اور ریٹائرڈ فوجی افسروں نے پورا یقین دلا دیا تھا کہ عدالتِ عظمیٰ کے ذریعے موجودہ حکومت معزول کر دی جائے گی اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت ان کی سربراہی میں قائم ہوگی۔ وہ پارلیمان کو بھی تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے تھے اور قومی اسمبلی سے استعفے دے چکے تھے لیکن پارلیمان کا مشترکہ اجلاس ہفتوں جاری رہا جس نے وزیراعظم کی قانونی حکومت کا ساتھ دیا۔ دریں اثنا تحریک انصاف کے منتخب صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے عمران خان کا پورا خفیہ منصوبہ بے نقاب کر دیا اور کھلے بندوں کہا کہ خان صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اسے کور کمیٹی کی تائید حاصل نہیں۔

۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردی کے دلفگار واقعات کے بعد انھوں نے دھرنے ختم کر دینے کا اعلان کیا، مگر دنیا کو یہ پیغام دے گئے کہ پاکستان کا دارالحکومت غیرمحفوظ ہے، ریاست ناکام ہوتی جا رہی ہے اور کسی سربراہِ مملکت کا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔ ان کی ہٹ دھرمی اور عاقبت نااندیشی سے قومی مفاد اور ملکی معیشت کو ناقابلِ تصور نقصان پہنچا اور چین کی قیادت یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ پاکستان سے معاملات کرتے وقت سیکیورٹی کو اولین اہمیت دینا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰ اپریل کو جو منصوبے اور معاہدے ہوئے، ان کی اور چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کو ایک اسپیشل ڈویژن کھڑا کرنا پڑا ہے۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات کے ایک سال بعد عمران خان نے منظم دھاندلی کا شور مچا دیا اور تحقیقات کے لیے عدالتِ عظمیٰ کے جج صاحبان پر مشتمل عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبے سے دو روز پہلے وزیراعظم نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو عدالتی کمیشن تشکیل دینے کے لیے خط لکھ دیا تھا، مگر حکومت اور تحریک انصاف کے درمیان کمیشن کی شرائط پر مہینوں مذاکرات ہوتے اور ٹوٹتے رہے۔ آخرکار وہ ایک مسودے پر متفق ہوگئے جس کے مطابق سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس نے حکومت کی درخواست پر بااختیار کمیشن اپنی سربراہی میں تشکیل دے دیا اور دوسرے ہی روز سیاسی جماعتوں کو منظم دھاندلی کے ثبوت ایک ہفتے کے اندر پیش کرنے کے احکام صادر کیے۔ سات روز گزرنے کے بعد تحریک انصاف نے مزید مہلت طلب کی جو واضح اشارہ تھا کہ سرے سے ہوم ورک ہی نہیں ہوا۔ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے کمیشن کے روبرو موقف اختیار کیا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ۱۳ مئی ۲۰۱۳ء کی نصف شب نواز شریف نے ٹی وی پر اپنی کامیابی کا جو اعلان کیا' وہ منظم دھاندلی کے زمرے میں آتا ہے۔ کمیشن نے پوچھا آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس نے متعلقہ سیاسی جماعتوں سے کہا ہے کہ وہ اس امر کا ٹھوس ثبوت لے کر آئیں کہ منظم دھاندلی کا منصوبہ کس نے بنایا اور اس پر کس نے عمل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تحریک انصاف کے پاس منظم دھاندلی کے ٹھوس ثبوت موجود ہی نہیں اور وہ غیر متعلق واقعات کی ایک لاکھ چوبیس ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ کمیشن میں داخل کر کے معاملے کو الجھانا چاہتی ہے۔ کنونشن بورڈز کے حالیہ انتخابات نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات کی صحت پر بڑی حد تک مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عدالتی کمیشن کی منظم دھاندلی کا سراغ نہیں لگا سکے گا اور عمران خان کو ایک بار پھر خفت کا سامنا کرنا ہوگا کہ جذباتی فیصلے آخر کار تباہی اور ذلت کا باعث بنتے ہیں۔

عمران خان نے اپنی جماعت کی اکثریتی رائے کے خلاف اپنی تنظیم کے اندر انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا اور ناتجربہ کاری اور وقت کے شدید دباؤ کے تحت قواعد وضوابط کی پاسداری نہ ہو سکی اور ان گنت شکایات منظر عام پر آئیں' جنھیں چیئرمین صاحب مسترد کرتے رہے۔ چند ہی ماہ پہلے ان داخلی انتخابات کے بارے میں جسٹس (ر) وحید الدین احمد کی رپورٹ سامنے آئی تھی جو الیکشن ٹریبونل کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کی گئی۔ اس کے مطابق پارٹی کے داخلی انتخابات میں بڑی دھاندلی ہوئی' بہت پیسہ چلا اور عہدے خریدے گئے۔ اس رپورٹ کے بعد چیئرمین عمران خان نے تمام انتخابات کالعدم قرار دے دیے اور مختلف سطح پر انتخابات کے ذریعے قائم شدہ تنظیمیں توڑ ڈالیں۔ فرد واحد کے آمرانہ فیصلے کو یہ دوسری بڑی شکست ہوئی ہے۔ تیسری شکست بھی منڈلا رہی ہے' کیونکہ فاضل جسٹس (ر) وحید الدین احمد نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ جو ارکان قومی اسمبلی سے چالیس دن سے زائد غیر حاضر رہے' اس کی رکنیت آئین کی رو سے ختم ہو گئی ہے۔ اس پر چیئرمین صاحب نے الیکشن ٹریبونل تحلیل کر ڈالا۔ یہ غیر جمہوری فیصلہ پارٹی کے اہم لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فاضل جسٹس (ر) وحید الدین احمد جو بڑے منکسر مزاج اور زیرک انسان ہیں' انھوں نے عمران خان کو بڑا صائب مشورہ دیا ہے کہ دنیا کو بدلنے سے پہلے انھیں اپنے رویے بدلنا ہوں گے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت عدالتی کمیشن قائم ہو رہا تھا' عین انھی دنوں یمن میں حوثی قبائل صدر ہادی کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے اور دارالحکومت صنا کے علاوہ عدن بندرگاہ پر بھی حملے شروع کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی پیش بندی کے لیے سعودی عرب کے فرمانروا سلمان بن عبدالعزیز نے وزیراعظم نواز شریف کو دورے کی دعوت دی۔ پہلی بار ان کا ہوائی اڈے پر استقبال کیا۔ انھی دنوں ہمارے ہاں سینیٹ کے انتخابات آخری مراحل میں تھے' اس لیے شہباز شریف اسی رات واپس آ گئے' تاہم نواز شریف اور وفد کے ارکان کی سعودی عرب کی اہم شخصیتوں سے تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ سرکاری سطح پر تو کچھ نہیں بتایا گیا' لیکن اس خطے کے حالات پر نگاہ رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگار کہہ رہے تھے کہ ایران کے چھ ممالک سے کامیاب مذاکرات کے تناظر میں عرب اور عجم کے درمیان تناؤ بڑھنے والا ہے۔ چند روز بعد یمن سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ تب شاہ سلمان نے وزیراعظم نواز شریف سے ٹیلی فون پر طویل گفتگو کی اور پاکستان سے فوج کے علاوہ طیارے اور بحری جہاز فراہم کرنے کی استدعا کی۔ ہماری قومی قیادت یہ اعلان کرتی رہی کہ پاکستان مشکل کی گھڑی میں اپنے برادر ملک سعودی عرب کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد یہ انتہائی اہم اور حساس معاملہ

www.pdfbooksfree.pk

پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں اٹھایا گیا۔ پارلیمان میں بحث شروع کرنے سے پہلے اس نازک مسئلے پر کابینہ میں غور و خوض اور پارلیمانی اجلاس کے لیے ایک مؤثر حکمت عملی از بس ضروری تھی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مشترکہ اجلاس میں تحریک انصاف کے ارکان اسمبلی بھی شریک ہوئے اور چیئرمین صاحب نے فرمایا، ہم اجلاس میں شرکت اس لیے کر رہے ہیں کہ پاکستانی فوج کو سعودی عرب جانے سے روک سکیں۔ اس واشگاف اعلان میں سعودی عرب کے لیے حد درجہ تکلیف دہ پیغام تھا جو پاکستان سے بہت ساری توقعات لگائے بیٹھا تھا۔

بدقسمتی سے وزیر دفاع خواجہ آصف نے بحث کا نہایت سنجیدگی سے آغاز کرنے کے بجائے تحریک انصاف پر تند و تیز جملے شروع کر دیے۔ اس پر پارلیمان ہاؤس مچھلی منڈی بن گیا، تاہم بعض ارکان پارلیمان کی فہم و فراست سے ماحول میں ٹھہراؤ پیدا ہوا، مگر نقصان ہو چکا تھا اور احتیاط کا دامن بار بار چھوٹ رہا تھا۔ دانش وری اور آزاد خیالی کے گھمنڈ میں بعض مقررین پاک سعودی عرب تعلقات پر آرے چلاتے رہے۔ دراصل مشترکہ اجلاس ان کیمرہ ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے روز دفتر خارجہ کی تیار شدہ قرارداد پارلیمان ہاؤس میں پیش کی گئی۔ حیرت کی بات یہ کہ اس وقت مشیر خارجہ جناب سرتاج عزیز ایوان میں موجود نہیں تھے۔ تحریک انصاف نے قرارداد میں غیر جانبداری اور ثالثی کے الفاظ شامل کرنے پر اصرار کیا۔ اتفاق رائے کی خاطر یہ تجاویز شامل کرنا پڑیں جس کے سبب اس میں توازن نہیں رہا اور چشم زدن میں یہ تاثر طول و عرض میں پھیل گیا کہ پاکستان نے سعودی عرب کے معاملات میں غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس پر امارات کے نائب وزیر خارجہ کا آتشیں بیان آیا کہ پاکستان کو اپنے فیصلے سے پیدا شدہ خطرناک نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ سعودی عرب سے مذہبی امور کے مشیر تشریف لائے۔ ابتدا میں ان کا لہجہ بھی خاصا تلخ تھا، لیکن اہم شخصیتوں سے ملاقات کے بعد ان کے بیانات میں دانش اور حقیقت پسندی جھلکنے لگی۔ انھوں نے کہا ہمیں یقین ہے کہ مشکل کی گھڑی میں پاکستان ہمارے شانہ بشانہ کھڑا ہے اور ہمیں علاقائی سالمیت، آزادی اور خودمختاری کی ضمانت دی گئی ہے۔

سعودی عرب جس کے پاکستان کے ساتھ عشروں پر محیط نہایت خوش گوار تعلقات قائم ہیں، وہ یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ آزمائش کی گھڑی میں پاکستان خود امداد کی پیش کش کرے گا اور اپنی فوجیں کسی تاخیر کے بغیر مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے بھیج دے گا۔ وزیراعظم نواز شریف نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہوئے پچھلے ہی تاثر دیا تھا، مگر پارلیمان کی قرارداد میں دل جوئی اور حق دوستی ادا کرنے کے بجائے ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا جس میں گرم جوشی کم اور احتیاط بہت زیادہ تھی۔ جب توقعات بہت زیادہ ہوں، تو نصیحت کی بات بھی گراں گزرتی ہے۔ سعودی عرب میں جو ہندو لابی موجود ہے، اس نے پارلیمان میں ہونے والی تقریریں مرچ مسالا لگا کر اعلیٰ حلقوں تک پہنچائیں اور ہمارے اتحاد اور یک جہتی کو نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ نقصان پر قابو پانے کے لیے شہباز شریف کی قیادت میں ایک وفد ریاض گیا، مگر وہ شاہ سلمان سے ملاقات نہ کر سکا۔ تب وزیراعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور اعلیٰ حکام ایک روزہ دورے پر سعودی عرب گئے۔ ہم نے ٹی وی پر ان کی جو تصاویر دیکھیں ان سے اندازہ ہوا کہ معاملات بڑی حد تک سلجھ گئے ہیں اور سیاسی اور فوجی قیادت کی مشترکہ کوششوں سے سعودی حکام صورت حال کی نزاکت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ یمن میں پاکستان کی افواج کا جانا کسی کے فائدے میں نہیں اور اسے بھی اپنی فوجیں وہاں نہیں بھیجنی چاہییں کیونکہ یمن تو افغانستان جیسا ہے کہ وہاں جو گیا اس کا قبرستان بن گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

سعودی عرب سے امام کعبہ خالد الغامدی ایک ہفتے کے دورے پر پاکستان آئے ہیں۔ لاہور میں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا ہے۔ وہ ان مراکز میں جا رہے ہیں جو دینی جذبوں سے سرشار اور سعودی عرب پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے دورے سے دونوں ملکوں کے برادرانہ تعلقات میں پہلی جیسی وارفتگی عود کر آئے گی۔ پاکستان کے عوام سعودی عرب سے ٹوٹ کر محبت کرتے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کرنے کی انتہائی سازشیں کر رہے ہیں اور ان کے وسائل پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے میڈیا کو اس امر کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ اس نازک موقع پر اس کی ذمے داریاں کس قدر اہم ہیں۔ ہمارے دانش وروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاکستان نے بڑی محنت اور عشروں کی ریاضت سے جو دوست بنائے ہیں ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے اور پرانے روابط تروتازہ رہیں۔ یہ منظر بہت روح فرسا ہے کہ مشکل کے وقت دو قریبی دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے رہنے کے بجائے بکھرے بکھرے اور کھنچے کھنچے سے نظر آنے لگیں۔ یہ وقت اپنے دوست کی مخلصانہ جدوجہد سے مدد کے لیے پہنچنے کا ہے۔ مدد اچھے جذبات کے اظہار سے بھی کی جا سکتی ہے اور سوچ سمجھ کر مسئلے کا حل تلاش کرنے سے بھی۔ اب ہمیں پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرنا اور سعودی بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہوگا۔

مشرق وسطیٰ کے تناظر میں یہ سوال غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ یمن کا بحران کیسے ختم ہو سکتا اور عجم اور عرب میں اچھے تعلقات فروغ پا سکتے ہیں۔ سعودی عرب کی امداد کے لیے دس عرب ملکوں کا جو اتحاد قائم ہوا اس نے فضائی طاقت کا استعمال اس قدر موثر انداز میں کیا کہ حوثی قبائل کی پیش قدمی رک گئی ہے اور وہ شمالی یمن سے جنوبی علاقوں میں سمٹ کے رہ گئے ہیں۔ ادھر امریکی بحری بیڑا خلیج عدن میں لنگر انداز ہے جو ایرانی جہازوں کی اس غرض سے تلاشی لے گا تاکہ اسلحہ حوثی باغیوں تک نہ پہنچ سکے۔ پاکستان اس لیے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے عرب اور عجم کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رہے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ "سینٹو" اور "آر سی ڈی" کا اہم رکن تھا جس میں ایران اور ترکی بھی شامل تھے۔ خوش قسمتی سے اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے یمن کا بحران حل کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں فوری جنگ بند کرنے اور مذاکرات کا عمل اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس قرارداد کا ایران بھی پابند ہے اور اقوام متحدہ کے ذمے دار رکن کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داری ضرور پوری کرے گا۔ اس موقع پر اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مسلم وزرائے خارجہ کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے مذاکرات کے ذریعے بحران کا پائیدار حل تلاش کیا جائے۔ پاکستان ان کوششوں میں موثر کردار ادا کر سکتا ہے اور امن فوج قائم کرنے کی تجویز بھی زیرغور آ سکتی ہے۔ یہ تجویز اس وقت قابل عمل ہوگی جب مسلمان ممالک اپنے تنازعات حل کر لیں گے۔ نیٹو کے قیام سے پہلے یورپ نے اپنے باہمی اختلافات ختم کیے تھے۔

کراچی میں ضمنی انتخابات میں ایم کیو ایم کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارک باد پیش کی جانی چاہیے کہ اس نے بڑی حد تک شفاف انتخابات میں عوام کی بھاری حمایت کا ثبوت دیا اور سیکٹر کمانڈروں سے نجات پائی ہے مگر اس بھاری حمایت کا اہتمام بھی تحریک انصاف کے چیئرمین کی طرف سے ہوا، وہ جب ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے خلاف شائستگی اور تہذیب سے گری ہوئی زبان استعمال کر رہے تھے تو اہل نظر کہہ رہے تھے کہ ایم کیو ایم کے زخم خوردہ بدن میں تازہ روح پھونکی جا رہی

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ انھوں نے جس جارحانہ انداز میں اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا اس نے مہاجرین کو یہ پیغام دیا کہ اسٹیبلشمنٹ ان کے ذریعے ان کی طاقت پارہ پارہ کردینا چاہتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جو یہ تاثر دیتے رہے کہ ایم کیو ایم کا چاروں طرف سے گھیراؤ کیا جارہا ہے۔ رینجرز فورس نے کراچی میں خاصا کامیاب آپریشن کیا مگر اس سے ہمیں کہیں زیادتیاں بھی سرزد ہوئیں جو بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی رہیں کہ صرف مہاجر تختۂ مشق بنائے جارہے ہیں۔ وہ ارباب اختیار جنھوں نے نبیل گبول سے استعفا لے کر ضمنی انتخاب کا ڈراما رچایا دراصل وہی ایم کیو ایم کو تقویت پہنچانے کا باعث بنے ہیں۔ منصوبے کے مطابق نبیل گبول کو تحریک انصاف کے ٹکٹ پر انتخاب لڑانا تھا مگر ان کے درمیان معاملہ طے نہ پاسکا۔ رینجرز نے نائن زیرو پر جب چھاپہ مارا تو ایم کیو ایم کا پورا وجود لرز اٹھا تھا مگر صولت مرزا کی پھانسی سے چند گھنٹے پہلے اس کے اقبالی بیان نے چھاپے کا سارا تاثر زائل کردیا اور مہاجرین کو یقین ہوگیا کہ ایم کیو ایم ہی انھیں تحفظ فراہم کرسکتی ہے۔

الطاف بھائی نے بھائی ریحام خان کی خدمت میں سونے کا سیٹ پیش کرنے کی رومانوی فضا پیدا کرکے عمران خان کی انتخابی مہم کے غبارے سے پہلے روز ہی ہوا نکال دی تھی۔ پولنگ سے ایک روز پہلے دو سواریوں پر پابندی اور ووٹ ڈالنے کے لیے اصل شناختی کارڈ پیش کرنے کی شرط سے اس تاثر کو تقویت ملی کہ اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کی انتخابی طاقت پر ضرب لگانا چاہتی ہے۔ ضمنی انتخاب میں کوئی ۳۴ فیصد ووٹ پڑے اور بے ضابطگیوں کی بہت ساری شکایتیں سامنے آئیں جس سے الیکشن کمیشن میں بنیادی اصلاحات کی ضرورت کا احساس مزید شدت اختیار کرگیا ہے۔

ضمنی انتخابات میں جماعت اسلامی کی کارکردگی بڑی مایوس کن رہی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تحریر اور تحریروں میں ایک بات بڑی صراحت سے بیان کرتے رہے کہ ہمیں سیاسی بقا اور نشوونما کے لیے ہوا اور روشنی کی طرح جمہوریت درکار ہے۔ اس نظریے کے تحت جماعت اسلامی انتخابات میں حصہ لیتی رہی۔ قاضی حسین احمد (مرحوم) جب امیر بنے تو انھوں نے اس جماعت کو جو اقامت دین کے عظیم الشان نصب العین کے لیے اٹھی تھی اسے اپنی ذاتی پالیسی کی جھینٹ چڑھادیا۔ وہ نواز شریف کو سخت ناپسند کرتے اس لیے انھوں نے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں مسلم لیگ سے انتخابی اتحاد کرنے کے بجائے ''اسلامی فرنٹ'' کے نام سے انتخابات میں حصہ لیا اور تمام امیدوار شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں اس نے متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اور شاندار کامیابیاں حاصل کیں مگر ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں قاضی صاحب نے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔ اس موقع پر کارکنوں میں بڑی مایوسی پیدا ہوئی اور ہم نے انھیں بڑے اشتعال کی حالت میں دیکھا۔ انھیں قلق یہ تھا کہ ہم نے سالہا سال کی محنت سے انتخابی سرمایہ جمع کیا تھا وہ ضائع ہوجائے گا۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کراچی کے حلقہ ۲۴۶ میں جماعت اسلامی کے امیدوار کو پہلے دو گھنٹوں میں دس ہزار ووٹ پڑے اور خواتین و حضرات کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک تیادت نے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔ کارکنوں اور ووٹروں کو پیغام یہ ملا کہ جماعت اسلامی انتخابات میں سنجیدہ نہیں رہی چنانچہ ضمنی انتخاب میں کارکن پوری طرح متحرک ہوئے نہ ووٹر پلٹ کر اس کی طرف آئے۔ کراچی میں امن قائم کرنے کے لیے جماعت اسلامی کو بلدیاتی انتخابات میں پوری تیاری کے ساتھ حصہ لینا اور اس شہر کے بنیادی مسائل حل کرنے میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔ آسمان رنگ بدل رہا ہے۔ اور ایم کیو ایم ایک سیاسی جماعت کے طور پر صحت مند کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آرہی ہے اور تحریک انصاف کے لیے اپنے رویے بدلنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

اسٹاک مارکیٹ تک رسائی کا آسان ذریعہ...

NI(U)T میں سرمایہ کاری

سب سے بڑا اور سب سے زیادہ متنوع ایکوٹی فنڈ

52 سال سے ڈیویڈنڈ کی مسلسل ادائیگی کا شاندار ریکارڈ

پیشہ ور، انتہائی تجربہ کار فنڈ منیجرز کی نگرانی

آپکے سرمایہ میں اضافہ اور مسلسل منافع کے شاندار امکانات۔۔۔ اعداد و شمار کی روشنی میں

	FY 2005	FY 2006	FY 2007	FY 2008	FY 2009	FY 2010	FY 2011	FY 2012	FY 2013	FY 2014	*YTD 2015	**10 Years Annualized Return
NI(U)T (%)	35.87%	23.20%	44.83%	-5.11%	-41.46%	17.92%	24.00%	7.57%	56.42%	56.96%	5.71%	10.44%
KSE 100 (%)	41.12%	34.08%	37.87%	-10.77%	-41.72%	35.74%	28.54%	10.45%	52.20%	41.16%	1.96%	18.84%
Dividend Per Unit (Rs.)	3.3	5.80	6.70	5.50	3.25	2.25	4.00	3.50	3.75	4.10	-	-

*As on March 31, 2015 **Geometric return from FY05 - FY14

AMC Rating AM2 by PACRA

UAN: 111-648-648 | Toll-Free: 0800-00648
Email: info@nit.com.pk | Website: www.nit.com.pk

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

Risk Disclaimer: All investments in mutual funds are subject to market risks. The NAV of units may go up or down based on the market conditions. Past performance is not necessarily indicative of the future results. Please read the Offering Documents to understand the investment policies & the risks involved.

www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر بشیر چودھری کا دعویٰ

میں نے کینسر کا مریض صحت یاب کر دیا

قدرتی طریق علاج سے موذی امراض کی تشخیص کرنے والے معالج کی معلومات افروز باتیں

الطاف حسن قریشی

گزشتہ روز سہ پہر تین بجے ہادی صاحب کا فون آیا کہ آپ کی ایک ایسے شخص سے ملاقات کرانی ہے جو آنکھوں کے معائنے سے پورے جسم میں پائے جانے والے امراض کا سراغ لگاتے اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ ہادی صاحب ایم اے پولیٹیکل سائنس میں میرے ہم جماعت تھے۔ میں مقررہ وقت پر ان کے ہاں پہنچ گیا اور وہ مجھے بشیر احمد چودھری سے ملوانے لے گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ آپ 1965ء میں میرا انٹرویو لینے راولپنڈی آئے تھے۔ تب میں پاک فضائیہ میں تھا۔ بے تکلف ماحول میں ان سے کئی گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں جن میں کئی انکشافات سامنے آئے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے دلچسپ حالات بتاتے ہوئے کہا: ''میں جب پاک فضائیہ میں تھا تو میرے ایئر چیف ایئر مارشل عبدالرحیم سے تعلقات قدرے کشیدہ تھے۔ اسی لیے میں نے استعفا دے دیا۔ دوست احباب

www.pdfbooksfree.pk

نے مجھے پی آئی اے جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں قومی ایئر لائن میں چلا گیا۔ اس دوران مجھے گنٹھیا (آرتھرائٹس) نے آن دبوچا۔ ایک روز میں ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا اور وہاں سے ہوٹل آیا۔ وہاں عملہ تبدیل ہوا اور میں آرام کرنے ہوٹل آ گیا۔ لفٹ تک پہنچنے کے لیے تین چار سیڑھیاں تھیں مگر ان پر چڑھنا میرے لیے دوبھر ہو گیا۔ اس سے قبل میرے دائیں بازو کی کہنی میں درد رہتا تھا۔ اس سے بریف کیس تک نہیں اٹھ سکتا تھا۔ وہ میں بائیں بازو سے اٹھاتا۔

"جب مجھے گھٹنے میں شدید درد ہوا تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے مجھے دافع درد گولیاں دیں۔ وہ کھا کر میں جہاز اڑانے کے قابل ہو گیا۔ ایک ہفتہ وہ دوائی کھائی تو تندرست رہا۔ جب دوائی چھوڑی، تو وہ مسئلہ پھر عود کر آیا۔ میں پھر اس مرض پر تحقیق کرنے لگا تاکہ اس کی بابت جان سکوں۔ یہ تحقیق مجھے نیویارک کے ایک بک سٹور لے گئی۔ تب تک میں گنٹھیا کے لفظ سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہاں میں نے ایک کتاب دیکھی جس کا عنوان تھا "Arthritis can be cured" (گنٹھیا قابل علاج ہے)۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ آرتھرائٹس کیا چیز ہے۔ لہٰذا وہ کتاب خرید لی۔"

میں نے پوچھا "آپ نے اس کتاب میں کیا خاص بات پائی؟"

ڈاکٹر بشیر چودھری کہنے لگے "اس میں مرض یعنی جوڑوں کے درد کی وجوہ کے بارے میں حیرت انگیز معلومات موجود تھیں۔ ہوٹل اپنے کمرے پہنچا، تو کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا، مجھے محسوس ہوا وہ میرے متعلق ہی لکھی گئی ہے۔ میں جن غلط عادات میں مبتلا تھا، ان سب کا اس میں تذکرہ کیا گیا تھا۔

"اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ گنٹھیا چمٹنے کی ایک وجہ ذہنی دباؤ (Stress) بھی ہے۔ جو لوگ اس دباؤ کا زیادہ شکار ہوں، ان کے جوڑ جلد درد کرنے لگتے ہیں۔ ذہنی دباؤ کی تکلیف انسان کے قابو سے باہر ہے، اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی دور کر سکتا ہے۔ میں آپ کو دو لوگوں کی مثال دیتا ہوں جن کا بڑا مالی نقصان ہو چکا۔ ایک شخص توکل کرنے والا ہے۔ وہ کہتا ہے مالک نے دیا تھا، اسی نے لے لیا اور وہی پھر دے گا۔ وہ یہ کہہ کر آرام سے سو گیا اور اس نے کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ دوسرا آدمی جس کا خدا پر بھروسا نہیں تھا، وہ اپنے شدید ذہنی دباؤ کے باعث دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال پہنچ گیا۔ اس مثال سے عیاں ہے کہ ذہنی دباؤ جان لیوا کیفیت ہے۔

"مجھے مریض آ کر بتاتے ہیں کہ ہمارا دماغ ساری رات کام کرتا رہتا ہے۔ صبح جب ہم اٹھیں تو جسم تھکا تھکا محسوس ہوتا ہے۔ میں انھیں کہتا ہوں، جب دماغ مطمئن نہ ہو تو جسم بھی پرسکون نہیں رہتا۔ ذہنی دباؤ ہر سکون غارت کر دیتا ہے۔ مگر اسے ادویہ کے ذریعے کنٹرول کرنا ممکن ہے۔

"میرے پاس ایک ڈاکٹر خاتون شوہر کے ساتھ آئیں۔ انھوں نے بتایا "میں ذہنی دباؤ دور کرنے والی درجن بھر گولیاں باقاعدہ کھا رہی ہوں، لیکن مجھے نیند نہیں آتی۔" ان کے شوہر نے کہا، بیماری کے باعث اس کی حالت یہ ہے کہ صبح کہہ رہی تھی، چھت سے پنکھے تک لٹکنے کو جی چاہتا ہے۔" جب انسان ڈپریشن یا ذہنی دباؤ کا شکار ہو تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ نیویارک میں ایک ایسا کلینک ہے جہاں لوگ اسٹریچر پر لائے جاتے

ہیں۔ وہاں پھر ان کا ایسا شافی علاج ہوتا ہے کہ چھ سے آٹھ ہفتوں میں وہ اپنے پیروں پر چل کے گھر جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں واقع ایسے کئی کلینکوں میں صرف قدرتی علاج کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کتاب کی مدد سے میں قدرتی طریق علاج کے ذریعے اپنی دیکھ بھال کرنے لگا۔ میں جلد اتنا صحت مند ہو گیا کہ پندرہ سال بعد ٹینس کھیلنے لگا۔

"میں نے پھر قدرتی طریق علاج کا کورس کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اصطلاح میں نیچروپیتھی (Naturopathy) کہلاتا ہے۔ نیویارک میں ایک ادارہ نیچروپیتھی کا کورس کراتا ہے۔ میں نے اس میں داخلہ لیا اور مقررہ مدت میں کورس کامیابی سے مکمل کر لیا۔ بعدازاں موضوع سے متعلق کتب بھی زیرمطالعہ رہیں۔

"جب میں کراچی سے لاہور منتقل ہوا تو ماڈل ٹاؤن میں کلینک کھول لیا۔ لیکن اسے اس لیے بند کرنا پڑا کہ مریضوں کا ہجوم لگا رہتا اور مجھے قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے مناسب وقت نہ ملتا۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا "آپ جڑی بوٹیوں کے ذریعے جو علاج کر رہے ہیں اس کی تعلیم کس معیاری کالج سے حاصل کی ہے؟"

انھوں نے جواب میں کہا "ایک دفعہ پی آئی اے کی فلائٹ فرینکفرٹ، جرمنی گئی تو میں نے عملے سے پوچھا، یہاں کوئی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے؟ انھوں نے بتایا، یہاں ایک بہت بڑا ہومیوپیتھک ڈاکٹر تو ہے لیکن اس قدر مصروف کہ پانچ پانچ دن تک وقت نہیں دیتا۔ ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ وہ آنکھ کے پردے دیکھ کر سارے طبی مسائل بتا دیتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت عجیب لگا۔ بعدازاں ایک مرتبہ میرے ہاتھ ایک کتابچہ لگا جس پہ "آئریڈولوجی" (Iridology) درج تھا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ آنکھ کے پردوں کا معائنہ کرنے سے تمام بیماریوں کا پتا چل سکتا ہے۔ جب میں نے پوری کتاب پڑھی تو میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میری بیٹی امریکی شہر ڈیلس میں رہتی ہے۔ تب میں اس کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایک کالج میں آئریڈولوجی کا شعبہ قائم ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "آئریڈولوجی کس قسم کا علم ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "قدرتی طریق علاج کے بعض ماہر "پردہ چشم" (Iris) کا معائنہ کر کے ذہنی بیماری کا پتا چلاتے ہیں۔ طبی اصطلاح میں یہ علم "آئریڈولوجی" کہلاتا ہے۔ اس طریق علاج میں پردہ چشم کے نمونوں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر جانا جاتا ہے کہ انسان کو کس قسم کی بیماریاں لگی ہوئی ہیں۔

"یورپ میں یہ اٹھارہویں صدی سے پہلے کی سائنس چلی آ رہی ہے۔ لیکن اس طریق علاج کو اپنانے والوں کے مابین آپس میں رابطہ نہیں تھا۔ مثلاً ایک ماہر آئریڈولوجی آسٹریا میں ہے، دوسرا جرمنی اور تیسرا برطانیہ میں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا کام کر رہا ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں تھے۔ جب باہمی رابطے قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کا مشاہدہ، علاج اور نتائج تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اب امریکا میں بھی یہ طریقہ علاج مروج ہے اور انھوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

''میں نے جب لندن کالج میں داخلہ لینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر ہونا چاہیے، فلاں ڈگریاں ہونی چاہئیں۔ انھیں بتایا کہ میں نے نیچروپیتھی کا کورس کر رکھا ہے جس میں بنیادی طبی مضامین پڑھائے جاتے ہیں مثلاً اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ۔ تب وہ مجھے داخلہ دینے پہ رضامند ہوئے۔ یہ کورس ڈھائی سال کا تھا۔ اس میں اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ مجھے سب طبی مضمون پڑھنے پڑے۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو ٹیوٹر رکھا جس نے چھے ماہ تک مجھے یہ علم پڑھایا۔

''اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو جانچنے پرکھنے کے کئی طریقے مقرر کیے ہیں۔ مثال کے طور پر چین میں کئی نظام ہائے علاج رائج ہیں۔ ان کے ہاں ۱۸ بضعیں ہیں، ۹ ایک طرف اور ۹ ایک طرف۔ زبان اور آنکھ سے وہ طبی معائنے میں مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کے سبھی نظام بذریعہ اعصاب پردہ چشم سے ملا رکھے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب آپ اندھیرے میں جائیں تو وہ پردہ کھل جاتا ہے تاکہ زیادہ روشنی آنکھ میں جائے۔ جب آپ سورج کے سامنے جاتے ہیں، تو بند ہو جاتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا کہ ذیابیطس کے مریض کا علاج آپ کس طرح کرتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا طریق علاج دوسروں سے مختلف تھا۔ انھوں نے بتایا:

''اکثر ڈاکٹر یہ غلط فہمی پھیلاتے ہیں کہ شوگر میں شہد استعمال نہ کیجیے پھل نہ لیں اور فلاں چیز نہ کھائیے۔ میں اپنے مریضوں کو شہد کھلاتا ہوں۔ لیکن شہد اصلی ہونا چاہیے۔ میرے مریضوں کا بیان ہے، اگر ہم روزانہ تین چار بڑے چمچ شہد کے نہ کھائیں، تو ہماری شوگر کنٹرول میں نہیں رہتی۔ یقین کیجیے، شہد بنا ہی شوگر والوں کے لیے ہے۔

''قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! جیسا میں نے تمھیں بنایا، اسی طرح میں نے ان پودوں کو بنایا ہے۔ پوری کائنات کی تخلیق میں مجھے سات دن اور سبزیوں اور پودوں کو بنانے میں مجھے تین دن لگے۔'' یہ پڑھ کر میں حیران ہوا اور سوچا کہ پوری کائنات کی تخلیق کے مقابلے میں پودوں کو تین دن تک بنانے میں خاصا وقت لیا گیا۔ اس میں یقیناً کوئی حکمت ہوگی۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جتنے نظام انسانی جسم کے اندر ہیں، اتنے ہی پودوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے جسم میں تقریباً دس نظام پائے جاتے ہیں۔''

میں نے دریافت کیا، سنا ہے، جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کورٹی زون (Cortisone) سٹیرائڈ ہارمون استعمال کرتے ہیں؟ جواب میں ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ واقعہ سنانے لگے:

''میرا دوست مجھے ایک دفعہ سفر کے دوران مل گیا اور اس نے مجھے اپنی صحت کے مسائل بتائے۔ میں نے اسے اپنے کلینک کا پتا دیا۔ وہ چند روز بعد میرے پاس آیا۔ وہ شکی مزاج رکھتا تھا۔ میں نے اسے تین چار مختلف دوائیوں کا مرکب بنا کر دیا۔ اس نے جاتے لیب میں اسے ٹیسٹ کرایا۔ ایک ہفتے بعد میرے پاس آیا اور کہا، چودھری صاحب، آپ دوائیوں میں کورٹی زون ڈالتے ہیں۔ میں نے اس دوائی کا لیب میں ٹیسٹ کرایا، تو رپورٹ میں آیا ہے۔

''یہ سن کر میں بڑا پریشان ہوا۔ خیر وہ تو بحث کر کے چلا گیا۔ میں جن سے دوائی لیتا ہوں، انھیں فون کیا کہ اس طرح کی شکایت آئی ہے۔ انھوں نے کہا، آپ آئیے، ہم آپ کو لیب میں چیک کراتے ہیں۔ پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے وہ دوائی اٹھا کر دیکھی جو اسے دی تھی۔ اس مرکب میں شامل ایک دوائی قدرتی طور پر کورٹی زون رکھتی تھی۔ یہ ملٹھی میں پائی جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا ''نیچروپیتھی کی یونیورسٹی یا کالج میں

www.pdfbooksfree.pk

پڑھائی جاتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بتایا "اس کے اپنے مخصوص کالج ہیں جو عموماً بیرونِ ممالک واقع ہیں۔ اس کے ریسرچ سنٹر بھی ہیں۔ شاید جلد ہی ایسا دور آ جائے جب یہ علم یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا جانے لگے۔

"ایک دفعہ میرے پاس سرطان کا مریض آیا۔ یہ چند سال پرانی بات ہے۔ شوکت خانم اسپتال والوں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا اور کہا کہ آپ کی زندگی کا ایک مہینا باقی رہ گیا ہے۔ یہ کینسر کا میرا پہلا مریض تھا۔

تب تک میں نے سرطان کے حوالے سے بہت ساری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اس بیماری کے علاج سے متعلق کچھ علم تو تھا مگر اعتماد نہیں تھا۔

"امریکا کے ایک مشہور ماہر امراضِ سرطان، ڈاکٹر جان این نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ۳۰ سالہ عملی زندگی سے جو کچھ سیکھا وہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ ظلم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۹۰ فیصد ایسے لوگ آتے ہیں جن کو سرطان ہوتا ہی نہیں۔ جب میں بلیڈ سے کٹ لگاتا ہوں، تو انھیں سرطان ہو جاتا ہے۔ اس نے پھر سرجری چھوڑ دی اور لوگوں کا قدرتی طریقے سے علاج معالجہ کرنے لگا۔

"وہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی آئی اور میں نے اس کتاب سے کافی کچھ سیکھا۔ میرے پاس جو سرطان کا پہلا مریض آیا وہ بوڑھا تھا۔ شوکت خانم اسپتال اسے لاعلاج قرار دے چکا تھا۔ خیر میں نے اس کا علاج کیا۔ اللہ نے اسے شفا دی اور چار پانچ ماہ میں وہ کافی حد تک صحت یاب ہو گیا۔

"ایک دفعہ اس کی بیٹی دوائی لینے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ ویسے تو آپ کے والد ماشاءاللہ ٹھیک ہیں لیکن احتیاطاً آپ ان کا چیک اپ کرا لیں۔ وہ اپنے والد کو انمول اسپتال لے گئی۔ کچھ عرصے بعد وہ لڑکی آئی تو اس نے کہا کہ والد صاحب کا چیک اپ کرایا، الحمدللہ تمام ٹیسٹ ٹھیک آئے ہیں۔

"اس نے مزید بتایا کہ جب ٹیسٹ کی رپورٹ آئی، تو ڈاکٹر نے تازہ اور شوکت خانم اسپتال والی پرانی رپورٹ کا موازنہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ جسم میں سرطانی خلیے ختم ہو چکے۔ لہٰذا وہ رپورٹیں لے کر دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے بات چیت کرنے کے بعد آ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہیں سے نیا علاج کرایا ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ہاں ہم نے دیسی علاج کروایا ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ نہیں بی بی، ایسے علاج سے یہ مرض ٹھیک نہیں ہوا، یہ خود بخود قدرتی طور پر ہی ختم ہو گیا۔ حالانکہ وہ میرے علاج سے تندرست ہوا۔"

ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر ہم عشا کے وقت چلے آئے۔ امید ہے کہ دوسری ملاقات میں وہ ہمیں علم آریڈولوجی کے متعلق مزید دلچسپ معلومات فراہم کریں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

برادر اسلامی ملک

یمن خانہ جنگی کا نشانہ کیسے بنا؟

اقتدار و طاقت کے نشے میں مست سابق یمنی حکمران کی عبرت ناک داستان

محمد علی صدیقی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یمن والے شریف النفس اور نرم دل کے لوگ ہیں۔ وہ ایمان اور دانش میں اپنی مثال آپ ہیں۔'' (صحیح بخاری)

یہ شاید یمنی عوام کی نرم خوئی اور شریف النفسی ہی ہے جس سے خصوصاً یمن کے سابق حکمران علی عبداللہ صالح نے ناجائز فائدہ اٹھایا جو ایک شاطر و چالاک انسان ہے۔ خیر ہاشمی زیدی شیعہ شمالی یمن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں جب صرف اٹھارہ سال کا تھا، تو فوج کا حصہ بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

افسروں کی چاپلوسی کرنے کے باعث تیزی سے ترقی کی یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں شمالی یمن کا صدر بن گیا۔

اس زمانے میں جمہوریہ یمن شمالی اور جنوبی، دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی یمن کی ۷۰ فیصد آبادی زیدی شیعہ تھی۔ جبکہ جنوبی یمن میں آباد ۹۰ فیصد مسلمان سنی شوافع تھے۔ یہ دونوں پڑوسی ریاستیں امن اور جنگ کے ادوار سے گزریں۔ آخر ۱۹۹۰ء میں دونوں ریاستوں کا ادغام ہوگیا۔

اس وقت اور آج بھی ۸۰ فیصد یمنی کسی نہ کسی قبیلے سے وابستہ ہیں۔ ان قبائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ایک قبیلے سے وابستگی یمنی شہری کو نہ صرف تحفظ فراہم کرتی بلکہ اسے بارروزگار ہونے میں بھی مدد دیتی ہے۔

جب دونوں ریاستوں کا ادغام ہوا، تو یمنی آبادی میں سنیوں کی اکثریت ہوگئی۔ ۵۶ فیصد یمنی سنی، ۴۲ فیصد زیدی شیعہ اور ۲ فیصد اسماعیلی و اثنا عشری شیعہ تھے۔ لیکن سنیوں میں اتحاد نہ تھا اور وہ کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جو مختلف اختلافات کے باعث آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف زیدی شیعہ صرف تین بڑے قبائل..... بکیل، حاشد اور مذحج کی صورت متحد ہیں۔ یہ صورت حال آج بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔

۱۹۹۰ء میں علی عبداللہ صالح نے ایک طرف حاشد اور بکیل کو ساتھ ملایا، دوسری طرف جنوبی یمن کے بعض سنی قبائل کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ اس نے زیدی شیعہ و سنی قبائل کے سرداروں کو خوب انعام و اکرام سے نوازا اور یوں ان کی مدد پانے میں کامیاب رہا۔ انہی قبائل کی حمایت سے وہ نئے ملک، جمہوریہ یمن کا صدر بن گیا۔

علی عبداللہ صالح نے پھر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی خاطر وہ بنیادی اقدامات کیے۔ اوّل قبائلی سرداروں کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے انھیں انعام و اکرام سے نوازتا رہا۔ دوم اس نے حکومت اور فوج کے کلیدی عہدوں پر اپنے رشتے دار، دوست احباب تعینات کردیے۔ انہی اقدامات کے ذریعے وہ آمرانہ و شاہانہ انداز میں حکمرانی کرنے لگا۔

بعدازاں یمن کے سیاہ و سفید کا مالک اور مطلق العنان سربراہ بن کر وہ کرپشن میں لتھڑ گیا۔ ہر سرکاری منصوبے میں علی عبداللہ صالح کا کمیشن مخصوص تھا۔ چنانچہ سرکاری آمدن صدر اور اس کے حواریوں میں تقسیم ہونے لگی۔ یمنی عوام ماضی کی طرح پس ماندہ اور زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم رہے۔

جس طرح گرگٹ رنگ بدلتا ہے، علی عبداللہ صالح اسی طرح اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے کبھی روس کا طرف دار بن جاتا۔ کبھی امریکا کی غلامی کرتا اور کبھی سعودی عرب کی چاپلوسی کرنے لگتا۔ یوں اپنے حیلے بہانوں، سازشوں اور ہتھکنڈوں سے وہ ۲۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا۔

۲۰۱۱ء میں جب بڑھاپے نے دستک دی، تو علی عبداللہ صالح نے اپنے بیٹے، جنرل علی صالح کو جانشین بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ جنرل علی یمنی فوج کے سب سے طاقتور دستے، ریپبلکن گارڈ کا سربراہ تھا۔ لیکن ایک تیونسی پھیری والے کی خودسوزی نے صدر علی عبداللہ صالح کے عزائم خاک میں ملا دیے۔

بوعزیزی کی خودسوزی سے جس "عرب بہار" کا آغاز ہوا، وہ اوائل ۲۰۱۱ء میں یمن تک آ پہنچی۔ یمنی عوام مہنگائی اور بیروزگاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے۔ وہ بھی تیونسی شہریوں کی طرح حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ ۲۰۰۲ء سے جنوبی یمن میں جاری القاعدہ اور سرکاری فوج

www.pdfbooksfree.pk

کی لڑائی نے عوام کی مشکلات بڑھا دی تھیں۔

اس دوران سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ بکیل اور حاشد قبائل کے سردار صدر علی عبداللہ صالح کے مخالف بن گئے۔ چناں چہ وہ صدر کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے لگے۔ ایک قاتلانہ حملے میں صدر بال بال بچا۔ آخر سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کی مداخلت پر اس نے نومبر ۲۰۱۱ء میں اپنے بتیس سالہ اقتدار کو خیرباد کہہ دیا۔

علی عبداللہ صالح نے اقتدار اپنے نائب، عبدربہ منصور ہادی کے سپرد کیا۔ منصور ہادی ۱۹۹۴ء سے یمن کے نائب صدر چلے آ رہے تھے۔ وہ ایک سنی العقیدہ مسلمان ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی وہ ملک میں قومی اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔

سابق صدر، علی عبداللہ صالح نے اپنی شرائط منوا کر اقتدار چھوڑا تھا، لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ "یمنی لومڑی" کی چال تھی۔ دراصل یمنی پارلیمان میں اس کی (حکمران) پارٹی، جنرل پیپلز کانگریس کے ارکان کی اکثریت تھی۔ لہٰذا جنوری ۲۰۱۲ء میں پارلیمان نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ علی عبداللہ صالح پر کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ بعدازاں پارٹی کا نیا صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔

صدر عبدربہ منصور ہادی کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ابھی اہم سرکاری عہدوں پر علی عبداللہ صالح کے حواری فائز ہیں۔ لہٰذا حکمرانی کرنے کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس حقیقت نے نئے صدر کو سابق حکمران کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

نئے یمنی صدر کی بدقسمتی تھی کہ وہ بیشتر سنی قبائل کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔ وجہ یہ کہ علی عبداللہ صالح نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس نے جنوبی یمن میں زیدی شیعہ قبائلی سرداروں کو وسیع زمینیں الاٹ کیں جہاں وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ نیز اکثر ترقیاتی منصوبے شمالی یمن ہی میں انجام پائے۔

سابق یمنی صدر کی یک رخی پالیسی کے باعث ۱۹۹۴ء ہی میں جنوبی یمن کے سنی قبائل نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ علی عبداللہ صالح بہ مشکل اس بغاوت کو دبا سکا۔ لیکن آج بھی جنوبی یمن میں بعض سنی قبائل نے علیحدگی کی تحریک چلا رکھی ہے۔

صدر منصور ہادی رفتہ رفتہ حکومت اور فوج میں اپنا اثرورسوخ بڑھاتے چلے گئے۔ اس امر نے علی عبداللہ صالح کو چوکنا کر دیا اور اسے اپنا اثرورسوخ ختم ہوتا محسوس ہوا۔ چناں چہ سابق اور حاضر صدور کے مابین چپقلش کا آغاز ہوا۔ امریکا اور سعودی عرب صدر ہادی کے حمایتی تھے کیونکہ انھوں نے جنوبی یمن میں القاعدہ کے خلاف بھرپور عسکری مہم چھیڑ رکھی تھی۔

آہستہ آہستہ صدر منصور ہادی کو احساس ہوا کہ اپنی حکمرانی مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فوج اور حکومت میں علی عبداللہ صالح کے کارندے برطرف کیے جائیں۔ چناں چہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے انھیں گھر بھجوانے لگے۔ اس مخالفانہ مہم کا نقطہ عروج مارچ ۲۰۱۳ء میں اس وقت دیکھنے کو ملا جب ریپبلکن گارڈز توڑ دی گئی۔

اس اقدام سے علی عبداللہ صالح کی عسکری قوت کم کرنا مقصود تھا۔ اس نے جو اپنی طاقت پر ضرب پڑتے دیکھی، تو کھل کر صدر ہادی کے خلاف میدان میں اتر آیا۔ اس نے پھر ایسی شاطرانہ چال چلی کہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر ملک و قوم کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیل دیا۔

ہوا یہ کہ شمالی یمن کے بالائی پہاڑی علاقوں میں زیدی شیعوں کا ایک گروہ، حوثیوں طویل عرصہ علی عبداللہ

www.pdfbooksfree.pk

عدن کی حکومت کے خلاف برسرپیکار رہا۔ حوثی رفتہ رفتہ طاقت پکڑتے گئے اور ۲۰۱۳ء تک بالائی شمالی یمن کے تین چار صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

اب اپنی طاقت کو دوام بخشنے کی خاطر علی عبداللہ صالح نے حوثیوں کو ابھارا کہ وہ یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیں۔ یمنی فوج میں افسروں اور جوانوں کی اکثریت علی عبداللہ صالح کی حمایتی تھی۔ لہٰذا ان کی خدمات بھی حوثیوں کے سپرد کر دی گئیں۔ عسکری حمایت پا کر حوثی اتنے طاقتور ہوئے کہ دارالحکومت صنعا کی سمت پیش قدمی کرنے لگے۔

ادھر صدر منصور ہادی سابق صدر کی سیاسی و عسکری حمایت سے محروم ہوئے، تو خود بخود ان کی حکومت کمزور ہو گئی۔ چناں چہ ستمبر ۲۰۱۴ء میں حوثیوں نے صنعا پر قبضہ کر لیا۔ صدر ہادی نے کوشش کی کہ حوثیوں کو اقتدار میں شریک کر لیں، مگر انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ چناں چہ کوئی راہ نہ پا کر وہ پہلے عدن اور پھر مارچ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

فروری ۲۰۱۵ء میں حوثیوں کے لیڈر، محمد علی حوثی نے نئی حکومت چلانے کے لیے ایک انقلابی کمیٹی تشکیل دی اور شمالی یمن میں اقتدار سنبھال لیا۔ تاہم سنی قبائل نے حوثی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حوثیوں نے جنوبی یمن پر دھاوا بول دیا۔ سنی قبائل کو تحفظ دینے کی خاطر ۲۵ مارچ سے سعودیہ اور دیگر عرب ممالک کے طیارے حوثیوں کی فوجی تنصیبات پر حملے کرنے لگے۔

بعدازاں حوثی فوج نے بندرگاہ عدن پر حملہ کر دیا جہاں بڑی تعداد میں پاکستانی بھی مقیم تھے۔ ان پاکستانیوں کو وطن لانے کے لیے خصوصی اقدامات کرنا پڑے۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک عدن میں منصور ہادی کی وفادار فوج، سنی قبائل اور حوثیوں کے مابین جنگ جاری ہے۔

مغربی میڈیا نے بالخصوص یہ دعویٰ کیا کہ ایران حوثیوں کو عسکری و مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ گو ایرانی حکومت نے اس دعویٰ کو الزام قرار دیا ہے، تاہم سیاسی طور پر وہ تحریک حوثیان کی حمایت کرے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ امریکا حوثیوں کا مخالف ہے۔

سعودی عرب نے ایک تو یمن میں ایرانی اثرات پھیلنے سے روکنے پر حملہ کیا۔ دوسرے شاہ سلمان اپنے محبوب بیٹے، محمد کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ محمد ابن سلمان دنیا کے کم عمر ترین وزیر دفاع ہیں۔ سعودی افواج انھی کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئیں۔

یہ درست ہے کہ تحریک حوثیان بنیادی طور پر مذہبی تنظیم ہے۔ تاہم علی عبداللہ صالح حکومت کے ساتھ تنازعات نے اسے طاقتور سیاسی تحریک میں بدل ڈالا۔ حوثی قیادت کا دعویٰ ہے کہ وہ یمن میں کرپٹ نظام حکومت ختم کر کے عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن سنی قبائل خصوصاً حوثی حکومت دیکھنے کو تیار نہیں، وہ انھیں برا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا صورت حال دیکھتے ہوئے یمنی خانہ جنگی کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔

ان حالات میں علی عبداللہ صالح کوشش کر رہا ہے کہ اب اپنے بیٹے کو نیا یمنی حکمران بنوا دے۔ وہ اسے سب کے لیے قابل قبول حل کی صورت پیش کرنے کی کوششوں میں ہے۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ یمن میں اپنے خاندان کا اقتدار بحال کرنے کے لیے علی عبداللہ صالح نے جو شاطرانہ کھیل کھیلا، اس میں اسے کامیابی ملتی ہے یا نہیں۔ اس کھیل نے بہرحال یمن کو تباہی و بربادی کے نئے دور میں ضرور دھکیل دیا۔ ●●●

www.pdfbooksfree.pk

قاضیِ وقت الجھن میں.....

خزانے کا مالک کون؟

اس عاقل ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی عقل کے سہارے حل کر ڈالی

بشیر احمد بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی ممالک میں مقدمات کے فیصلے قاضی کرتے تھے۔ قاضیوں کی بھرپور کوشش ہوتی کہ کوئی شخص اپنے حق سے محروم نہ رہے۔ وہ ہر فیصلہ حق بجانب کرنے کی سعی کرتے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل قاضی رات بھر جاگتا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ کر مقدمہ کے حقائق تلاش کرتا تاکہ ناانصافی نہ ہو۔ بعض زندہ ضمیر قاضی اسی کوشش میں اکثر اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے تھے۔

ایک بار ایک قاضی کی عدالت میں عجیب نوعیت کا مقدمہ آیا۔ دو آدمیوں کے مابین فیصلہ ہونا تھا۔ مقدمہ ذرا پیچیدہ قسم کا تھا۔ ایک غریب آدمی نے ایک امیر سے مکان خریدا۔ غریب آدمی کا نام عبدل اور امیر کا محمود تھا۔ عبدل نے محنت کر کے پیسا کمایا تھا۔ اسی پیسے سے اس نے محمود سے مکان خرید لیا۔

عبدل مکان کی مرمت کرانے کا خواہش مند تھا۔ اس سلسلے میں کھدائی ہو رہی تھی کہ ایک کمرے میں زیرِ زمین سے خزانہ نکل آیا۔ جب محمود کو یہ علم ہوا کہ مکان سے خزانہ نکلا ہے، تو وہ عبدل سے تقاضا کرنے لگا "اس خزانے پر میرا حق ہے۔ میں نے تجھے مکان بیچا تھا، خزانہ نہیں۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خزانہ میرے حوالے کر دو۔"

جبکہ عبدل کا مؤقف یہ تھا "مکان میں نے خریدا ہے۔ اب اس کے اندر پتھر، روڑا، الابلا، خزانہ، جو کچھ بھی ہے اس پر میرا حق ہے۔ کیونکہ میں تمہیں رقم ادا کر چکا۔"

اس بات پر دونوں فریقین میں کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ لڑائی جھگڑے تک نوبت آ گئی۔ محلے

www.pdfbooksfree.pk

کے چند شرفا نے محمود کو مشورہ دیا کہ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، تم شہر کے قاضی سے رجوع کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو، اس کے مطابق عمل کر لیا جائے۔ قاضی اگر یہ فیصلہ کرے کہ خزانہ مکان فروخت کرنے والے کا ہے، تو خزانہ محمود لے۔ اگر قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ خزانہ مکان خریدنے والے کا ہے، تو وہ عبدل کا ہوا۔ محلے داروں کے مشورے پر محمود نے قاضی وقت کی عدالت میں مدعا علیہ بن کر تمام حقائق لکھ درخواست دائر کر دی۔

قاضی سلطان احمد نے درخواست کے تمام متن پر غور کیا اور چکرا کر رہ گیا۔ یہ بڑا عجیب نوعیت کا مقدمہ تھا۔ اس وقت قاضی باضمیر تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں انصاف کا بول بالا ہوگا۔ تل بھر کسی سے زیادتی نہ ہوگی۔ ہر آدمی کے اعمال نامے کے مطابق اسے جزا اور سزا ملے گی۔ دنیاوی عدالتوں میں جو ناانصافیاں ہوں گی، اُن کا بھی حساب دینا ہوگا۔

قاضی سلطان احمد ایک بار جو فیصلہ صادر کرتے، اس سے قبل تمام معاملے کی خوب چھان پھٹک کرتے تھے تاکہ کسی فریق کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ انھوں نے محمود کی درخواست کا جائزہ لینے کے بعد عبدل کو عدالت میں طلب کیا۔ فریقین کی بات غور سے سنی اور چند دن بعد عدالت میں پیشی کی انھیں تاریخ دے دی۔ وہ قانونی کتب سے مقدمے کے سلسلے میں دلائل اور حقائق کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

کیس خاصا گمبھیر تھا۔ قاضی سلطان احمد کے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور پیچیدہ مقدمہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس خزانے پر اصل حق کس کا بنتا ہے..... مکان فروخت کرنے یا مکان خریدنے والے کا حق؟ دونوں کی حق تلفی سلطان احمد کو کھٹک رہی تھی۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتی، تو اس کا تمام وبال قاضی سلطان احمد کے کاندھوں پر ہوتا۔ یہی بات انھیں پریشان کر رہی تھی۔

اصل حق دار اگر خزانے سے محروم ہو جاتا، تو یقیناً یہ سراسر زیادتی ہوتی۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا تھا، کافی سوچ بچار کے بعد وہ اسے اپنانا چاہتے تھے تاکہ حقدار کو اس کا حق مل جائے۔ سلطان احمد کی نیند اڑ گئی۔ گھر میں رکھی ہوئی تمام قانونی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ بہرکیف وہ ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ وقت بہت ہی کم تھا۔ پیشی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ کٹھن تھا۔

قاضی سلطان احمد عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ تمام کتابوں میں اس قسم کے مقدمے کی کوئی حتمی دلیل انھیں نہ مل سکی۔ وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کر کے اسے بند کرتے، تو سوچنے بیٹھ جاتے کہ کیا میں اس مقدمے کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہوں؟ تب کیسا قاضی ہوا؟

قاضی سلطان احمد کے پاس ایک ملازمہ کام کرتی تھی۔ وہ عاقل و دانا تھی۔ رات کو سونے سے قبل قاضی صاحب گرم دودھ کا ایک پیالہ پی کر سوتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ رات کو ملازمہ دودھ کا پیالہ لے کر آئی، تو اس نے دیکھا، قاضی صاحب لالٹین کی روشنی میں ایک موٹی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا تمام دھیان کتاب کی طرف تھا۔ ملازمہ نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

وہ چند راتوں سے دیکھ رہی تھی کہ قاضی صاحب بہت زیادہ مطالعے میں مصروف ہیں۔ یقیناً کوئی ایسا مسئلہ ہے جو ان سے حل نہیں ہو رہا۔ ملازمہ پہلے تو ٹکٹکی باندھے مالک کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی "محترم قاضی صاحب! دودھ کا پیالہ میں نے میز پر رکھ دیا ہے۔ یہ بتانے کی جسارت اس لیے کی ہے کہ کہیں بے خیالی میں آپ کا ہاتھ پیالے سے نہ ٹکرا جائے۔ اس طرح وہ نیچے گر سکتا ہے۔"

قاضی صاحب نے کتاب بند کر کے ملازمہ کی طرف نگاہ کی اور بولے "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔"

ملازمہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ڈرتے

www.pdfbooksfree.pk

ڈرتے قاضی صاحب سے کہا "اگر آپ ناراض نہ ہوں، تو ایک سوال کر سکتی ہوں؟"

وہ بولے "ہاں ہاں، کیوں نہیں، پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟"

ملازمہ بولی "جناب میں چند راتوں سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ پوری رات جاگ کے کتب بینی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بتائیں گے۔"

وہ مسکرائے اور بولے "تم جانتی تو ہو میں قاضی ہوں۔ میری عدالت میں مختلف نوعیت کے مقدمے آتے رہتے ہیں۔ بعض اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ راتوں کی نیند اور دن کا قرار ختم کر دیتے ہیں۔"

انھوں نے پھر ملازمہ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ دبے لفظوں میں بولی "قاضی صاحب! یہ تو معمولی مقدمہ ہے۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ خوامخواہ اپنا سکون غارت کر دیا۔ اتنے چھوٹے سے مسئلے کو آپ نے پیچیدہ قرار دے ڈالا۔ لو یہ کوئی انہونی بات تو نہیں، جس کے لیے آپ کئی راتوں سے شب بیداری کر رہے ہیں۔ پہلے ہی روز مجھے یہ بتا دیتے، تو میں آپ کو بتاتی کہ اس خزانے پر کس کا حق ہے؟ مکان خریدنے یا بیچنے والے کا۔" یہ کہہ کے ملازمہ خاموش ہو گئی۔

قاضی صاحب حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ سوچنے بیٹھ گئے "کمال ہے کل کی چھوکری اور اتنا بڑا دعویٰ کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں نے قانون کی تمام کتابیں کھنگال ڈالیں اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور اس نے کھڑے کھڑے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ حیرت ہے بھئی۔ ذرا سنوں تو یہ کیا کہتی ہے؟ بات ہے ذرا تیز سی! دیکھوں تو سہی اس کے دماغ میں کیا کچھ آیا ہے، جو اس نے چند ثانیوں میں چٹکی بجاتے ہی گمبھیر مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ اگر بات میری سمجھ میں آگئی، تو اس کے مطابق میں فیصلہ کر دوں گا۔"

وہ ملازمہ سے بولے "ہاں میری بچی، تمھیں اجازت ہے۔ کھل کر بتاؤ۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟"

ملازمہ نے لہجہ دھیما رکھا اور قاضی صاحب کو ایک ایسی مثال دی کہ وہ ششدر رہ گئے۔ لڑکی نے واقعی مسئلے کو حل کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ فریقین نے دو دن بعد عدالت میں پیش ہونا تھا۔ قاضی صاحب اتنے خوش ہوئے کہ ملازمہ سے کہا "یہ دودھ کا پیالہ اٹھاؤ، اسے دوبارہ گرم کرو اور نوش کر لو۔"

لڑکی نے ذرا تذبذب سے کام لیا، تو قاضی صاحب نے فرمایا "یہ ہمارا حکم ہے کہ یہ دودھ اب تم نوش کرو۔ آج رات ہم بغیر دودھ پیے سوئیں گے۔"

ملازمہ نے پیالہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

قاضی صاحب نے لالٹین بجھائی اور اطمینان سے سو گئے۔ پیشی والے دن قاضی سلطان احمد عدالت پہنچے۔ دونوں فریق بھی فیصلہ سننے کے لیے موجود تھے۔ قاضی صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ وہ بولے "جس شخص نے مکان خریدا، خزانہ اسی کا ہے۔"

یہ فیصلہ سن کر محمود کچھ تلملایا۔ پوچھا کہ یہ فیصلہ کس بنیاد پر ہوا ہے؟ قاضی صاحب نے ملازمہ کی بیان کردہ مثال دہرا دی۔ اسے سن کر محمود بھی گنگ رہ گیا اور اسے قاضی کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔

ملازمہ نے جو مثال دی اب وہ ملاحظہ فرمائیے:

ملازمہ نے قاضی صاحب سے کہا "جناب فرض کیا آپ کے پاس مرغی ہے۔ آپ نے وہ مرغی کسی شخص کو فروخت کر دی۔ خریدار مرغی اپنے گھر لے گیا۔ دوسرے روز مرغی نے اس کے گھر سونے کا انڈا دیا۔ وہ انڈا آپ کا ہو گا یا خریدار کا؟"

وہ بولے "ظاہر ہے، وہ انڈا خریدار کو ملے گا۔"

لڑکی بولی "تو جناب یہ خزانہ بھی اب اس شخص کا ہے جس نے مکان خریدا۔"

مثال اتنی قوی ثابت ہوئی کہ قاضی صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

قبول اسلام

کافر گھرانے میں جنم لینے والا

ہندو جو مسلمان ہو کر پروفیسر بنا

سید الانبیاؐ کی نظر عنایت نے راہ سے بھٹکے ایک نوجوان کو ہدایت دے دی..... ایمان افروز آپ بیتی

پروفیسر غازی احمد

میں ۱۹۲۲ء میں ضلع جہلم (اب چکوال) کے دور افتادہ گاؤں، میانی میں ایک ہندو خاندان کے گھر پیدا ہوا۔ والدین نے میرا نام کرشن لال تجویز کیا۔ خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے۔ شروع شروع میں میرا میلان طبع بھی انہی عقائد و نظریات کی طرف تھا۔ جب آٹھویں جماعت میں پہنچا، تو میرا رجحان خود بخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔

اسی اثنا میں بوچھال کلاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کر دی۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن ابھی لڑکپن کی منزل ہی کا راہی تھا، اس لیے اپنے آبائی مذہب، خاندان، بہن بھائیوں، والدین اور گھر بار کو چھوڑنے کا خیال بھی میرے ننھے سے دل میں قیامت خیز لرزہ برپا کر دیتا۔ جب بھی اسلام قبول کرنے کا خیال آتا، دل میں ماں اور بھائیوں کی محبت کا بہاؤ تیز ہو جاتا۔ بچپن کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی میرے آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا۔

یکم مارچ ۱۹۳۸ء کی سہانی اور مبارک رات میں نے خواب دیکھا کہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کے عین سامنے کھڑا ہوں۔ سید الاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ (فداہ روحی، ابی، امی) دیوار کعبہ سے تکیہ لگائے جلوہ افروز ہیں۔ اردگرد صحابہ کرام رضوان اللہ

www.pdfbooksfree.pk

علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں۔ میں والہانہ جذبہ و شوق کے عالم میں صحابہ کرامؓ کے درمیان سے گزرتا سید الانبیا ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پہنچا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے بدن کے رگ و ریشہ میں مسرت و شادمانی کی عجیب لہر دوڑ گئی۔

فرمایا ''کہو کیسے آئے؟''

''مشرف باسلام ہونے آیا ہوں۔'' میں نے عرض کیا۔

یہ سن کر آنحضرت ﷺ کا پر انوار چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔ میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر آپ ﷺ نے کچھ پڑھا جسے میں اس وقت سمجھ نہیں سکا۔ پھر فرمایا ''بس اب تم دولت اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔''

حسب معمول صبح آنکھ کھلی، تو میرا ننھا سا دل خوشی کے جذبات سے معمور تھا۔ جب والدہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، تو انھوں نے مجھ سے خلاف معمول اس قدر خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی۔ میں بات ٹال گیا۔

مدرسے کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف سے مل کر جب رات کا پُر لطف خواب سنایا، تو انھوں نے فرمایا ''روزانہ سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے راہ ہدایت کی دعا کیا کرو۔'' تین مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعرات کا دن تھا۔ میں رات کو حسب معمول سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہوا جیسے چھٹی ہونے پر میں میانی کے تمام طلبہ کے ساتھ گھر واپس آ رہا ہوں۔ راستے میں ایک قوی ہیکل، دیو قامت اور کریہہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہو گیا۔

میں نے ساتھیوں سے کہا ''یہ دجال ہے۔ جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو، وہ یہی جواب دے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

وہ پھر میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا۔ جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا، اسے قسم قسم کے کھانے، مزے کے پھل اور طرح طرح کے کھلونے دیتا۔ جو اس کی بات نہ مانتا، اسے مارتا پیٹتا۔ آخر جب میری باری آئی، تو اس نے پوچھا ''کس کے بندے ہو؟''

''اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی اس نے مجھے اس زور سے گھونسا رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا اور رونے لگا۔ دجال نے تحکمانہ لہجہ میں آواز دیتے ہوئے کہا ''ادھر آؤ۔''

میں ڈرتا کانپتا ادھر جانے لگا تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی اکرم ﷺ کی شیریں آواز پڑی۔ ''پہلے

صاحب تحریر

پروفیسر غازی احمد ۲؍جون ۱۹۲۴ء کو میانی میں پیدا ہوئے۔ یہ مشہور قصبے، بوچھال کلاں کے قریب واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ قبول اسلام کے بعد پاکستان ہی میں مقیم رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد شعبہ تدریس کی طرف آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج، بوچھال کلاں میں طالبان علم کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ عربی کی مشہور کتب، الھدایہ اور اصول الشاشی کا اردو ترجمہ کیا۔ ممتاز اسلامی سپہ سالار، موسیٰ بن نصیر کی داستان حیات لکھی، نیز احادیث نبوی ﷺ پر ایک کتاب مرتب کی۔ آپ نے ۲۵؍اگست ۲۰۱۰ء کو وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

میرے پاس آؤ۔"

آپ ﷺ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ سوچا، ابھی دو دن پہلے تو میں نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا، آج آپؐ یہاں تشریف لے آئے؟ میں دجال کے خوف سے روتا ہوا آنحضرت ﷺ کی بارگاہ رسالت میں پہنچا۔ آپ ﷺ نے میری کمر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا "دیکھو، دجال کی بات ہرگز نہ ماننا، میں تمھارے لیے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ناکامی کا منہ نہیں دیکھو گے۔"

یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ جب تشریف لے گئے، تو میں دجال کے پاس پہنچا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا۔ اس پر وہ مارے غضب کے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے جھلا کر جب میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو مارے دہشت کے میں چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر صبح تک مجھے نیند نہ آ سکی۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی بوچھال کلاں پہنچ کر قبول اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ والدہ محترمہ نے جب صبح ناشتا تیار کیا، تو انہی کے پاس بیٹھ کر کھایا۔ اس وقت دل میں جذبات کا تلاطم بپا تھا۔ جانتا تھا کہ آج ہمیشہ کے لیے ماں اور بھائیوں سے جدا ہو رہا ہوں۔ پھر اس گھر میں جہاں زندگی کی کئی بہاریں لوٹی ہیں، شاید ہی دوبارہ یہاں قدم رکھنا نصیب ہو۔ چھوٹے بھائیوں کی محبت و شفقت نے مجھے مجبور کیا، تو بہانے بہانے سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر دل کو تسکین دی۔

اسی طرح حیلے بہانے سے پیاری اماں کے قدم چوم کر ہدیہ عقیدت و احترام پیش کیا۔ کھانے سے فارغ ہوا، تو بستہ اٹھایا۔ گھر، تینوں بھائیوں اور محترمہ والدہ کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پرنم آنکھوں سے اپنے آبائی گھر سے رخصت ہو گیا۔

۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعہ کا مبارک دن اور محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ میں سیدھا مسجد میں داخل ہوا۔ مولانا عبدالرؤف نے مجھے مشرف با سلام کر کے غازی احمد نام تجویز کیا۔ میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی، تو کہرام مچ گیا۔ سب رونے پیٹنے لگے۔ میرے والد کشمیر میں ملازم تھے۔ انھیں اور دیگر رشتہ داروں کو بذریعہ تار اس خبر سے مطلع کیا گیا۔ ابھی تین چار روز بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ والد نے رشتہ داروں سے مل کر مولانا عبدالرؤف اور ملک محمد طفیل، ہیڈ ماسٹر پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انھوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ورغلا کے زبردستی مسلمان بنا لیا ہے۔

ایس۔ ڈی۔ ایم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ ایک طرف والد اور متعدد ہندو رشتے دار تھے، دوسری طرف میں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان! عدالت میں میرا بیان لیا گیا۔ میں نے کہا "میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔" جب فیصلہ میرے حق میں ہوا، تو مسلمان خوشی سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے عدالت سے واپس لوٹے۔

میرے والد بھلا کب خاموش بیٹھنے والے تھے، انھوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر انھیں کہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ پولیس نے ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا۔ مگر میرے رشتہ داروں کو اپنا مقصد حل ہوتا نظر نہیں آیا۔ ہر عدالت میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان میرے ساتھ ہوتے جو اکثر

www.pdfbooksfree.pk

اوقات بوچھال کلاں سے پیدل چل کر جایا کرتے۔ اس کے بعد والد نے سیشن جج جہلم سے رجوع کیا اور کہا ''میرے نابالغ لڑکے کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا ہے۔'' جہلم کے سرکردہ ہندو ان کے ساتھ تھے، جنھوں نے مل ملا کر جج صاحب پر دباؤ ڈالا۔

عدالت میں پیشی ہوئی، تو میں نے محسوس کیا کہ جج کا رویہ میرے بارے میں ٹھیک نہیں۔ اس پیشی پر دو تین مسلمان میرے ساتھ تھے۔ جج صاحب نے مجھے دوسری پیشی تک والد کے سپرد کر دیا۔ جب میں نے انکار کیا، تو مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا۔ پھر مجھے دریا کنارے ایک مندر لایا گیا جہاں سارا دن میں نے رو رو کر گزارا۔ اسی دوران والدہ محترمہ کو جہلم بلایا گیا۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی ''اگر تم نے ہمارے حق میں بیان نہ دیا، تو میں گھر زندہ نہیں جاؤں گی بلکہ دریا میں کود کر خودکشی کرلوں گی۔'' دوسرے ہندو بھی وقتاً فوقتاً آکر مجھے سمجھاتے بجھاتے اور قسم قسم کے لالچ دیتے رہتے۔

اس اثنا میں والد نے ہندو اکابر کے اثر و رسوخ سے کام لے کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ اسے مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے ہی عدالت میں پیش کیا۔ جج صاحب نے جب مجھ سے پوچھا کہ آپ والدین کے پاس رہنے میں خوش ہیں؟ تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن افسوس، میری کسی بات کو اہمیت نہ دی گئی اور زبردستی مجھے والدین کے سپرد کر دیا گیا۔

تعجب تو اس بات پر تھا کہ والد کے حق میں فیصلہ دینے والے جج صاحب مسلمان تھے۔ بعدازاں والدہ نے بتایا کہ انھوں نے جج کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرایا تھا۔

اسی دن والد مجھے ساتھ لیے کشمیر روانہ ہو گئے۔ تین دن ہم جموں میں ایک پنڈت کے ہاں فروکش ہوئے۔ پنڈت نے مجھے رام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اس کے غیر معقول دلائل مجھے متاثر نہ کر سکے۔ کشمیر پہنچ کر میں نے مولانا عبدالرؤف کو خط بھجوانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

والد نے سوتے میں وہ خط میری جیب سے نکال کر ضائع کر دیا۔ چوتھے دن والد مجھے لیے بھدرواہ روانہ ہو گئے۔ بنوت تک بس کے ذریعے پھر بھدرواہ تک پیدل راستہ طے کیا۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کہا ''دیکھو میں اس مقدمے میں تم پر دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ خاندان میں میری ذرہ برابر عزت نہیں رہی۔''

یہ کہتے ہوئے والد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میرا دل پسیج گیا، مگر رحمت ایزدی نے مجھے سہارا دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کے تمام حالات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں نے والد کی خدمت میں عرض کیا ''مجھے آپ کی پریشانیوں اور تکالیف کا احساس ہے۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میرا دل ترک اسلام کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں، تو تمام عمر آپ کی غلامی میں بسر کروں گا۔''

والد یہ سنتے ہی چھڑی ہاتھ میں لے کر مجھے پیٹنے لگے۔ اتنا پیٹا کہ بدن سے خون بہنے کے باعث میرے سارے کپڑے سرخ ہو گئے۔ اس پر بھی انھیں رحم آیا اور

www.pdfbooksfree.pk

نہ اُن کی مار میں کوئی کمی آئی۔ میں آدھ موا ہو کر پڑا ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر جب وہ دل کا غبار اچھی طرح نکال چکے، تو پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''کیوں نہ میں اسے دریا میں دھکیل دوں۔ شاید اسی طرح کلنک کا یہ ٹیکا میرے ماتھے سے اتر جائے۔''

پہاڑی کے دامن میں بپھرا دریا میرے سامنے تھا۔ اپنی موت کے خوف سے میں لرز گیا، مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے، اس نے میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔ میرے دل میں یہ خیال بار بار ابھرنے لگا کہ اگر والد مکرم نے مجھے دریا میں پھینکا، تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا ''میرے آقا آپ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی تھی، میں اس کو صحیح وسالم لیے حاضر ہو گیا ہوں۔''

پنڈت صاحب نے جو مارے خوف کے کانپ رہے تھے، والد سے کہا ''ابھی یہ بچہ ہے۔ بڑا ہو کر سنبھل جائے گا۔ آپ کوئی سخت اقدام نہ اٹھائیں۔''

والد نے پنڈت کی بات مان لی اور مجھے ساتھ لے کر چپ چاپ گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر والد نے خود ہی میری مرہم پٹی کی۔ چمڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا روآں روآں زخمی تھا، حتیٰ کہ ناک، منہ اور آنکھیں تک سوجی ہوئی تھیں۔

میں تقریباً ہفتہ بھر بستر پر دراز رہا۔ پھر والد نے مجھے بھدرواہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں روز اسکول آنے جانے لگا۔ مسلمان طلبہ کو میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو لڑکے ہی نہیں اساتذہ بھی مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ وہ اسکول میرے لیے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا۔

آخر کار میں نے دوست محمد نامی مسلمان ہم جماعت سے تعلقات بڑھائے۔ اس کے توسط سے مولانا عبدالرؤف کو خط لکھا اور بتایا کہ میں بفضلہٖ تعالیٰ اسلام پر قائم ہوں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی دعا ہی کی برکت ہے کہ مجھے شدید جسمانی تکلیف بھی اسلام سے برگشتہ نہیں کر سکی۔ مولانا صاحب نے خط ملتے ہی قصبے کے سارے لوگوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا ''کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے عذاب سے چھٹکارا دلائے؟'' اس پر ایک غریب لیکن جذبہ شہادت سے سرشار شخص اٹھا اور اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ان کا نام جان محمد تھا۔

> ''میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد و بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔''

جان محمد اوقات مدرسہ ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے۔ دوست محمد کی وساطت سے جب مجھے ان کی آمد کا پتا چلا، تو میں آدھی چھٹی کے بعد روتا ہوا ماسٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور کہا ''میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ مجھے چھٹی عنایت فرمائی جائے۔'' ماسٹر نے چھٹی دے دی۔ میں نے بستہ اٹھایا اور چھپتا چھپاتا، ہندو طلبہ سے آنکھ بچاتا مدرسہ سے نکل آیا۔

جان محمد نے ایک مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم راتوں رات تیزی سے سفر کرتے ریاست کشمیر سے نکل ریاست چنبہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں مسلمان راہبر واپس ہو گیا۔ ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل سفر طے کر کے تیسرے دن صبح ڈلہوزی پہنچے۔ تکان سے میرا برا حال تھا۔ کپڑے میلے اور پاؤں سوج چکے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

شام کو بذریعہ پٹھانکوٹ امرتسر پہنچے، تو میں نے اپنا ہندوانہ لباس اتار کر اسلامی کپڑے پہن لیے۔ اب ہم امرتسر سے کھیوڑہ کی راہ بوچھال کلاں پہنچ گئے۔ بس اڈے پر مسلمانوں کا ہجوم ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھا۔

والد کو جب میرے فرار کا علم ہوا، تو انھوں نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرنے کے لیے تار دے دیے۔ لیکن جس راستے کو ہم نے اختیار کیا تھا، وہ ان کے علم میں نہ تھا، اس لیے بچ نکلے۔

چند روز بعد والدہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اشکبار ہو کر فرمایا "بیٹا ہمیں اس قدر ذلیل ہی کرنا تھا، تو پہلے بتا دیتے تاکہ روپے خرچ کرنے سے تو بچ جاتے۔"

عرض کیا "اماں جی! میں نے آپ سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں اسلام کو ترک کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے لیے کچھ نہ کیجیے۔ ہاں ویسے میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کی ہر خدمت میرے لیے باعث سعادت ہے۔ مجھے آپ کے وہ احسانات یاد ہیں کہ جب بھی خاندان والوں نے مجھے ختم کرنے کی کوئی سازش کی، تو آپ نے مجھے پہلے ہی مطلع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔"

میں نے والدہ سے صلح کر لی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مگر والد کو میں نے چھے سال بعد دیکھا۔ راستے میں اچانک آمنا سامنا ہو گیا، مگر وہ بغیر توجہ دیے قریب سے گزر گئے! میں بھی ان سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر میرے خاندان کے سبھی افراد بھارت چلے گئے۔ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ پاکستان میں رہا اور اپنے آبائی مکان منتقل ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے اطلاع ملی کہ والد چل بسے ہیں۔ والدہ اور تین بھائی انبالہ کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہوئے تھے۔

۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان میں نے اسکول میں اوّل رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعدازاں علوم دینیہ کی طرف توجہ دی، چناں چہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک مدرسہ خادم الشریعۃ پنڈی گھیپ، مدرسہ عربیہ اشاعۃ القرآن گجرات اور دارالعلوم دیوبند میں علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آیا۔

میرا ایمان ہے، یہ ساری کامرانیاں آنحضرت ﷺ کی دعا کی مرہون منت مجھے نصیب ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں بی۔ایڈ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے عربی کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے علوم اسلامیہ کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اوّل رہا۔ ان تمام عنایات پر میں اپنے مالک حقیقی کا شکر گزار ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر بہت بڑا ذہنی و روحانی انقلاب محسوس کیا۔ پہلے میں ایک متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی ترقی کے دروازے بھی میرے لیے کھول دیے۔ دوسری بات جو میں نے اپنی عملی زندگی میں محسوس کی کہ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا اثر ہے، مجھے آج زندگی کے کسی شعبے میں ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی دعا ہی میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ ان شاء اللہ قیامت کے دن یہی دعا میری نجات کا باعث ہو گی۔

(آمین ثم آمین)

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

دور جدید کا ایک المیہ

اسلام سے دور ہوتے مسلمان

مغربی تہذیب وثقافت انھیں اسلامی تعلیمات سے دور کررہی ہے

ڈاکٹر ندیم بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ادرنس اسکوائر مال پر میرا دفتر واقع تھا۔ اس مال میں ایک بنگلہ دیشی مسلمان، نجیب کی دکان تھی۔ ایک دن نجیب نے بتایا کہ سامنے جوتے مرمت کرنے اور تالے کی چابیاں بنانے والے چینی میاں بیوی مسلمان ہیں۔

مجھے ایک دفعہ اپنے دفتر کی چابیاں بنوانے ان کے پاس جانا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مسلمان ہیں، میں نے السلام علیکم کہا۔ دونوں میاں بیوی نے جواب نہ دیا اور میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے دوبارہ السلام علیکم کہا لیکن جواب نہ ملا۔ میں سمجھ گیا کہ انھیں السلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی۔ خیال آیا کہ یقیناً نجیب کو غلطی لگی ہے۔

میں نے پوچھا "آپ مسلمان ہیں؟"

دونوں نے جواب دیا "ہاں۔"

میں نے کہا "آپ کو السلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی؟"

انھوں نے جواب دیا "نہیں۔" پھر عورت نے بتایا کہ اس کی ماں ایسے الفاظ استعمال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ کو بسم اللہ کے متعلق معلوم ہے؟"

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے کہا ''نہیں۔''
میں نے پوچھا ''کلمہ آتا ہے؟''
جواب دیا ''نہیں۔''
میں نے پوچھا ''نماز کبھی پڑھی ہے؟''
کہا ''نہیں۔''
پھر پوچھا '' آپ اللہ کو جانتے ہیں؟''
انھوں نے جواب دیا ''ہاں۔''

گویا اسلام کے بارے میں ان کا علم صرف ایک لفظ تک محدود تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے گزرتے ہوئے انھیں السلام علیکم کہنے لگا اور ان کو جواب دینا سکھایا۔ باتوں باتوں میں اسلامی تعلیمات بھی سکھائیں۔ اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ کفر و شرک کے مغربی ماحول میں رہنے والے بہت سے مرد عورتیں مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام سے بہت دور ہیں۔

دنیا کے مختلف خطوں میں ماہرین مذہبی رجحانات کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس امر کا مطالعہ نہایت پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دن بدن لوگ مذہب کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ دوسری جانب مذہب بیزاری اور بغاوت بھی تحریک کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

حال ہی میں ون۔ گیلپ انٹرنیشنل (Win-Gallup International) کے سروے میں بتایا گیا کہ مذہبی رجحانات دم توڑ رہے ہیں۔ سروے کے مطابق دنیا کی ۵۹ فیصد آبادی اپنے آپ کو مذہبی کہتی ہے۔ ۱۳ فیصد نے اپنے آپ کو دہریہ (Atheist) کہا۔ ۲۳ فیصد آبادی نے بتایا کہ ان کا کوئی مذہب نہیں۔ اس تحقیق کے مطابق دہریے زیادہ تر چین، جاپان اور مغربی یورپ میں ملتے ہیں۔ مذہبی میلانات والے علاقوں میں افریقا، مشرق وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی یورپ اور لاطینی امریکا کے علاقے شامل ہیں۔

یہ سروے کی رو سے کم آمدنی والے افراد میں مذہبی رجحانات امرا کے مقابلے میں ۷ فیصد زیادہ ہیں۔ نیز زیادہ تعلیم یافتہ نسبتاً کم مذہبی رجحانات رکھتے ہیں۔ یہ دلچسپ بات بھی معلوم ہوئی کہ جوں جوں انسان بالغ ہو، اس کے مذہبی رجحانات میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ کمی ۶۵ سال کی عمر تک رہتی ہے۔ پھر مذہبی رجحان میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

> یہ مسلمان ہوگا۔ اعتماد کے ساتھ بے جھجک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی ''Who is it'' (کون ہے؟)

دور حاضر میں ایک طرف یہ سننے کو ملتا ہے کہ ۲۰۴۱ء تک مذاہب ختم ہو جائیں گے۔ دوسری جانب مذہبی رجحانات کے حامی محقق دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور کی بیداری لوگوں کو مذہب کے قریب لا رہی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کا اسلام کی طرف مائل ہونا روزمرہ کی حقیقت ہے۔

اس امر پر تمام ماہرین متفق ہیں کہ بڑے مذاہب میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اسلام ۱.۶ فیصد سالانہ کے حساب سے پھیل رہا ہے۔ سکھ ازم ۱.۴، عیسائیت ۱.۲ فیصد اور ہندومت بھی ۱.۲ فیصد کے حساب سے بڑھ رہے ہیں۔ ان مذاہب کی رفتار عالمی آبادی میں اضافے کی شرح سے ۱.۱ فیصد زیادہ ہے۔ حقائق سے عیاں ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اضافہ مسلمانوں کی تعداد

www.pdfbooksfree.pk

میں ہو رہا ہے۔

یورپ اور شمالی امریکا میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا۔ نومسلموں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور شعوری طور پر مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ مصدقہ کتب کے مطالعے اور اپنے مشاہدے کی بدولت پختہ بنیادوں پر مسلمان بنتے اور بہت باعمل ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو مختلف غیر اسلامی، سماجی اور سیاسی قوتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ جہاں ایک طرف نئے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، وہیں بہت سے افراد سماجی اور معاشی حالات کی بنا پر دور بھی ہو چکے۔

مجھے یاد ہے، جب یہ سلسلہ تعلیم آسٹریلیا جانے کا موقع ملا، تو جس ہوسٹل میں رہائش ملی، اس میں میرے علاوہ کوئی مشرقی طالب علم نہ تھا۔ چونکہ مجھے کوئی جانتا نہیں تھا، اس لیے میری سعی رہی کہ کسی سے سماجی رابطہ قائم کروں۔ ایک دن ایک کمرے کے باہر "اسمٰعیل" لکھا دیکھا۔ فوراً یقین کر لیا کہ یہ مسلمان ہوگا۔ اعتماد کے ساتھ بے جھجک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی "Who is it" (کون ہے؟)

میں نے دیکھا، تو ایک نیم برہنہ لڑکی نظر آئی۔ میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔ سمجھ نہیں آئی کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ بہرحال خفت مٹانے کے لیے کہا "Can I see Ismail" (کیا میں اسمٰعیل سے مل سکتا ہوں؟)

لڑکی نے دروازہ ذرا زیادہ کھولا اور بستر میں سوئے پڑے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا "Here he is" (وہ رہا)۔

اب میں سچے اسلامی جذبے کے ساتھ وہاں گیا تھا، لیکن منظر میری توقعات کے برعکس نکلا۔ میں نے کہا "Ok talk to you later" (میں پھر آؤں گا)۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

کچھ دن بعد اسمٰعیل مجھے کھانے کے وقت ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا "Are you Muslim?" (کیا تم مسلمان ہو؟)

اس نے کہا "Well, my father is" (میرے والد مسلمان ہیں)۔

میں نے پوچھا "آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

جواب ملا "مراکش سے ہوں۔ چھوٹا سا تھا جب میرے والدین آسٹریلیا کی شہریت لے کر یہاں چلے آئے۔" میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین سے الگ ہو چکا اور اسلام کی کسی تعلیم پر عمل نہیں کرتا۔ مغرب میں بسے ایسے ہزاروں نوجوان غیر اسلامی، معاشرتی اور معاشی حالات میں اسلام سے دور ہو رہے ہیں۔ لیکن ہماری گنتی میں وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سڈنی اولمپکس ۲۰۰۰ء میں مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ میں تب سڈنی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کے سوئمنگ پول پر تعینات تھا۔ اس جگہ مختلف ٹیمیں پریکٹس کرنے آیا کرتی تھیں۔ ان میں قازقستان کی ٹیم بھی شامل تھی۔ ٹیم کے کپتان کا نام اسکر (اصغر) تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں اس کے قریب ہو گیا۔

ایک روز اپنے لیے دوپہر کا کھانا لانے لگا، تو کچھ زیادہ خوراک ساتھ لے لی تاکہ اصغر کو بھی کھانے میں شامل کر سکوں۔ میں نے اصغر سے کہا کہ آپ کو یہاں حلال کھانا ملنے میں دشوار ہوتی ہوگی، اس لیے گھر سے بنا کر لایا ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اصغر نے کہا "میں حلال

www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ کی پروا نہیں کرتا اور سب کچھ کھا لیتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "پورک" بھی کھا لیتے ہو؟"

اس نے بتایا کہ قازقستان میں لوگ زیادہ حلال حرام کا خیال نہیں کرتے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مسلمان اپنے بنیادی اعتقادات سے دور ہو چکے۔ وہ مغربی ثقافت کے زیر اثر برائے نام مسلمان رہ گئے ہیں۔ لیکن اللہ کی قدرت اور اسلام کے دیرپا اثرات کی بدولت صبح کے بھولے شام کو گھر واپس بھی آ رہے ہیں۔

میں آسٹریلیا کی یونیورسٹی آف نیو انگلینڈ کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں ایک پادری، فادر فورٹ (Father Forte) رہائش پذیر تھا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا "Nadeem, Do you know any Imam?" (ندیم، تم کسی امام کو جانتے ہو؟)

میرے لیے یہ سوال عجیب سا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی، تو اس نے بتایا، یونیورسٹی سے کچھ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں ایک بزرگ قریب المرگ ہے۔ اس کو کسی مسلم امام کی ضرورت ہے۔ میں نے یونیورسٹی کی مسجد میں دوستوں کو بتایا، تو انھوں نے گاؤں جانے کی ہامی بھر لی۔

گاؤں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک پچاسی سالہ بوڑھا جو دیکھنے میں انگریز لگتا تھا، سخت بیمار ہے۔ وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کے بیٹے بہو اور پوتے پوتیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ اس شخص کا نام مسٹر خاں تھا۔ پتا کرنے پر عیاں ہوا کہ وہ ۱۸ سال کا تھا جب صوبہ سرحد سے آسٹریلیا آیا۔ آنے کے بعد کاروبار کیا اور کامیاب تاجر بن گیا۔ آسٹریلیا میں ایک عیسائی گوری سے شادی کی اور بچوں کے نام بھی ایڈم خاں اور اینڈریو خاں وغیرہ رکھے۔ بچوں کی شادیاں بھی عیسائی عورتوں سے ہوئیں۔ یوں اگلی پوری نسل عیسائی ہو گئی۔ اس دوران خود مسٹر خان بھی اپنا مذہب بھول کر آسٹریلیا کے مغربی رنگ میں رنگ گیا۔

اب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا، تو اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ اس نے بتایا "میرے تکیے کے نیچے ایک کتاب پڑی ہے۔ اسلام کی یہی واحد نشانی میرے پاس موجود ہے۔" یہ قرآن مجید کا نسخہ تھا جو کسی نہ کسی طرح اس کے پاس محفوظ رہ گیا۔

دوستوں نے کوشش کی کہ وہ کلمہ طیبہ ادا کر سکے لیکن وہ ادا نہ کر سکا۔ ہم نے سوچا کہ اس کے قریب قرآن مجید کی تلاوت بآواز بلند کی جائے، تو شاید زبان سے کلمہ ادا ہو جائے۔ چناں چہ ہم نے پروگرام بنایا کہ روزانہ دو تین ساتھی گاؤں جائیں اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کیا کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ موت سے قبل اس پر رحم فرما کر ایمان کی موت نصیب فرما دے۔

چناں چہ کچھ دن تک ہم لوگ روزانہ باری باری وہاں جا کر تلاوت کرتے رہے۔ بالآخر ایک روز وہ کلمہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چند ہفتوں بعد مسٹر خاں فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوں وہ بھی ہزارہا تارکین وطن کی طرح اپنی نسل کو مغربی معاشرے میں ضم کر کے چل دیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے، اس انوکھی کیفیت کا جائزہ لیا جائے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، تو

دوسری جانب مغربی ثقافت اور معیشت کے زیر اثر بہت سے مسلمان اپنے دین و ایمان سے محروم ہو رہے ہیں۔ اہل دانش کو اس مسئلے کا حل سوچنا چاہیے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ایک حجّام نے حضرت جنید بغدادیؒ کو سبق سکھایا

بدی سے محفوظ رکھ کر نیکی کا راستہ دکھانے والے نصیحت آموز واقعات

پروفیسر خالد پرویز

ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ میں تھا تو ایک حجام کی دکان پر اپنے بال کٹوانے گیا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ لوگ بال کٹوا کر حجام کو اس کی اجرت دے رہے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر بال کٹوائے تو اجرت کے پیسے کہاں سے ادا کروں گا؟ اچانک حجام کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے پوچھا "جناب آپ بھی بال کٹوانے آئے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں! ارادہ تو یہی ہے۔"

حجام نے کہا "جس شخص کے بال کاٹ رہا ہوں۔ اس سے فارغ ہولوں، تو پھر آپ کے بال کاٹوں گا۔"

میں نے حجام سے کہا "لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں میرے بال خدا کے نام پر کاٹنے ہوں گے۔"

حجام نے جیسے ہی خدا کا نام سنا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی وقت حجامت کرنا روک دی اور بیٹھے گاہک سے کہا "باقی بالوں کی کٹائی بعد میں کروں گا۔ پہلے اس شخص کے بال کاٹوں گا جس نے خدا کا نام لیا ہے۔ جب خدا کا نام آ گیا تو یہ کام پہلے ہوگا اور دوسرے کام بعد میں۔"

چناں چہ اس نے مجھے بٹھا لیا اور جس شخص کی حجامت کر رہا تھا، اسے کہا کہ وہ ابھی انتظار کرے۔ اس نے انتہائی محنت و شفقت سے میرے بال تراشے۔ اس کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا جس میں تھوڑی سی ریزگاری لپٹی تھی۔ حجام نے کہا "میاں! یہ تھوڑے سے پیسے ہیں، انھیں اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کر لینا۔"

میں حجامت بنوا اور حجام سے پیسے لے کر گھر آ گیا۔ دل ہی دل میں طے کیا کہ جب بھی رب رحمن و رحیم نے مجھے پیسوں سے نوازا، سب سے پہلے اسی حجام کے ساتھ مروت کروں گا۔ کیونکہ اس جیسا نیک دل اور با اخلاق شخص پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رب ذوالجلال کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی دن گزرے تھے، کچھ عقیدت مندوں نے مجھے بصرہ سے اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی۔ میں لمحہ ضائع کیے بغیر وہ تھیلی لیے فوراً حجام کے پاس گیا اور اسے پیش کی۔ اس نے تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "جب تم نے میرے ساتھ اچھا اور پرخلوص برتاؤ کیا تھا، تو میں نے اسی وقت یہ نیت کی تھی کہ جو کچھ مجھے اوّل نصیب ہوا، وہ تمہاری خدمت میں پیش کردوں گا۔"

حجام کہنے لگا "کس قدر افسوس کی بات ہے! تم نے تو مجھے یہ کہا تھا کہ خدا کے نام پر میری حجامت بنادو۔ اور اب یہ کیا لے کر آگئے؟ اور وہ ریزگاری بھی خدا کے نام پر دی تھی۔ تم نے بھلا یہ کہیں دیکھا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے نام پر کوئی کام کرے یا کوئی چیز دے اور اس کا بدل وصول کرے؟ جاؤ! یہ تھیلی لے جاؤ اور میری نیکی کو خدا کے حضور قبولیت بخشنے کا موقع دو۔"

حضرت جنید بغدادیؒ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں "میں نے زندگی میں اگر اخلاق کا سبق سیکھا، تو اسی حجام سے سیکھا۔"

ہمسائے کا پرنالہ

ان کے پاس ذاتی گھر نہیں تھا۔ اس لیے کرائے کے مکان میں رہائش رکھتے۔ مگر کرائے کا مکان بھی کسی نہ کسی وجہ سے اکثر بدلنا پڑتا۔ خدا کی وسیع و عریض زمین میں آج یہاں تو کل وہاں۔ ایک دفعہ ایک جگہ مکان لیا تو ساتھ کا ہمسایہ یہودی تھا۔ وہ اسلام دشمن تھا اور ختم المرسلین ﷺ کے نام لیواؤں کو تنگ کرکے خوشی محسوس کرتا۔ وہ دن اس کے لیے عید کا ہوتا جب کسی سچے اطاعت گزار، اللہ کے پیروکار اور عاشق احمد مختار ﷺ کو ایذا پہنچاتا۔

جب یہودی نے دیکھا کہ ہمسائے میں نیا کرایہ دار آیا ہے، تو اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کا نیا ہمسایہ اللہ کا پیارا اور وقت کا ولی ہے، تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے سوچا، کون سا ایسا حربہ استعمال کروں کہ یہ مومن پرہیزگار مکان چھوڑ جائے۔ سوچ بچار کے بعد بالآخر اپنے مکان کی چھت پہ ایسا پرنالہ لگوایا جس کا منہ ہمسائے کے صحن میں کھلتا تھا۔

پرنالہ لگوانے کے بعد یہودی روزانہ اپنے نیک اور دین دار ہمسائے کے گھر پرنالے سے نجاست پھینکنے لگا۔ وہ مدت تک انتظار کرتا رہا کہ ہمسایہ کہے گا، تو پھر اس طرح لڑائی کروں گا اور یوں مالک مکان سے کہہ کر اسے نکلوادوں گا۔ مگر اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔

آخرکار یہودی نے تنگ آکر خود ہی اپنے نیک اور برگزیدہ ہمسائے سے پوچھا "آپ کو میرے پرنالے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

یہ سن کر ہمسایہ مسکرایا اور بولا "تکلیف تو ہوتی ہے مگر میں نے ایک نوکری اور جھاڑو کا بندوبست کرلیا ہے جو نجاست آپ کے پرنالے سے میرے گھر گرے، وہ میں روزانہ صاف کردیتا ہوں۔"

یہودی نے پوچھا "آپ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو غصہ نہیں آتا؟"

نیک دل، صاحب ایمان ہمسائے نے جواب دیا "میرا پروردگار ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو غصہ پی جاتے اور دوسروں کو معاف کردیتے ہیں۔"

یہودی نے جیسے ہی یہ جواب سنا، اس کی کایا پلٹ گئی۔ منہ سے بے اختیار نکلا "اے مالک بن دینار! جو دین ایسی اچھی تعلیم دیتا ہے، اس کو میں اسی لمحے قبول کرتا ہوں۔ رب رحمٰن و رحیم سے اپنے گناہوں کی معافی کا

www.pdfbooksfree.pk

طلبگار ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہوں۔"

ایک انوکھا تحفہ

ایک انسان کی غیر موجودگی میں اس کی بُرائی کرنا، ذات پر کیچڑ اچھالنا، بدگمانی کا اظہار کرنا غیبت کہلاتا ہے۔ غیبت ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ غیبت کرنے والا جھوٹ کی سیاہ مٹی سے ایسا گھروندا تیار کرتا ہے جو وقتی طور پر خوبصورت لگتا اور ٹھوس بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کی بنیادیں بدنیتی پر استوار ہوتی اور دیواریں بدظنی کی کھوکھلی اینٹوں سے تعمیر کی جاتی ہیں، اس لیے سچ کی بارش کا ایک قطرہ ہی انھیں زمین بوس کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ غیبت کرنے والے کو سوائے افسوس، پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اسی طرح کا ایک غیبت گو حضرت حسن بصریؒ کے دور میں تھا۔ اس کا ہر لمحہ اور لحظہ دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی میں گزرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی برائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس کرتا۔ ایک ساعت ایک مقام پر تو دوسری ساعت دوسرے مقام پر گزارتا۔ جو کوئی سنتا کہ اس نے یہ کچھ کہا ہے، تو غم زدہ ہو کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے، تو کچھ خاموش ہو کر رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصریؒ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا، تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ کچھ مریدین نے حضرت حسن بصریؒ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کے متعلق بدگوئی کرتا پھر رہا ہے۔

ولی اللہ کے ہر کام کا اپنا جدا انداز اور منفرد طریقہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے سنا، تو فوراً ایک مرید کو آواز دی۔ مرید حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمایئے جناب کیا حکم ہے؟"

حضرت حسن بصریؒ نے کہا "یہ لو پیسے، انھیں جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ۔ وہاں سے تازہ و اعلیٰ چھوہاروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔"

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھوہاروں کا ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے چھوہاروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص سے کہا "طباق اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا پھرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حسن بصریؒ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں، کہ میں آپ کا شکر گزار اور ممنون ہوں، کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمایئے۔"

مرید خاص نے حضرت حسن بصریؒ کے حکم کی تعمیل میں آپ کا پیغام اور چھوہاروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت بصریؒ کے قول و فعل سے از حد متاثر اور اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

"اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو اس

www.pdfbooksfree.pk

کو تو تم نہ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

کڑوے خربوزے کی مٹھاس

آقا اور غلام کا رشتہ حاکم و محکوم کا ہوتا ہے۔ آقا کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر غلام ہمہ وقت برائے خدمت تیار رہتا ہے۔ مگر بعض غلام ایسے بھی ہیں جو اپنی ظاہری خوبیوں، باطنی خاصیتوں اور عملی خوبصورتیوں کی بدولت آقا کے دل میں ایسا مقام پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔

ایسا ہی غلام ایک بادشاہ کے دربار میں شاہی خدمت پر مامور تھا۔ بادشاہ اپنے غلام کی عقل و دانائی سے از حد متاثر تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے جب بادشاہ اپنے غلام کی تعریف بھرے دربار میں بڑے فخر سے کیا کرتا۔

ایک دفعہ ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ کافی منزلیں طے کر کے بادشاہ سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک خربوزہ پیش کیا۔ بادشاہ نے سوغات قبول کر اور اپنے خاص غلام کو آواز دی تاکہ خربوزہ اسے کھلا سکے۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ کوئی چیز اپنے خاص غلام کو کھلائے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ مگر وہ خاص غلام دربار میں موجود نہیں تھا چنانچہ ایک نوکر دوڑایا گیا کہ وہ شاہی غلام کو بلا لائے۔

بادشاہ کا پیغام ملتے ہی شاہی غلام حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمائیے آقا! میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

بادشاہ نے کہا "ادھر میرے قریب آؤ۔"

مقرب غلام آقا کے قریب گیا۔ بادشاہ نے تحفہ میں آیا خربوزہ اٹھایا اور ایک قاش کاٹ کر غلام کو کھانے کے لیے دی۔

غلام نے انتہائی رغبت اور چاہت کے ساتھ وہ قاش کھائی اور الحمدللہ کہا۔ غلام کی پسندیدگی دیکھ کر بادشاہ نے ایک اور قاش کاٹی اور غلام کو دی۔ اس نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوشی اور مسرت کے ساتھ کھایا اور رب کا شکر جبکہ بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح بادشاہ نے منظور نظر غلام کو خربوزے کی ایک ایک قاش کاٹ کر دی جسے وہ مزے لے لے کر کھاتا گیا۔

آخر کار خربوزے کی آخری قاش بچ گئی۔ بادشاہ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جس خربوزے کو غلام اتنی خوشی سے اور رشادمانی کے ساتھ کھا رہا ہے، کس قدر عمدہ اور لذیذ ہوگا، آخری قاش منہ میں ڈال لی۔ لیکن چکھتے ہی اگل دیا کیونکہ وہ نہایت تلخ، کڑوی اور بدمزہ تھی۔

بادشاہ نے مقرب غلام سے کہا "مجھے از حد حیرانی ہے کہ تم اتنا کڑوا اور زہر کے مانند خربوزہ کھاتے رہے اور یہ نہ کہا کہ یہ کھانے کے قابل ہی نہیں۔"

گردش زمانہ کے ہاتھوں بنے غلام مشہور زمانہ شخصیت، لقمان نے دست بستہ عرض کی "بادشاہ سلامت! آپ مجھے انتہائی محبت و شفقت کے ساتھ کھلا رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ آپ کی خوشی کو بدمزگی میں بدل دوں۔ مزید یہ کہ میں نے آپ کے ہاتھوں ہزاروں انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ نعمتیں کھائی ہیں۔ اگر آج ایک تلخ چیز کھانے کو ملی، تو یہ مناسب نہیں سمجھا اس کے کھانے سے انکار کر دوں اور محض خربوزے کی کڑواہٹ کی وجہ سے آپ کے حکم کی بجا آوری کے بجائے حکم عدولی کروں۔"

آیئے اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ کیا ہم اپنے مالک حقیقی کی ہزاروں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی کبھار ہلکی سی کڑواہٹ محسوس کریں، تو شکوہ و شکایت پر تو نہیں اتر آتے؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ملک و قوم کا درد رکھنے والے

بچے نے بزرگوں کو سبق سکھایا

کبھی کبھی بے شمار الفاظ پر عمل کا ایک لمحہ بھاری ہوتا ہے

صائمہ محبوب

درد کی شدید لہر نے زور و شور سے بلا گھماتے یاسر کو بے چین کر دیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کی جانب بڑھا۔ جانے کیا ہوا تھا؟ وہ اپنی کراہوں پر بند باندھتے پیٹھ سہلانے لگا۔ مگر درد کی دوسری لہر نے گویا اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ بلا ہاتھ سے گر گیا۔ بے حد شدید درد وقفے وقفے سے اٹھ رہا تھا۔ جلد ہی اس کی شدت ناقابل برداشت ہوگئی۔

"اے یاسر! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت، کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے!" امی جان جو گیٹ بند کرنے آ رہی تھیں، اسے کرسی پر بیٹھ کر ہائے ہائے کرتا دیکھ گھبرا گئیں۔

"امی میری کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔" یاسر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹا یقیناً آپ نے آج اسکول سے کچھ الٹا سیدھا کھا لیا ہوگا۔" امی نے جھٹ نتیجہ اخذ کر کے اپنا اندازہ لگایا۔

"امی! میں نے کہیں سے کچھ نہیں کھایا۔ آج دوپہر کا کھانا آپ سب کے ساتھ کھایا تھا۔ اور درد بھی پیٹ نہیں کمر میں ہو رہا ہے۔" یاسر خفگی سے بولا۔

"یہ منحوس بلا اور گیند بھی بچوں کے لیے بُری ہے۔ اتنا بڑا بلا لے کر کھیلنے سے کمر میں جھٹکا آ گیا ہوگا۔" امی نے فوراً دوسری تشخیص کی۔

"امی! یہ بلا میں نے ابھی اٹھایا ہے۔ بلکہ اس سے کھیلنا شروع بھی نہیں کیا۔ آپ یوں کریں مجھے کوئی دوا لا دیں۔" وہ بولا۔

www.pdfbooksfree.pk

''ہاں ہاں! دوا لا دوں۔ ارے کیا پتا کہ درد کہاں ہے، کیوں ہے؟ کیسے ہوا ہے... اور دوا لا کر دے دوں۔''

وہ کچھ لمحے خاموش رہیں، پھر بولیں ''تم یوں کرو سیدھے کھڑے ہوتا کہ اندازہ ہو سکے کہیں چک تو نہیں پڑ گئی۔'' امی نے پیار سے یاسر کو کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اس کا درد سے برا حال ہو رہا تھا۔ بمشکل کھڑا ہوا۔ امی نے اسے جھکایا اور پھر سیدھا کر کے تسلی کی کہ کمر میں چک کا کوئی مسئلہ نہیں۔

یاسر کی کمر میں ہنوز شدید تکلیف تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ابو جان، دادا جان اور دادی جان بھی اکٹھے ہو گئے۔ اب چاروں طرف سے تشخیص بھی ہونے لگی اور ٹوٹکے بھی بتائے جانے لگے... تمام افراد خانہ اس نکتے پر متفق تھے کہ یاسر کے اسکول کی کینٹین میں غیر معیاری چیزیں ملتی ہیں۔ یہ اگلی بات تھی کہ گھر کے چاروں بزرگ ہر روز ایک دوسرے سے چھپ کر یاسر کو جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

''امی، چھوڑیں کینٹین کو، کوئی درد کی دوا دیں۔''

یاسر خفیف آواز میں بولا مگر چاروں بزرگ اب تک اپنی بحث میں مصروف تھے۔ دادا جان سب کو خیر ذمے دارانہ رویوں پر لیکچر دے رہے تھے اور دادی انھیں دوبدو جواب دینے میں محو تھیں۔ ابو جان یاسر کے کھانے پینے کے طور طریقوں سے نالاں تھے، تو امی سب کے بے جا لاڈ پیار پہ! آخر یاسر گھر بھر کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ جو تھا۔

دادا جان کو بالآخر یاسر کا خیال آ ہی گیا، بولے ''بیگم! اسے میری دواؤں میں سے درد کی گولی دے دو۔''

''ارے کمال کرتے ہیں آپ، بچے کو بزرگ کی دوا کیسے دی جا سکتی ہے؟'' دادی جو کالج میں پڑھاتی تھیں، فوراً بولیں۔

''اچھا وہ نہ سہی اپنی دے دو۔'' دادا جان اس وقت پوتے کی تکلیف دیکھتے ہوئے صلح کے موڈ میں تھے ورنہ اس بات پر عالمی جنگ شروع ہو چکی ہوتی۔

''ہاں ہاں، آپ تو بزرگ ہیں اور میں بچی کہ میری دوا بچہ کھا کر بھلا چنگا ہو جائے گا۔'' دادی خفا ہونے لگیں۔

دادا جان صحافی اور استاد تھے۔ دادی کی رائے تھی، ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر انھوں نے معروف تجزیہ نگار اور صحافی کے لاحقے زبردستی نام کے ساتھ لگا لیے۔ ورنہ موصوف گھر کے حالات کا جائزہ لینے سے بھی قاصر تھے، ملکی حالات کا تجزیہ کیسے کرتے؟''

''دادی جان! بہت درد ہو رہا ہے۔'' یاسر اب پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

''آپ سب اپنی باتیں چھوڑیں، یاسر کو اسپتال لے چلتے ہیں۔'' اب امی پریشان ہو گئیں۔

''بیگم! کوئی درد کی گولی تو دے دو، پھر چلتے ہیں۔ ابو جان پر بھی یاسر کے آنسو خاصا اثر کر رہے تھے۔ امی جلدی سے درد کا میرپ لے آئیں۔ ابو کمر کی مالش کرنے بام لے آئے تو دادا جان درد ختم کرنے والا پیر لے... دادی دعائیں پڑھ پڑھ کر یاسر پر پھونک رہی تھیں۔ یاسر تو سب کی جان تھا۔

اسے اندر کمرے میں مبل اوڑھا کر لٹا دیا گیا۔ گھر کے سبھی بزرگ اس کے گرد آن بیٹھے۔ یاسر کو ہلکی سی نیند آنے لگی مگر یہ غنودگی تھوڑی دیر کے لیے تھی۔

''امی!'' اس کی چیخ نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ ''امی! درد ہو رہا ہے۔'' تھوڑی ہی دیر بعد اسے متلی اور قے آنی شروع ہو گئی۔

''ڈاکٹر کو گھر بلا لیتے ہیں۔'' دادا جان نے تجویز دی۔

''نہیں اسے اسپتال لے جانا زیادہ بہتر رہے گا۔'' دادی نے رائے دی۔ ابو فوراً گاڑی کی چابی لینے اندر چل دیے۔ یاسر کو امی جان سہارا دے کر باہر لے آئیں۔ ایک سرکاری اسپتال نزدیک ہی واقع تھا۔ گو وہاں صفائی کی

www.pdfbooksfree.pk

صورت حال خراب تھی مگر ڈاکٹر قابل اور مستند تھے۔

اسپتال میں خاصا ہجوم تھا۔ بے شمار مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے تھے۔ یاسر کو ایک اسٹریچر پر ڈال کے اندر لے جایا گیا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں نے یاسر کو دیکھا۔ فوری ٹیسٹ لیے اور پھر ایک ٹیکا لگا دیا۔ یاسر کو یوں لگا جیسے درد کی لہر میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی ہے۔ اس پرسکون ساطاری ہونے لگا اور وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فضا میں دواؤں اور ڈیٹول کی ملی جلی بو رچی بسی تھی۔ سامنے بینچ پر چاروں بزرگ تیماردار بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اسپتال کی گندگی و غلاظت تھی اور مریضوں کی حالت، ہجوم اور بدحواسی!

دادا جان، معروف تجزیہ کار سب کو اپنا مشاہدہ بتا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کرتے جاتے کہ وہ اپنی ڈائری ساتھ لانا بھول گئے۔

ابا جان کے خیال میں اب مزید اس ملک میں رہنا اپنی نئی نسل سے دشمنی کرنا تھا۔ بچوں کی بہترین تربیت اور اچھے مستقبل کے لیے پاکستان جلد از جلد چھوڑنا ضروری ہو چکا۔ یاسر آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کمرے کے ساتھ ملحق غسل خانے سے آتی بہتے پانی کی آواز اسے بے آرام کر رہی تھی۔

وہ چاروں خراب نلکوں اور پائپوں پر بھی تنقید کر رہے تھے۔ دادا جان مسلسل اپنے حکمرانوں کی بے حسی پر ماتم کناں تھے۔ دادی جان کے دکھی دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ کاش لوگوں کو صفائی کا احساس ہو جائے۔ ابو صفائی کی اس صورت حال کا ذمے دار ڈاکٹروں کو ٹھہرا رہی تھیں۔ امی کو شکوہ اسپتال کے جمعدار سے تھا۔

یاسر کے لیے جب پانی گرنے کی آواز ناقابل برداشت ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے بیٹا! کیسے ہو؟ درد تو نہیں ہو رہا۔'' انھوں نے یاسر کو کھڑا پایا، تو حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''امی!''

''جی بیٹا کیا بات ہے؟'' وہ فوراً یاسر کے پاس آ گئیں۔

''امی! پانی ضائع ہو رہا ہے۔ میں نلکا بند کر دوں۔'' یہ کہہ کر یاسر آہستہ آہستہ ملحق غسل خانے کی طرف چل دیا۔ چاروں بڑے پھر اپنی علمی اور تجزیاتی گفتگو میں محو ہو گئے۔

نل بالکل ٹھیک تھا..... فوراً بند ہو گیا۔ درحقیقت قصور نہ تو بے حس حکمرانوں کا تھا، نہ بے خبر ڈاکٹر کا، نہ غیر ذمے دار جمعدار کا۔ قصوروار ان سب کا تھا جنھوں نے کچھ سنوارنے کی کوششیں ہی نہیں کیں...

طوفاں ہے اگر گھر کے در پے یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پہ کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

یاسر غسل خانے سے باہر آیا، تو بولا ''قیمتی پانی ضائع ہونے کا خیال مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اسی لیے نلکا بند کرنے چلا گیا۔''

یہ سن کر چاروں بزرگ خاموش ہو گئے۔ دادا جان نے شرمندہ ہو کر دادی جان کی طرف دیکھا جو فخر سے اپنے پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔ ''دیکھا میں نہ کہتی تھی صرف ٹی وی چینل پر بیٹھ کر تجزیہ اور تنقید کرنے کے بجائے کچھ عملی کام بھی کیا کریں۔'' وہ بولیں۔

''دادو! اب اس قوم کے بچے یہ عملی کام کیا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' یاسر دادا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے خوشی سے بولا۔ آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بے شمار الفاظ پہ عمل کا ایک لمحہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے مشوروں سے بچاؤ!

...ایک مریض کی دہائی

عبدالغفار نوابشاہی

یہ ۲۰۱۴ء کا آخری دن تھا۔ صبح سویرے نماز کی تیاری کے لیے مسواک کی نوک جب زبان سے ٹکرائی، تو معمولی جلن محسوس ہوئی۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد شیشے میں دیکھا تو زبان پر ایک چھالا نظر آیا۔ معمول کے مطابق آٹھ بجے سے پہلے آفس حاضر ہوا۔ نصف دن تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا۔ ہر لمحے سرخ چھالے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا پڑا۔ انھوں نے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

بیٹے، یہ نوک کا صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا رات سے جو کچھ بھی پیٹ میں ڈالا تھا، ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس کی صورت گری کر ڈالی اور خاموش ہو کر صحت بھرے نسخے کا انتظار کرنے لگا۔ سرخ چھالا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے انداز سے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ معمولی بات ہے، نسخہ لکھا۔ مگر رات کو ایک مرتبہ پھر چیک اپ کرانے کا حکم بھی صادر فرمایا۔

میں جامعہ کے احاطے میں واقع ہاسٹل میں اپنے کمرے واپس آیا۔ کچھ دیر بعد درد محسوس ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ دوست احباب خیریت معلوم کرتے، تو انھیں اپنی زبان کی تکلیف سے آگاہ کرتا اور دعاؤں کی درخواست کر کے خاموش ہو جاتا۔ مگر قربان جاؤں کہ میرا ہر دوست مخلص نکلا اور دعا کے ساتھ ایک نسخہ بھی بتاتا۔ ساتھ ساتھ دوا لینے کا مشورہ بھی دیتا۔

یہ دیکھ کر مجھے دو سال پہلے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے فون پر اپنی ناساز طبیعت سے آگاہ کیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ بولے ''حکیم صاحب کے پاس جانا ہے، آپ بھی چلنا۔ مجھے ناگوار گزرا کہ کمال ہے، نیم حکیم تو میں بھی ہوں۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں...... پھر یہ شعر پڑھ کر خود تسلی دی۔

وہ ہے بے وفا تو وفا کرو، جو اثر نہ ہو تو دعا کرو
جسے چاہو برا کہو، یہ دوستی کے خلاف ہے

میں دوست کے ساتھ پسندیدہ حکیم کے پاس پہنچا۔ انتظار گاہ میں بیٹھتے ہی دوست ساتھ بیٹھے مریض سے

www.pdfbooksfree.pk

سرگوشی کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ میں مریض نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی کو مرض میں مبتلا دیکھو، تو اپنے تندرست ہونے پر شکر کرو۔

کچھ دیر بعد میرے دوست حکیم صاحب سے مل کر باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ دوست نے بتایا کہ حکیم کے پاس جانے سے پہلے جو صاحب سرگوشی کر رہے تھے، انھوں نے مجھے مرض سے نجات کے لیے کچھ غذائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے کہا "اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ لالچ کے دور میں آپ کو مفت مشورہ مل گیا۔"

کہنے لگے "مگر بات یہ ہے کہ اصلی اور خارجی حکیم صاحبان کی باتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ خارجی حکیم نے جو مشورہ دیا، وہ اصلی حکیم کے بالکل خلاف ہے۔ اب کیا کروں۔۔۔؟"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان، کا استحضار کرو اور اصلی حکیم کی ہدایت مان لو۔"

یہ ہمارا بڑا المیہ ہے کہ آج قوم کا ہر فرد دینی مسئلہ ہو یا طبی حل بتاتے اور دوا تجویز کرتے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ایسے ہی میرے پاس بھی شام تک ڈھیر سارے نسخے جمع ہوگئے، مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

خیر رات گزری۔ ۲۰۱۵ء کی پہلی صبح جماعت میں گیا، تو بے اختیار چلنے والی زبان نے بآسانی کچھ کہنے سے معذرت کرلی۔ اپنی ہر بات سفید تختے کی مدد سے طلب کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ جماعتیں لینے کے بعد اپنی رہائش گاہ آیا، تو یکایک میرا خیال سرکارِ دو عالم کے فرمان کی طرف گیا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں "جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔" حضرت سلیمان علیہ السلام کا فرمان ہے "اگر بات چیت کرنا چاندی ہے، تو خاموش رہنا سونا۔" اگر خاموشی میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غور و فکر کرلیا جائے، تو کیا کہنے۔

ذرا غور کیجیے کہ آج ہمارا معاشرہ زبان کے غلط اور بے جا استعمال کی وجہ سے کس قدر بے چینی کا شکار ہے۔ زبان سے نکلنے والی کئی باتیں نہ صرف گناہ ہیں بلکہ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ، غیبت، بہتان، طعنہ زنی، چغل خوری اور احسان جتانا۔ یہ وہ چند بدترین گناہ معاشرے کے لیے کسی مہلک بیماری سے کم نہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارا سارا اخوت و بھائی چارے والا معاشرہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

ان گناہوں کا پہلا نشانہ اپنے ہی لوگ بنتے ہیں۔ مثلاً خدانخواستہ کوئی جھوٹ بولنے کا عادی ہے، تو وہ اسکول میں ہے، تو استاد سے جھوٹ بولے گا۔ گھر میں ہے تو والدین سے۔ تاجر ہے تو اپنے گاہک سے جھوٹ بولے گا۔ اسی طرح غیبت بھی اپنے ہی لوگوں کی جاتی ہے۔ یہ سب گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک شعر ہے ؎

جراحات السنان لها التيام
ولا يلتام ما جرح اللسان

(تیر و تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے)۔

(مضمون نگار جامعہ دارالعلوم کراچی میں استاد کے منصب بلند پر فائز ہیں)

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ہم وطنوں کے لیے منفرد تحفہ

موبائل بیٹری تادیر چلائیے

بیٹریوں کی بجلی بچانے والے مفت ٹوٹکوں کا بیان

ابو صارم

یہ ۱۹۹۹ء کی بات ہے، جب جاپانی کمپنی، این ٹی ٹی ڈوکومو (NTT Docomo) نے دنیا کا پہلا باقاعدہ سمارٹ فون متعارف کرایا۔ اسمارٹ فون سے مراد ایسا موبائل فون ہے جس میں آپریٹنگ سسٹم موجود ہو مثلاً ونڈوز ۸ یا اینڈرائڈ۔ گویا یہ چھوٹے سے ایسے کمپیوٹر ہیں جو روزمرہ کے بے شمار کام انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اسمارٹ فون عام موبائل سے کچھ مہنگے ہیں لیکن ان کی قیمت بتدریج گھٹ رہی ہے۔ اسی باعث پاکستان میں بھی لوگ کثیر تعداد میں اسمارٹ فون خریدنے لگے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اب ایک کروڑ سے زائد پاکستانی اسمارٹ فون استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۴ کروڑ سے زائد پاکستانی موبائل فون رکھتے ہیں۔

موبائل کے برعکس اسمارٹ فون پروسیسر استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بجلی بھی زیادہ کھاتے ہیں۔ اس باعث اسمارٹ فون کی بیٹری چارجنگ کے بعد جلد خرچ ہو جاتی ہے۔ تاہم بعض احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں، تو بیٹری کا دورانیہ بڑھ سکتا ہے۔ اہم تدابیر کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ اگر آپ نے اسمارٹ فون استعمال نہیں کرنا، تو اسے بند (Off) کر دیجیے۔ یوں بجلی کی اچھی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔

۲۔ جس علاقے میں نیٹ ورک کمپنی کے سگنل نہیں آ رہے یا وہ کمزور ہیں، تو فون بند کر دیجیے۔ وجہ یہ کہ سگنلوں کی تلاش میں فون اپنی بیٹری کی ساری بجلی ضائع کر دیتا ہے۔ لہٰذا فون اسی جگہ چلائیے جہاں طاقتور سگنل آ رہے ہوں۔

۳۔ اسمارٹ موبائل فونوں میں لیتھیم (Lithium) کی بیٹریاں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسی بیٹری کی اگر ساری چارجنگ استعمال کر لی جائے اور پھر اسے چارج کیا جائے، تو وہ جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اپنے فون کی بیٹری کی چارجنگ ختم نہ ہونے دیجیے۔

www.pdfbooksfree.pk

بہتر ہے کہ جب بیٹری کی چارجنگ ۱۰ تا ۲۰ فیصد رہ جائے، تب اسے چارج کر لیں۔ زیادہ جلد اور بار بار چارج کرنے سے بیٹری زیادہ عرصہ نہیں چلتی۔

۴۔ فون میں لرزنے (Vibration) کا بٹن بند ہی رکھیے۔ وائبریشن آن کرنے سے فون بجلی زیادہ کھاتا ہے۔ مزید برآں گھنٹی کی آواز بھی اتنی رکھیں جتنی بآسانی سن سکیں۔

۵۔ کال کا دورانیہ مختصر رکھیے اور ضروری باتیں کیجیے۔ بعض مرد و زن بیٹری ختم ہونے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں بیٹری جلد خراب ہو جاتی ہے۔

۶۔ فون کی ایسی خصوصیات بند کر دیجیے جو بوقت ضرورت ہی استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں بلیوٹوتھ، وائی فائی، جی پی ایس وغیرہ شامل ہیں۔ اگر ان ایپلی کیشنوں کو چالو رکھا جائے، تو وہ مسلسل اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ یوں وہ متواتر بجلی استعمال کرتیں اور بیٹری جلد ختم کر دیتی ہیں۔

۷۔ فون کی روشنی (Brightness) کم رکھیے۔ اسکرین زیادہ روشن رہے، تو وہ بھی وافر بجلی کھاتی ہے۔

۸۔ کوشش کیجیے کہ تھری جی استعمال نہ کریں۔ اسے استعمال کرنے سے فون "دگنی" بجلی کھاتا ہے۔ یا پھر ضرورت کے وقت ہی تھری جی کام میں لائیے۔

۹۔ اسمارٹ فون کے بیک گراؤنڈ یا پس منظر میں حرکت پذیر یا اینی میٹڈ تصاویر یا ویڈیو استعمال نہ کیجیے۔ حرکت کرتی تصاویر بیٹری جلد خالی کر ڈالتی ہیں۔

۱۰۔ بہتر یہ ہے کہ بیک گراؤنڈ خالی یا سیاہ رکھیے۔ یوں بیٹری زیادہ دیر زیر استعمال رہتی ہے۔

۱۱۔ یہ یاد رکھیے کہ نئی بیٹری مکمل طور پر چارج کر کے استعمال کیجیے۔ نقل کی بیٹری ۱۴ گھنٹے میں چارج ہوتی ہے۔ جبکہ اصلی بیٹری پانچ چھے گھنٹے لگاتی ہے۔ اس سے پہلے فون کہے کہ بیٹری فل ہو چکی، تو اس کی بات پر دھیان نہ دیں۔

۱۲۔ فون کو کبھی دھوپ میں یا گرم جگہ نہیں رکھیے۔ تپش میں بیٹری کی توانائی خارج ہونے لگتی۔ اسی لیے اسے معمول کے درجہ حرارت میں رکھیے۔ اگرچہ چارجنگ کے وقت بیٹری گرم ہو جائے، تو اس کا مطلب ہے کہ چارجر خراب ہو چکا۔ اسے جلد تبدیل کر لیجیے۔

۱۳۔ بیٹری اور فون کے دھاتی مقامات اتصال (Contacts) پر رفتہ رفتہ گرد و میل جم جاتی ہے۔ اس وجہ سے بیٹری اور فون کے درمیان بجلی کی منتقلی صحیح طرح نہیں ہوتی۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً روئی سے نرمی کے ساتھ یہ مقامات اتصال صاف کرتے رہیے۔

۱۴۔ بیٹری طویل عرصہ بعد چارج ہو یا جلد گرم ہو جائے، یا پھول جائے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جواب دے چکی۔ لہٰذا اسے بدل دیجیے۔

۱۵۔ تقریباً سبھی اسمارٹ فونوں میں لوکیشن سروسز (Location Services) موجود ہوتی ہے۔ اس کو بھی بہ وقت ضرورت ہی استعمال کیجیے۔ ورنہ یہ مسلسل آن رہنے کی صورت میں بیٹری کھائے گا۔

۱۶۔ جدید اسمارٹ فون مختلف ایپلی کیشنوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کئی ایپلی کیشنیں یا سافٹ ویئر پس منظر میں بھی کام جاری رکھتے ہیں۔ یوں وہ بیٹری ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا جن ایپلی کیشنوں کی ضرورت نہیں، انھیں چالو حالت میں نہ رکھیے۔ آپ بیٹری کی حیرت انگیز بچت پائیں گے۔

۱۸۔ اسمارٹ فون کی کمپنیاں نت نئے سافٹ ویئرز ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا انٹرنیٹ پر ان سے رابطہ رکھیے۔ نئے سافٹ ویئر ایسی خرابیاں دور کرتے ہیں جو بیٹری سمیت اسمارٹ فون میں پائی جاتی ہیں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ایک دکھی دل کی پکار

شاہ رخ خان! اس سے مل لو

گور کنارے بیٹھی ایک
بدقسمت عورت کا الم ناک ماجرا

نیلم احمد بشیر

ان دنوں میں اپنی بیٹی عنبر کے پاس امریکی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوں۔ یہ وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کاروں کی نمبر پلیٹوں پر لکھا ہوتا تھا ”ورجینیا از فار لورز“ (ورجینیا عاشقین کے لیے ہے) اب نمبر پلیٹوں پہ یہ لکھا دیکھنے کو نہیں ملتا۔ شاید اس لیے کہ امریکا کے حالات اتنے بدل چکے۔ ایسے رومانوی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پر کرنا مناسب نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو دہشت گردی، جنگوں، ڈیزی کٹر بموں اور مسلم جنگ جوؤں جیسے عوامل سے نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔

ورجینیا امریکی دارالحکومت، واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ریاست ہے۔ لہٰذا پُرتمکنت، پُروقار، صاف ستھرے شہر کا سنجیدہ کچھ اس پہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔ پُرشکوہ عمارات، کشادہ سرسبز و شاداب باغات، ٹریفک کے منظم بہاؤ والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے حاکمِ دنیا دیگر ملکوں کے لیے بدصورت فیصلے صادر کرتے ہیں۔

میری بیٹی عنبر دارالحکومت کے قریب ہی واقع شہر جنکشن سٹی کی ایک یونیورسٹی میں ملازمت کرتی ہے۔ اسے اکثر اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی ہیں۔ پچھلے دنوں اس کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا، تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست کھانا کھلایا۔ وہ ہمیشہ مجھ پر دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے۔ شام کو ہم ماں بیٹی چہل قدمی کرنے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی شان والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ و جلال دیکھ کر ہمیشہ سوچتی ہوں، ”کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی دیدہ زیب ہوتے۔“ کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ

www.pdfbooksfree.pk

دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

پچھلے چھ دنوں سے شہر میں بھارتی فلمی اداکاروں کی ایک تفریحی تقریب کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پہ اشتہار چل رہے تھے۔ انٹرنیٹ پر نکٹ بک ہوئے ہر طرف "پروموشن پوسٹرز" لگ گئے۔ مجھے یہ شو کافی پُرکشش دکھائی دیا۔ جی میں آیا، ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں؟ عنبر نے مجھ سے کہا اور سوسو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بہت خوش تھی۔ میں نے بہت سال پہلے امریکا میں اسی قسم کا ایوارڈ بھرا شو دیکھا تھا۔ تب وہ جوان تھا اور ہم بھی، لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم تفریح دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

میں نے بھی یہ سوچ کر خوشی خوشی ہامی بھر لی "اچھا ہے، چلے چلتے ہیں، مزا آئے گا۔" ہم واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے، بھارتی فلمیں ہم سب کی زندگی کا اہم حصہ بن چکیں۔ ہر گھر میں ذوق شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ بھارت، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ، امریکا، جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں، یہ فلمیں تفریح کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اردو زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں بھارتی فلموں کا ہاتھ ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

آج بھارتی فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں خوب چلتی ہیں۔ بالی وڈ کا ہم پلہ بالی وڈ سینما بھی دنیا بھر میں اپنے مداح پیدا کر چکا۔ اسی لیے بھارتی اداکاروں کے شو بہت کامیاب رہتے ہیں۔ اس شو کے اہم فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زنٹا، رانی مکھرجی، پریانکا چوپڑہ شامل تھے۔ مگر سب سے زیادہ جس کی خاطر لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے، وہ تھا "سپر اسٹار" اداکار شاہ رخ خان!

سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ چڑھا شاہ رخ آج بھی اپنے مداحوں کے لیے نمبر ون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اداکاری، شخصیت اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے گھر سے نکل پڑے۔ عنبر کا خیال تھا کہ پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے ہم مقامی ریل سے سفر کریں، تو بہتر ہے۔ یہی سوچ کر ہم اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ نیویارک کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور اسٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ اسٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ سے بنے ڈیزائن سراہتے ہم کچھ ہی دیر میں ریل میں سوار ہوئے۔ اس نے ہمیں ایم سی آئی سنٹر کے بالکل قریب اتار دیا۔

چند منٹ چلنے کے بعد ہم لوگ اس بڑے سنٹر تک پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کے کنسرٹس ہوتے ہیں۔ سڑک پہ ہم جیسے لوگوں کا ہجوم جنھیں امریکا میں "دیسی" کہا جاتا ہے، شو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے

> کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

www.pdfbooksfree.pk

کپڑے پہنے بوڑھے، بچے، فیشن ایبل لڑکے اور لڑکیاں! سبھی کے چہرے ملنے والی تفریح کے خیال سے دمک رہے تھے۔ کوئی کسی کو ہیلو ہائے کہہ کر گلے ملتا، تو کوئی موبائل فون پہ آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا۔ امریکا میں کہیں بھی آنا جانا ہو، ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگ شلوار قمیص، ساڑھیاں، پتلونیں، کڑھائی والے کرتے اور پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آرہے تھے۔ گویا خاموش امریکی سنڈے جاندار دیسی اتوار میں تبدیل ہوگیا۔

ہم عمارت کے اندر جانے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ یک دم ہماری نظر دو پاکستانی خواتین پر پڑی۔ وہ ہماری طرف آرہی تھیں۔ ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا جو لڑکھڑا اور رک رک کر چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں، فرح لپک کر ان کی طرف بڑھی۔ سلام کرنے کے بعد کہنے لگی "باجی! یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں۔" مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور والی؟ اور یہاں؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آ گئی؟ میں حیرت زدہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بھی بالٹی مور کی رہائشی تھی۔ فرح دکھ سے بتایا کرتی کہ وہ سرطان کے آخری مرحلے پر پہنچ چکی۔ ڈاکٹروں نے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضا کاٹ ڈالے، مگر سرطان اسے چھوڑنے کو تیار نہیں، سارے جسم میں پھیل چکا۔ اس کا علاج اعلیٰ ترین اسپتالوں میں ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر بے بس ہو چکے۔ انھوں نے اسے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا۔

ایک مرحلے پہ انھوں نے اس کا کیس بہ غرض تحقیق کسی بڑے اسپتال کو بھیجنا چاہا، مگر سہانہ اور اس کا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ دو چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہو رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ ناامید نہ تھی۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا "شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں، شاید انھیں چار بچوں کی ماں پہ رحم آجائے۔"

وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی، ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں کیا کرتی۔ فرح نے بتایا تھا، سہانہ زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ تھی۔ اسے اچانک اپنے خوفناک مرض کے بارے میں پتا چلا۔ اب زندگی کے دیے کی لو مدھم ہو چکی تھی۔ عمر کی نقدی ختم ہو رہی تھی مگر حسرتیں تھیں کہ ان کا انبار لگا تھا۔ وہ مشکل سے سانس لیتی۔ پھر بھی گھر میں بچوں کے لیے کھانا بناتی، لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی "جتنے دن اپنے بچوں کے کام آجاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔"

بگڑتی حالت کے باعث وہ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے پاکستان جانا چاہتی تھی لیکن گرین کارڈ کے مسئلے نے راستہ روک لیا۔ اور وہ واپس امریکا آنا چاہتی تھی تاکہ زندگی کی باقی ماندہ پونجی اپنے بچوں اور شوہر پہ نچھاور کر دے۔

دوسری طرف اس کے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے، وہ ہر قیمت پہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ مگر سر پیٹ رہے تھے کہ امریکن قونصلیٹ سے انھیں ویزا جاری نہیں ہو سکا۔ اب امریکیوں کو مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ مسلمانوں کے قدم امریکا کی سرزمین سے دور ہی رہیں، تو بہتر ہے۔

امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو

www.pdfbooksfree.pk

اپنے خوبصورت، پُرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

سب دوست احباب سبانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے، اس کی خیریت پوچھتے۔ وہ اس دن سے ڈرتے جب سبانہ کی جگہ اس کا میاں فون اٹھائے اور کہہ دے کہ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔

موت وحشی چڑیل کی طرح موت کے بھڑکتے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سبانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشا دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اٹھنے اور دوسرا گرنے والا تھا۔

''تم یہاں کیسے! تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' فرح نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

''طبیعت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ پُرلطف وقت گزار لوں!'' اپنے گنجے سر پہ دوپٹہ ٹکانے کی کوشش کرتے سبانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے بھی کہا، اگر تمھارا جی چاہ رہا ہے، تو دیکھنے چلتے ہیں، ذرا طبیعت ہی بہل جائے گی۔'' سبانہ کی بھابی بولی۔ اس نے پیار سے سبانہ کے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم دھیرے دھیرے ہال کے اندر پہنچ گئے۔

''کیا تم دیر تک آرام سے بیٹھ لو گی؟'' فرح نے اپنی دوست سے پوچھا۔

''جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ اٹھ کر چل دوں گی۔ چلے تو جانا ہی ہے۔'' سبانہ کے چہرے پہ پھیکی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میرے کلیجے میں ٹیس سی اٹھی۔

ہماری نشستیں قریب ہی تھیں، اس لیے ہم ایک دوسرے کو بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ شو اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھا۔ میں بھی خوش تھی کہ عمر رسیدہ ہو جانے پر بھی موقع کی مناسبت سے بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے ہی میں عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں اور میں اکیلی کھڑی رہ جاؤں۔

شو شروع ہوا۔ پردہ اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ پہلے اسکرین پہ شو کے لیے تیاری کی ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ ''وارم اپ'' ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ انسانی جذبات کے حوالے شو کا موضوع تھا۔ لہٰذا جتنے فنکار اسٹیج پر آتے گئے، ان کے آنے سے پہلے ایک جذبہ کا نام اسکرین پر ابھرتا اور پھر غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلا فنکار ارجن رام پال آیا جس کے لیے جذبہ رشک (Envy) تجویز ہوا۔ اُسے دیکھا تو واقعی یقین آ گیا کہ اس کے لیے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہائے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا۔ حاضرین کی پرزور ستائش نے اس بات کی کھل کر گواہی دی۔ ارجن نے چند مقبول فلمی گانوں پر رقص پیش کیا اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پر لکھے ہوئے اگلے جذبے کا نام جوش (Passion) تھا۔ جیسے ہی یہ ایکٹ شروع ہوا، سارا منظر گلابی ہو گیا اور مدھر دھنیں فضا میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنٹا آ رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس بھولی صورت والی اداکارہ کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور

www.pdfbooksfree.pk

گانوں پر ناچ پیش کر لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔

میں نے کن انکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا جو عنقریب جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہ میں تبدیل تو ہونے والی تھی مگر کائنات کے نظام میں اہمیت رکھتی تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان دروازہ نیم وا کیے بیٹھی مشتاق انکھیوں سے جاری تماشے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغِ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لیے نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔

پھر پستہ قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مکھر جی اسٹیج پر آئی۔ کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمکار دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا۔ لوگ اس کے رقص پہ جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ سب فنکاروں کی رخصتی کے بعد ہال پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ سہانہ کی بھابی نے نند کی طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا "چھیں، تم تھک گئی ہو گی؟"

"نہیں، جتنی دیر بیٹھ سکی بیٹھوں گی۔" سہانہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور اسٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار جھوم لینے کے خیال سے خوش تھا۔ اندھیرے ہال میں جیسے ہی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھتا نظر آیا، پردے پہ جیسے ہی لفظ محبت (Love) لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انھیں پتا چل گیا کہ اب "ون اینڈ اونلی" شاہ رخ خان آ رہا ہے۔ وہ دیر سے اسی کے منتظر تھے۔

سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو اسٹیج پر اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ اسکرین پر خوبصورت دکھنے والا مقناطیسی کشش کا حامل یہ "اسٹار" درمیانی شکل صورت اور قد بت کا مالک تھا۔ مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری اور ہر دلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔

وہ اپنے فلم بین مداحوں کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سب کچھ خوبصورت اور حسین ہوتا ہے۔ الجھنیں کلفتیں اور حقیقتوں کی تلخیاں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا، تو اسی لمحے چھت سے چمکتے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے منظر مزید رومانوی ہو گیا۔ لڑکے لڑکیاں جوش کے مارے چیخیں مارنے لگے، تو شاہ رخ نے مائیک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں کرنے لگا۔

امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے خوبصورت، پُرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

باتوں باتوں میں جب کسی بات پہ بے ساختہ انداز میں ماشاءاللہ کہا، تو بہت اچھا لگا۔ وہ حاضرین سے باری باری پوچھتا چلا گیا "ممبئی سے کوئی ہے، یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا، کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں؟" سب پاکستانیوں نے زور شور سے تالیاں پیٹیں جن میں، میں بھی شامل تھی۔ اس وقت شاہ رخ مجھے اپنا اپنا سا لگا۔ سنا ہے، وہ پاکستانیوں سے پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ پاکستانی بھی تو بڑے ذوق شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو اسٹیج پر بلایا۔ انھوں نے وفورِ جذبات میں شاہ رخ کو گود میں اٹھالیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں سے کھیلنے لگے۔ سارا ہال ہنس ہنس کر داد دینے لگا۔ لگتا تھا، اس لمحے ساری دنیا نفرت اور دکھ نام کے کسی جذبے سے آشنا نہیں۔ سبانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اسے تب کہاں یاد تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ تماشا ختم ہو جائے گا۔ روشنیاں گل ہوں گی اور سب اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ پس منظر، پیش منظر میں تبدیل ہوگا اور نظام کائنات چلتا رہے گا۔

کیا شاہ رخ خان کو دیکھنا سبانہ کی آخری خواہش تھی؟ یہ سوچ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ شاہ رخ خان نے پھر مختلف لوگوں کو اسٹیج پر بلایا، ان سے باتیں کیں اور ڈانس کیا۔ تب میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجواؤں جس پہ لکھا ہو "تمھارے ایک پرستار بستر مرگ سے اٹھ کر آج تمھیں دیکھنے اور تمھارے فن کی پذیرائی کرنے یہاں آئی ہے۔ یہاں آکر اس سے ذرا مل لو۔ اس کے ساتھ بات کرلو۔ اسے کوئی جھوٹی تسلی ہی دے دو۔ شاید یوں اس کی زندگی کے گنے چنے لمحوں میں ایک یادگار لمحے کا اضافہ ہو جائے۔"

وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو، تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہے۔ مگر میں اپنی پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ اسٹیج پر کھڑے زندگی سے بھرپور ہمہ گیر شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پیغام پہنچانا شاید ناممکن تھا۔ لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سیکیورٹی کے لیے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی بیریئر اور ہال کا نظم و نسق سنبھالنے والے سیکیورٹی کارڈ ان سب کے ہوتے ایک ننھی پرچی پہ لکھا پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچتا؟

کچھ ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو پہیوں والے بلند اسٹینڈ پر کھڑا کر حاضرین کے بالکل قریب سے گزرنے کا موقع دیا۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سبانہ بھی گزرتے ہاتھوں سے تالی بجاتی مسکرا رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ہلاتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ بجھتے ہوئے چراغوں میں کتنی چمکدار جوت جگا گیا ہے۔ اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اپنے چاہنے والوں کو خوش کرنا، ان کا دل لبھانا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اور اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر رقص کیا اور ڈائیلاگ بولے۔

پاکستان ساختہ روبوٹ

پشاور انسٹی ٹیوٹ آف فزکس اینڈ الیکٹرونکس کے طالب علم سلیمان نے اپنی نوعیت کا پہلا بم ڈسپوزل روبوٹ تیار کر لیا ہے، جو پندرہ میٹر کے فاصلے سے ۲۷ کلوگرام سے بارودی مواد کی پہچان سمیت اسے ناکارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ روبوٹ اپنے ایم ایس سی کے فائنل پروجیکٹ کے لیے تیار کیا ہے۔ روبوٹ بنانے کا آئیڈیا ہولی وڈ کی فلم "دی ہرٹ بریکر" دیکھ کر آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پروٹوٹائپ روبوٹ ہے جو ٹینک کی طرح چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ روبوٹ آفت زدہ علاقوں اور دشوار گزار سرنگوں میں بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روبوٹ ایک لاکھ روپے سے کم لاگت میں تیار ہوا ہے اور حکومتی اداروں اور انڈسٹری کا تعاون حاصل ہو، تو وہ اپنی ایجاد کو مزید بہتر بنا کر دنیا بھر میں متعارف کرائیں گے جس سے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن ہوگا۔

(عشال فاطمہ، گگومنڈی ضلع بہاولپور)

www.pdfbooksfree.pk

اس کے مزیدار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں خوشی کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا، گلا پھاڑ کر چیخوں اور کہوں "شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو وہ جا رہی ہے، تمھیں وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی کل پتا نہیں وہ ہو نہ ہو۔" مگر ہیجانی شور میں میری آواز کیسے سنائی دیتی، اس لیے خاموش رہی۔ اسٹیج پہ تھرکتی زندگی حاضرین کی رگوں میں بہتے خون کی قوت بڑھا رہی تھی۔ مگر موت بھی ایک نشست پہ بیٹھی کسی کے ختم ہونے والے سانسوں کی ریزگاری گن رہی تھی "ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جا کے بتائے؟" میرے دل نے پھر چیخ ماری۔

تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہوا۔ سب ہال سے باہر نکلنے لگے۔ سبانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ کہیں ہجوم میں ٹھوکر نہ لگ جائے۔

"برا حال ہے، چلا بھی نہیں جا رہا۔ لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا، بہت مزا آیا۔" سبانہ بولی۔ اس کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"کئی بار پوچھا، چلتا ہے؟ مگر توبہ کریں جی، یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی۔" یہ کہتے ہوئے سبانہ کی بھابی نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر یوں نیچے جھک گئیں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پر صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟

سبانہ شاہ رخ سے نہیں مل سکی اور زندگی سبانہ کو؟ لیکن تعلق رکھنے کے لیے کسی کا دوسرے سے ملنا ضروری ہے؟ ایک ہی کہکشاں کے سیارے اپنے اپنے مدار میں تیرتے اور ایک دوسرے سے فاصلے رکھتے ہیں، مگر ان کا تعلق تو پھر بھی رہتا ہے۔ ہم سب بھی کائنات کی گھمن گھیری کے ناچتے بگولوں میں اڑتے تنکے ہیں۔ آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کے بائیسکوپ میں جڑے شیشوں میں قید۔ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے جہاں پردہ گرتا پھر اٹھتا ہے۔ کردار آتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ شو تو چلتے رہنا ہے۔

جنم اور مرن کھلے سمندر میں تیرنے والی دو کشتیوں کا نام ہے۔ ہم خوشی مناتے ہیں جب جنم کشتی اپنے سفر کا آغاز کرے۔ اس سے بے نیاز کہ راستے میں اسے کئی طوفانوں، جھکڑوں اور بھنوروں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم سوگ مناتے ہیں جب یہ کشتی کنارے لگے حالانکہ ہمیں اس وقت خوش ہونا چاہیے کہ کٹھن سفر ختم ہوا۔ مسافر نے منزل کو پا لیا اور اب اس کے نصیب میں آرام ہی آرام ہے۔

> وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو، تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہے۔ مگر میں اپنی پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔

میں سبانہ کے لیے سوگوار نہیں، وہ پنپاں ہوئی، تو کل یقیناً کسی لالہ و گل میں نمایاں ہوگی۔ باغ حیات میں چلتی بادِ صبا مہکتی سرسراتی جب کسی غنچہ نو کے رخسار پہ بوسہ دے، تو شاید وہ بھی اسی طرح پیار سے مغلوب ہو کر خوشی سے تالیاں بجائے گا جیسے اس روز سبانہ واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی ہال میں بجا رہی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں میری آنکھوں کے کونے میں ایک آنسو آئے، تو اٹک سا جاتا ہے۔ دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر کسی دن شاہ رخ خان کو لالہ کے اس پھول کے متعلق پتا چلا، تو اسے کیسا لگے گا؟..... کیا سوچے گا وہ اس بے انت کہانی کے بارے میں؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے

ایک عام پاکستانی کو بھی کامیاب ایکسپورٹر بنا دینے والے قیمتی مشورے

حبیب طارق

میں دفتر سے گھر پر رابطہ کر رہا تھا کہ علی کا فون آ گیا۔ کہنے لگا "حبیب بھائی پیشگی معذرت کہ میں آپ کے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ دراصل پچھلی نشست اتنی دلچسپ رہی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں پہلے ہی چلا آیا۔"

میں نے کہا "یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ تم اس موضوع میں دلچسپی لے رہے ہو۔ جیسا کہ فیصلہ ہوا تھا آج ہماری نشست ایکسپورٹ یا برآمدات کے موضوع پر ہے۔ میں نے تمہارے لیے کم لاگت والے چند منصوبے سوچ رکھے ہیں جن پر عمل کر کے تم باآسانی کامیاب ایکسپورٹر بن کے اپنی قسمت کا رخ بدل سکتے ہو۔ پھر تم جس لڑکی کو پسند کرتے ہو اس کے گھر والے بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔"

گھر پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے اور علی کو لیے قریبی ریستوران پہنچ گیے۔ نشستوں پر بیٹھتے ہی ہماری

www.pdfbooksfree.pk

گفتگو ہونے لگی جو کھانا آنے کے بعد بھی جاری رہی۔ علی کہنے لگا ''خطیب بھائی سب سے پہلے تو مجھے یہ بتایئے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے فزیبلٹی رپورٹ کیسے بنائی جائے؟ اس میں تو ہمارا مقابلہ بین الاقوامی کمپنیوں سے ہوتا ہے اور مقامی مارکیٹ کے برعکس ہمارے حریف مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم مختلف ممالک کی کمپنیوں کی مصنوعات کے معیار اور قیمتوں کا کیسے پتا کریں؟ میں تو پاکستان بیٹھا ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ دوسرے ممالک کی ایکسپورٹ کمپنیوں کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ ان سے مقابلے کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جاتی ہے؟ غیر ملکی کمپنیاں ہمیں آرڈر کیسے اور کیوں کریں گی؟ مجھے یہ بھی بتایئے کہ پاکستان سے کیا کیا چیزیں ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں؟''

میں نے علی کو تفصیل سے بتانا شروع کیا ''پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم کیسے اپنی زرخیز مٹی کو سونے میں تبدیل کریں۔ پاکستان سے کئی اشیا برآمد کرنا ممکن ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ مرے اور کاٹے گئے جن انتڑیوں کو ہم ذبح کرنے کے بعد کوڑے میں پھینک دیتے ہیں، وہ بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت ہوتی ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۲ء میں پاکستان سے ۵ ارب روپے مالیت کی انتڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ پاکستان سے مرغی کے پنجے بھی ایکسپورٹ ہو رہے ہیں۔

''جو پاکستانی بہن بھائی سرمایہ رکھتے ہیں، وہ اس طرح کی چھوٹی اشیا برآمد کر کے اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جن دنوں دبئی بن رہا تھا، ان دنوں وہاں درخت اگانے کے لیے مٹی کی ضرورت تھی۔ کراچی کے ایک کاروباری نے وہاں مٹی ایکسپورٹ کرنا شروع کی اور راتوں رات کروڑ پتی بن گیا۔''

علی نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا ''بھئی حد ہے، پاکستان سے اچھوتی چیزیں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں اور کاروبار کے بہترین مواقع موجود ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''پاکستان سے ایسی عجیب اشیا ایکسپورٹ ہو رہی ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور لوگ ان کے ذریعے خوب کما رہے ہیں۔ میرا ایک دوست بیرون ممالک جانے والے گوشت کی پڑتال کرنے والے ادارے میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا، ایک شخص اس کے پاس گدھے کی کھالیں ایکسپورٹ کرنے کے لیے سرٹیفکیٹ لینے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیرون ملک جس پارٹی کو میں گدھے کی کھالیں بھجواتا ہوں، وہ مجھے نقد ادائیگی کرتی ہے۔ اس کھال سے کسی دوائی کا خام مال بنتا ہے اور یہ تھائی لینڈ ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔

''مقامی ہنرمندوں کی تیار کردہ دست کاری والی مصنوعات (ہینڈی کرافٹس) پاکستان سے ایکسپورٹ کر کے بے پناہ زر مبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھارت اور چین اس وقت ہینڈی کرافٹس کی برآمدات کے سرخیل ہیں۔ بھارت انھیں فروخت کر کے ۲۳۵ ارب روپے سالانہ کماتا ہے۔ بھارت اور ہماری ثقافت ملتی جلتی ہے۔ جب بھارت اپنی ہینڈی کرافٹس کی اشیا فروخت کر کے اربوں روپے کما سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

''ضروری نہیں کہ صرف قدرتی اشیا برآمد کی جائیں۔ ویلیو ایڈڈ یعنی خام مال سے تیار کردہ اشیا بھی برآمد کرنا ممکن ہے۔ ان اشیا میں ایسی بھی شامل ہیں جن کے کاروبار میں تقریباً ۵ فیصد زیادہ سرمایہ کاری کرنے سے دگنا یعنی ۱۰۰ فیصد زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اس قسم کی اشیا میں اچار،

www.pdfbooksfree.pk

ایکسپورٹ کے فوائد

برآمدات کا کاروبار ذاتی لحاظ سے مفید ہے اور قومی اعتبار سے بھی! اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی آمدن ڈالر یا یورو میں ہوتی ہے۔ جب وہ پاکستانی کرنسی میں تبدیل ہو، تو کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مزید براں کاروبار بڑھانے کے لیے آپ کو دنیا بھر کی مارکیٹیں مل جاتی ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ کرنسی کی قدر کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا جب قدر گرے، تو ایکسپورٹر کا منافع بڑھ جاتا ہے۔ قومی لحاظ سے برآمدات کا فائدہ یہ ہے کہ جب ایکسپورٹ بڑھے، تو قومی خزانہ میں زرمبادلہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یوں معیشت مضبوط ہوتی ہے اور ادائیگیوں کا توازن بہتر ہو جاتا ہے۔

چٹنیاں، جام، مربے، پنیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں جنوبی ایشیا کے لوگ زیادہ تعداد میں رہتے ہیں، مثلاً خلیجی ریاستیں وغیرہ، وہاں انکی اشیا کی بہت مانگ ہے۔

"اب آتے ہیں اس سوال کی جانب کہ ایکسپورٹ شروع کرنے کے لیے متعلقہ معلومات کیونکر حاصل کی جائیں۔ سب سے پہلے تو اردگرد نظر دوڑاؤ کہ پاکستان سے کیا کیا شے ایکسپورٹ ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ ایسی شے یا اشیا کا انتخاب کرو جنھیں کم کمپنیاں برآمد کرتی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم ایک شے کی برآمد میں مہارت کی شہرت پانے کے بجائے دو تین اشیا کی فروخت پر توجہ دو۔ اس طرح تمھارا کاروبار جلد مستحکم ہو سکے گا۔ پھر ایسی شے یا اشیا کا انتخاب کرو جس کے اندر منافع ہو اور مقابلہ بھی کم ہو۔ اس سلسلے میں تمھیں اعداد و شمار سے مدد لینا ہوگی۔

"آج کل سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے پاس انٹرنیٹ موجود ہے۔ انٹرنیٹ نے کاروبار کرنا اتنا آسان بنا دیا ہے جتنا پہلے نہیں تھا۔ خصوصاً امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ افراد کے لیے۔ اگر تم انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی کا استعمال جانتے ہو تو گھر بیٹھے برآمدات سے متعلق وہ تمام معلومات حاصل کر سکتے ہو جنھیں پانے کی خاطر پہلے کئی اداروں کی خاک چھاننا پڑتی تھی۔

"سب سے پہلے تم یہ دیکھو کہ جس شے یا اشیا کی فروخت کی تم ٹھانا چاہتے ہو، پاکستان سے وہ کن ممالک میں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں۔ اس شے کی ایکسپورٹ بڑھ رہی ہے یا کم ہوئی۔ اگر بڑھ رہی ہے، تو اضافہ کتنے فیصد ہے۔ دوسرے یہ تلاش کرو کہ اس شے کے سب سے بڑے خریدار کون سے ممالک میں ہیں۔

"اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پاکستان سے جو کمپنیاں وہ شے برآمد کر رہی ہیں، ان کا معیار کیا ہے اور وہ کس قیمت میں اسے فروخت کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دیگر ممالک کی کمپنیاں وہ شے کس قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔ اس مشکل کے دو حل ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو ملک اس شے کا سب سے بڑا درآمد کنندہ یعنی امپورٹر ہے، اگر وہاں آپ کا کوئی جاننے والا رہتا ہے تو اس سے کہو کہ وہ کسی کمپنی کا نمائندہ بن کر ان کے پاس جائے، مطلوبہ شے کی تکنیکی خصوصیات حاصل کرے اور ان سے مذکورہ شے کی قیمت بھی جان لے۔

"دوسرا آسان حل یہ ہے کہ آج کل بیشتر کاروبار انٹرنیٹ اور ای میل کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ آپ اپنی مطلوبہ ویب سائٹ کھولو اور پھر اس شے کے جو بڑے امپورٹر ممالک ہیں، ان کی کمپنیوں کو ای میل کرو اور ان سے مطلوبہ تکنیکی خصوصیت کے ساتھ اپنی مطلوبہ شے کا ریٹ لو۔ جب آپ نے کام شروع کرنا ہو، تو ان سے

www.pdfbooksfree.pk

شے کے نمونے بھی منگوا لو تاکہ آپ کو ان کے معیار کا اندازہ بھی ہو جائے۔"

علی نے پوچھا "خطیب بھائی! مجھے ان کمپنیوں کا کیسے پتا لگے گا جن سے میں نے ریٹ لینا ہے؟"

میں نے جواب دیا "اس کا بہت آسان حل ہے لیکن اکثر پاکستانی اسے نہیں جانتے۔ وہ یہ کہ کاروبار میں ہر سیکٹر یا شعبے کی کاروباری کمپنیوں کی اپنی تنظیمیں ہیں جو ویب سائٹس بھی رکھتی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر جا کر تم سب ایکسپورٹروں کے نام و پتے حاصل کر لو۔ ویب سائٹس پر ان کے فون نمبر، ڈاک پتا اور ای میل سب کچھ درج ہوتا ہے۔ یہی اصول اس وقت بھی لاگو ہو گا جب تم اپنی شے کی مارکیٹنگ کے لیے امپورٹر کمپنیوں سے رابطہ کرو گے۔ امپورٹروں کی تنظیمیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر تمام رکن کمپنیوں کا سارا ڈیٹا موجود ہے۔"

علی نے اب اگلا سوال پوچھا "خطیب بھائی، ابھی آپ نے ایکسپورٹ والی اشیا کی مارکیٹنگ کا ذکر کیا۔ ہم ایکسپورٹ کا جو بھی کام شروع کریں، اس میں اپنی شے یا اشیا کی مارکیٹنگ کیسے کی جاتی ہے؟"

میں نے بتایا "اس مقصد کے لیے تمھیں جامع حکمت عملی بنانی پڑے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ تمھارے غیر ملکی گاہک کون ہیں۔ اس سلسلے میں تمھیں انٹرنیٹ اور اعداد و شمار سے مدد ملے گی۔ سب سے پہلے تو گوگل سرچ کے ذریعے یہ تلاش کرو کہ تمھاری شے کے دنیا میں سب بڑے امپورٹر ممالک کون سے ہیں اور پاکستان سے وہ شے سب سے زیادہ کن ملکوں کو ایکسپورٹ کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ان ممالک کی متعلقہ تنظیموں کی ویب سائٹس سرچ کرو۔

"اگر انگریزی میں تمھیں مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی تو گوگل ٹرانسلیٹ کے ذریعے شے کے الفاظ اس ملک کی زبان میں ترجمہ کر کے پھر سرچ کرو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بے شمار ممالک جن کی مادری زبان انگریزی نہیں خصوصاً یورپی ممالک، ان کی ویب سائٹس انگریزی میں نہیں ہوتیں۔ انگریزی زبان میں سرچ کرتے وقت بھی مختلف متعلقہ الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً اگر تم نے برطانیہ کی انڈسٹریوں سے ساسیج (ایک قسم کا کباب) بنانے والے کمپنیوں کی تنظیم کو سرچ کرنا ہے، تو ٹائپ کرو: ساسیج کیسنگ امپورٹرز ایسوسی ایشن یو کے انگلینڈ۔ اگر اس سے مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی، تو ٹائپ کرو ایسوسی ایشن آف ساسیج کیسنگ امپورٹرز ایسوسی ایشن انگلینڈ یو کے۔ وجہ یہ ہے کہ مختلف الفاظ لکھنے پر گوگل مختلف نتائج دکھاتا ہے۔ مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے آپ کو مختلف الفاظ لکھ کر سرچ کرنی پڑتی ہے۔

"بہرحال تمھاری مطلوبہ شے کے جو پانچ، چھے بڑے امپورٹر ممالک ہیں، وہ اور جنھیں پاکستان یہ شے بڑی تعداد میں فروخت کرتا ہے، وہاں کی تنظیموں کی ویب سائٹس سے امپورٹر کمپنیوں کی ویب سائٹس سے پتے نکال کے ان کی فہرست بنا لو۔ اس میں ان کے نمبر، ای میل، ڈاک پتا وغیرہ بھی سب شامل کر لو۔ اس کے بعد اپنی ایک ویب سائٹ بنواؤ۔ کاروباری ویب سائٹ زیادہ مہنگی نہیں پڑتی، پاکستان میں کوئی بھی آئی ٹی کمپنی آپ کو پانچ ہزار روپے میں آپ کے کاروباری نام کی ایک اچھی ویب سائٹ بنا دے گی۔

اس ویب سائٹ میں اپنے دفتر، فیکٹری یا اس فیکٹری کی جس سے اپنا مال بنوا رہے ہو، کم از کم تین چار تصویریں ڈالو۔ یہ بہت ضروری ہے تاکہ دوسروں پہ اچھا

تاثر پڑے کہ یہ کمپنی سنجیدہ اور پروفیشنل انداز میں کام کر رہی ہے۔ غرض اپنے ممکنہ گاہکوں کے سامنے دفتر کی عمدہ تصویر پیش کرو۔ ممکن ہو، تو اپنے دفتر یا فیکٹری کی تین چار منٹ دورانیے پر مشتمل ایک مختصر سی ویڈیو بھی ڈال دو۔

''آج کل دنیا میں اربوں کھربوں روپے کی تجارت ایسی ہی ویب سائٹس کے ذریعے ہو رہی ہے جنھیں ہم ''بی ٹو بی'' یعنی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس کہتے ہیں۔ ان ویب سائٹس پر آپ اپنا اکاؤنٹ بناتے ہو۔ اس کے بعد دلچسپی رکھنے والی کمپنیاں آپ سے پہلے متعلقہ شے یا اشیا کی قیمت معلوم کرتی ہیں۔ انھیں آپ کا ریٹ پسند آ جائے، تو وہ آپ سے نمونے منگواتی ہیں۔ وہ پسند آ جائیں، تب آپ کو آرڈر دیتی ہیں۔ اس طرح کی سب سے بڑی ایک چینی کمپنی ''علی بابا کام'' (alibaba.com) ہے۔ اس کے ذریعے ہر مہینے کھربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

علی بابا ڈاٹ کام اور اس طرح کی دوسری بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس پر اپنی کمپنی کا اکاؤنٹ بناؤ اور ان پر کمپنی کی متعلقہ معلومات اور تصویریں اپ لوڈ کرو۔ علی بابا اور اس طرح کی دوسری ویب سائٹس پر ہر مہینے ''آر ایف کیو'' (quotations for request) یعنی تمہاری متعلقہ شے/اشیا خریدنے کے سلسلے میں قیمت معلوم کرنے کی غرض سے مختلف کمپنیاں اکثر درخواستیں دیتی ہیں۔ ان درخواستوں کا فوری جواب دیتے رہو۔ اگر تم نے ۵۰ کمپنیوں کو جواب دیا، تو اس میں سے دس تم سے نمونے منگوائیں گی۔ ان میں سے ایک دو نے بھی آرڈر دے دیا، تو تمہارا کام چل نکلے گا۔ اس کے علاوہ یہ سرچ کرو کہ تمھاری شے خریدنے والے ممالک میں کون سی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس زیادہ مقبول ہیں۔ علی بابا کے علاوہ ان پر بھی اکاؤنٹ لازمی بناؤ اور اسے مسلسل چیک کرتے رہو۔

''اگلا اہم کام یہ کرو کہ علی بابا پر اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق (verify) کراؤ۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ آپ کے پاس اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق کروانے کی آپشن ہوتی ہے۔ اگر آپ اس پہ کلک کر کے دی گئی ہدایات پر عمل کریں، تو علی بابا کا نمائندہ آپ سے ملنے آ جائے گا۔ وہ آپ کی کمپنی کی قانونی دستاویزات اور آپ کی فیکٹری یا دفتر دیکھے گا۔ اگر وہ مطمئن ہو کر گیا، تو آپ کی کمپنی کو علی بابا ویب سائٹ پر تصدیق شدہ (verified) کا درجہ مل جائے گا۔

''اس عمل کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہے کہ آپ کی کمپنی کی خریدار کے سامنے ساکھ بنے گی کہ یہ واقعی ایک باقاعدہ کمپنی ہے، کوئی گھر میں بیٹھ کر تنہا آدمی فراڈ نہیں کر رہا۔ پھر کوئی بھی غیر ملکی کمپنی آپ سے معاہدہ کرتے ہوئے نہیں گھبرائے گی، اسے آپ اور آپ کی کمپنی پر اعتبار ہوگا۔

''اب آتے ہیں کمپنیوں سے ملنے والے اس ڈیٹا کی طرف جو تم نے اکٹھا کیا۔ سب سے پہلے ان غیر ملکی کمپنیوں کو اچھی سی ای میل بنا کر بھیجو۔ اس میں اپنی کمپنی کا تعارف، متعلقہ شے یا مصنوعہ کے کوالٹی سرٹیفکیٹ، اپنی ویب سائٹ، ڈاک کا پتا وغیرہ سب معلومات شامل ہوں۔ ایک پروفیشنل کاروباری ای میل کیسے لکھی جاتی

Alibaba.com
Global trade starts here.™

www.pdfbooksfree.pk

ہے، تم انٹرنیٹ سے سرچ کر کے دیکھ سکتے ہو۔

''دوسرے تمھاری شے کے امپورٹر ممالک میں اگر کوئی تمہارا دوست، رشتے دار یا کوئی جاننے والا ہے، تو اس سے بات کر کے یہ معاہدہ کرو کہ تم وہاں ہماری کمپنی کے نمائندے بن کر کام کرو۔ جو آرڈر تم لاؤ گے، اس پہ ہم تمھیں ۵ فیصد یا ۱۰ فیصد یا جتنا بھی آپس میں طے ہو، اتنا کمیشن دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے، کسی غیر ملکی کمپنی کو کبھی ہمارے نمائندے سے ملاقات کی ضرورت پیش آئے، تو تم ہمارے نمائندے کے طور پر ان سے ملاقات کر آنا۔ ہم اس کے عوض تمھیں ایک یا دو فیصد اس آرڈر کی فروخت میں سے حصہ یا ایک مخصوص فیس دیں گے۔

''تیسرا طریقہ جو سب سے بہتر ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ دو حصے دار ہیں۔ تو کم از کم پہلا آرڈر ملنے تک ایک حصے دار اسی ملک میں قیام کرے۔ وہاں سے آرڈر لے کر ہی وہ پاکستان کی راہ دیکھے۔ جو خرچہ ہوگا، اس کو آپ فزیبلٹی رپورٹ بناتے وقت اپنے اخراجات میں شامل کرلیں۔

''ایکسپورٹ کے کاروبار میں مددگار بننے والا چوتھا اور سب سے اہم طریقہ ہے کاروباری نمائشوں میں شرکت۔ دنیا بھر میں ہر سال مختلف ممالک میں کاروباری نمائشیں لگتی ہیں۔ وہاں مختلف ملکوں کی کمپنیاں اپنے اسٹال لگاتی ہیں۔ اسی طرح کئی ملکوں کے خریدار ان نمائشوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سے انھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ تمام کمپنیوں کی مصنوعات ایک ہی چھت تلے مل جاتی ہیں۔ یوں مختلف کمپنیوں کی اشیا دیکھنے سے ان کی قیمتوں اور معیار کا بہتر اندازہ اور تقابل ہو جاتا ہے۔

اسٹال لگانے والی کمپنی کو یہ فائدہ ملتا ہے کہ ایک تو عالمی مارکیٹ میں بطور بڑی کمپنی اس کا نام آتا ہے جس پر اعتبار کرنا ممکن ہے۔ دوسرے کمپنی کو نئے گاہک ملتے ہیں۔ تمہارے کاروباری شعبے کی جو عالمی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں، خصوصاً ان ملکوں میں جہاں تمھاری شے سب سے زیادہ امپورٹ ہو، ان میں لازمی شرکت کرو تاکہ تمھیں نئے آرڈر ملیں اور عالمی مارکیٹ میں کمپنی کی ساکھ بھی بنے۔

''پانچواں طریقہ یہ ہے کہ آپ ان ممالک میں اپنے کمیشن ایجنٹ تعینات کرو۔ یہ لوگ بھی آپ کو انٹرنیٹ کے ذریعے مل جائیں گے۔ جس طرح ہمارے اولیکس ڈاٹ کام (olx.com.pk) اور روزی پی کے (Rozi.pk) ہیں، اسی طرح ان کے ہاں بھی ملازمین ڈھونڈ کر دینے والی ویب سائٹس ہیں جو انٹرنیٹ پر سرچ کرنے سے مل جائیں گی۔ لیکن یاد رہے، کمیشن ایجنٹ کے ذریعے پہلے رقم منگوائیں اور پھر مال بھیجیں۔ یا پھر مال بھیجنے سے پہلے کمپنی کی اچھی طرح تصدیق کرلیں کہ وہ قابل اعتبار ہے تاکہ مالی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔

''چھٹا طریقہ ہے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال۔ جو کمپنیاں آپ کی ای میل کا جواب دیں، ان کے متعلقہ منیجر کا موبائل نمبر لے کر ان کے ساتھ مسلسل وٹس ایپ (whatsapp) اور سکائی پی (skype) کے ذریعے رابطے میں رہیں۔ آج کل ہر ایک کے پاس موبائل فون ہے۔ آپ متعلقہ غیر ملکی کمپنی سے بہتر اور فوری رابطہ کرنے کے علاوہ دیرپا تعلقات بھی استوار کر سکتے ہیں۔ فیس بک پیج بنانا اس لیے نہیں کہوں گا کہ وہ تب کام آتا ہے جب ہم نے عوامی سطح پر کوئی چیز بیچنی ہو۔ چونکہ تمہاری مارکیٹنگ مخصوص کمپنیوں تک محدود ہو گی۔ لہٰذا فیس بک پیج اس معاملے میں اتنا کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔

''ساتواں طریقہ یہ ہے کہ انھیں اپنی کمپنی کی تشہیری

www.pdfbooksfree.pk

اشیا روانہ کرو جن پر کمپنی کا نام کندہ ہو۔ مثلاً اگر آپ کی شے یا مصنوعہ کے خریدار یورپی ہیں، تو انھیں کرسمس کے موقع پر آپ اپنی کمپنی کے کیلنڈر، گھڑیاں، پیپر ویٹ، یا پاکستان کے ہینڈی کرافٹس سے بنی اشیا مثلاً ٹیبل لیمپ وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔ یہ بہت اچھا اور اہم مارکیٹنگ گر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو آپ کی کمپنی پر اعتبار قائم ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ طور پر کاروبار کرنا چاہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کمپنی کی تشہیری مصنوعات غیر ملکی کمپنی کے منیجر یا مالک کے کمرے میں مسلسل لگی رہتی ہے۔ لہٰذا جب اس نے آرڈر دینا ہو، تو آپ کی کمپنی سے کوٹیشن اور نمونے لازمی لے گا۔"

میں نے پھر "لیکن" پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن ان تمام تشہیری طریقوں کا تبھی فائدہ ہوگا، اگر آپ کی کمپنی کی بنی مصنوعہ یا برآمد ہونے والی شے کی قیمت اور معیار اچھا ہو۔ آپ جتنی مرضی تشہیر کر لیں، اگر آپ کی مصنوعات کا ریٹ اور معیار اچھا نہیں، تو شاید کوئی ایک بار تو مال خرید لے، لیکن اگلی بار کبھی نہیں خریدے گا۔"

"طیب بھائی، ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے مجھے کیا ریٹ دینا چاہیے اور میں یہ کیسے یقین حاصل کروں کہ میری مصنوعہ کا معیار عالمی معیار کا مقابلہ کر سکتا ہے؟" علی نے سنجیدہ ہو کر سوال پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھو کاروبار کے شروع میں آپ گاہک بناتے اور پھر انھی سے ساری عمر کمائی کرتے ہیں۔ اس لیے شروع میں آپ کی توجہ کمانے پر کم اور گاہک بنانے پر زیادہ ہونی چاہیے۔ ایک بار جب کوئی گاہک بن جائے اور آپ سے دو تین بار مال منگوا لے تو پھر اس کا کسی دوسرے کے پاس جانا قدرے مشکل ہوگا۔ امپورٹر اچھی کمپنی کو کبھی نہیں چھوڑتا کیوں کہ اسے آپ اور آپ کی مصنوعات/اشیا پر اعتبار ہوتا ہے۔ کاروبار کے شروع میں آپ اپنی شے/مصنوعہ کی قیمت مارکیٹ میں مروج ریٹ سے کم از کم ۱۰ تا ۲۰ فیصد کم رکھو۔ اگر آپ کی ایکسپورٹ مصنوعہ اس قسم کی ہے جس میں منافع کم ہے، تو بھی کم از کم ۵ تا ۱۰ فیصد تک مارکیٹ ریٹ سے نیچے قیمت رکھنی ہوگی۔

"جب تم کاروبار شروع کرتے ہوئے مختلف ممالک کی ایکسپورٹر کمپنیوں سے ریٹ لو گے، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ ان کے ریٹ ایک مخصوص رینج میں ہوں گے مثلاً ۲۱ سے ۳۰ ڈالر تک۔ جس کمپنی کا تمھیں کم سے کم ریٹ ملے، اس سے بھی ۱۵ تا ۲۰ فیصد نیچے اپنی مصنوعہ کی قیمت رکھو، تو بہتر ہوگا۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کل کو ایک ڈیڑھ سال بعد تم اپنا ریٹ بڑھا دو اور کم از کم مارکیٹ ریٹ کے قریب لے آؤ، تب بھی امپورٹر کمپنی تمھیں نہیں جانے گی کیوں کہ اسے علم ہوگا، اب بھی سب سے سستا ریٹ تم سے ہی مل رہا ہے اور ساتھ میں معیار بھی مناسب ہے۔

"کاروبار کے حوالے سے ایک مشہور پنجابی مثل ہے: پہلے سال کھتی، دوجے سال چٹی، تیجے سال ہٹی۔ مطلب یہ کہ جب آپ کاروبار شروع کرتے ہیں، تو پہلے سال نقصان ہوتا ہے، دوسرے سال آپ نہ نفع نہ نقصان کی حالت پہ آجاتے ہیں اور تیسرے سال سے آپ کو

QUALITY MANAGEMENT SYSTEM
ISO 9001:2008
CERTIFIED

www.pdfbooksfree.pk

منافع ملنا شروع ہوتا ہے۔ یہ صرف کہاوت ہی نہیں بلکہ حکمت عملی بھی ہے۔ پہلے سال آپ اپنا منافع بالکل کم رکھیں اور گاہک بنائیں، دوسرے سال آپ تھوڑا بہتر منافع لینا شروع کریں اور تیسرے سال آپ مارکیٹ کے برابر آجائیں۔

کاروبار میں قیمت کے بعد شے کے معیار کو اہمیت حاصل ہے۔ یاد رکھو، بین الاقوامی مارکیٹ میں عمدہ معیار کے بغیر آپ کچھ نہیں بیچ سکتے۔ غیر معیاری چیز فروخت کر کے آپ اپنا اور اپنے ملک کا نام بدنام کرو گے۔ یوں دوسرے ممکنہ ایکسپورٹروں کے لیے بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک شے کا معیار پرکھنے اور جانچنے کے لیے پہلا حل تو وہی ہے جس کا میں نے پچھلی ملاقات میں ذکر کیا تھا۔ وہ یہ کہ تم جس شے کو ایکسپورٹ کرنا چاہتے ہو، اس سے متعلقہ کسی کمپنی میں انٹرن شپ کرو اور باسلسلہ کاروبار ساری تکنیکی چیزیں سیکھ لو۔ تم ابھی تعلیم پا کر فارغ ہوئے ہو، کوئی بھی کمپنی ڈھونڈ کے اس میں انٹرن شپ کی درخواست دے دو۔

پھر وہیں کمپنیوں میں دو گے، تو کوئی نہ کوئی کمپنی تو رکھ ہی لے گی۔ تم ان کے لیے مفت میں کام کرو گے، تو وہ بھی چاہیں گے کہ انہیں کوئی ایسا بندہ مل جائے۔ اب کمپنی میں اپنی مرضی کے شعبے میں کام کرنا اور سیکھنا تمہاری اپنی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ تم اپنے دوست احباب سے بھی اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہو۔

''دوسرا حل سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے۔ کاروباری دنیا میں کسی کمپنی کی مصنوعات کا عمدہ معیار جانچنے کے لیے دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کتنے بین الاقوامی سرٹیفکیٹس حاصل کر رکھے ہیں۔ گویا وہ عالمی سطح پر آپ کی مصنوعہ کے معیار کی پہچان بنتے ہیں۔ ان سرٹیفکیٹس میں آئی ایس او ۹۰۰۰، آئی ایس او ۹۰۰۱، ہیپ (Haccp) اور اسی نوعیت کے دیگر سرٹیفکیٹس شامل ہیں۔ اگر آپ کی کمپنی یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لے، تو اس کے بہترین معیار پر عالمی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ تب امپورٹر آپ کی مصنوعہ کے معیار پر اعتبار کرتا ہے۔

''ان سرٹیفکیٹس کو کیسے حاصل کیا جائے؟ ان کا طریقہ کار اور دوسری تفصیلات ان سرٹیفکیٹس کو جاری کرنے والی عالمی کمپنیوں کی ویب سائٹوں پر موجود ہیں۔ ان کی شاخیں پاکستان میں بھی ہیں۔ ان کی ویب سائٹ سے پاکستان کی شاخ کا فون نمبر لو اور کال کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر لو۔ مختلف مصنوعات پر مختلف قسم کے کوالٹی سرٹیفکیٹس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کمپنیوں کی ویب سائٹ پر جاؤ اور ان سے فون پہ بات کر کے دیکھ لو کہ تمہاری مصنوعہ پر کس قسم کے سرٹیفکیٹ کا اطلاق ہوگا۔''

اب میں نے سوال پوچھا ''طیب بھائی یہ بتائیے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے کون سے سرکاری لائسنس اور دستاویزات درکار ہوں گی؟ میں کل ہی پڑھ رہا تھا کہ حکومت پاکستان نے برآمدات کا طریق کار سہل بنانے کی خاطر زیادہ مراعات دینے کا اعلان کیا ہے۔''

میں نے بتایا ''کاروبار کے آغاز میں کچھ زیادہ سرکاری دستاویزات درکار نہیں ہوتیں۔ اول تمہیں اپنی کمپنی رجسٹر کروانی پڑے گی اور اس کا ''این ٹی این'' یعنی نیشنل ٹیکس نمبر اور ''ایس ٹی این'' یعنی سیلز ٹیکس نمبر لینا پڑے گا۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو یعنی ایف بی آر کی ویب سائٹ www.fbr.gov.pk پر جا کر تم بآسانی اپنا نیشنل ٹیکس نمبر لے سکتے ہو۔ حکومت پاکستان نے اس عمل کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ اب تمہیں کسی

www.pdfbooksfree.pk

وکیل کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر بھی تم کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو، تو کسی امپورٹ ایکسپورٹ کے وکیل کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری کمپنی رجسٹر کروائے تمہیں این ٹی این بھی لے دے گا۔

''دوسرے تمہیں کسٹم ہاؤس میں اپنی کمپنی کی بطور امپورٹر رجسٹریشن کرانی ہوگی۔ جب بھی تم باہر بھجوانے کے لیے مال تیار کرو گے، تمہارا کلیرنگ ایجنٹ تمہاری رجسٹریشن کروا دے گا۔ اس کے علاوہ امپورٹ کے لیے تمہیں جو دستاویزات درکار ہوں گی، ان میں تمہاری انوائس یعنی امپورٹر کمپنی کے نام رسید، بل آف لیڈنگ (bill of lading) اور پیکنگ لسٹ شامل ہیں جو تم اپنی شپنگ کمپنی کو دو گے اور وہ تمہارے غیر ملکی خریدار کی شپنگ کمپنی کو دے گی۔

DS-CONCEPT
Intelligent Trade Finance

پیکنگ لسٹ ایک دستاویز ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ سامان پیک کیسے ہوا یعنی مال کے کل کتنے کارٹن ہیں، ایک کارٹن میں کتنے پیک ہیں اور ایک پیک میں آپ کی مصنوعہ کے کتنے یونٹ ہیں۔ اسی طرح بل آف لیڈنگ وہ دستاویز ہے جو بندرگاہ یا ہوائی اڈے پر سامان کلیئر کرواتے ہوئے آپ کا شپنگ ایجنٹ بطور قانونی دستاویز دوسری کمپنی کے شپنگ ایجنٹ کے حوالے کرتا ہے۔ بل آف لیڈنگ کے بغیر سامان بندرگاہ سے نکل نہیں سکتا اور دوسرے ملک کی بندرگاہ پر پہنچ کر کلیئر نہیں ہوتا۔ ان دستاویزات کے نمونے تم انٹرنیٹ پر ان کے ناموں سے سرچ کر کے دیکھ سکتے ہو تاکہ انہی نمونوں کی بنیاد پر اپنی مصنوعہ کے لیے یہ دستاویزات تیار کر سکو۔''

علی اگلا سوال کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے کہا ''مجھے علم ہے کہ تم کیا پوچھنے لگے ہو، تم جاننا چاہتے ہو کہ ہماری مصنوعہ اشیا خریدنے والی غیر ملکی کمپنی ہمیں رقم (Payment) کیسے بھیجے گی اور کیا ہمیں بل کی رقم نقد لینی چاہیے؟ اگر نہیں، تو پھر دوسرا طریقہ کیا ہے؟''

علی کہنے لگا ''ارے واہ، آپ تو اب میرے دل کی باتیں بھی جاننے لگے ہیں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''جب تم اتنی دلجمعی سے بات سنو گے، تو تمہارے دل کی بات، تو میں جان ہی لوں گا۔ بہرحال اصل موضوع کی طرف آؤ۔ اصولی طور پر تو تمہیں پہلی بار نقد رقم ہی منگوانی چاہیے۔ یہ تم ''ٹی ٹی'' (T/T) کے ذریعے منگوا سکتے ہو جو کسی بھی منی ایکسچینج سے منگوائی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر کمپنی ایسا نہیں کرے گی اور نہ ہی ہر بار ایسا ہوگا۔

''غیر ملکی کمپنیوں سے رقوم منگوانے کے دو تین طریقے ہیں۔ ایک کو ہم ''ایل سی'' (L/C) یعنی لیٹر آف کریڈٹ کہتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں آپ بینک جا کر کہتے ہیں کہ فلاں غیر ملکی کمپنی نے مجھے رقم بھجوانی ہے اور اسی سلسلے میں وہ اپنے ملک کے فلاں بینک میں ایل سی کھلوانا چاہتی ہے۔ آپ کا بینک پھر اس کمپنی کے بینک سے تمام تفصیلات لیتا ہے۔ پھر آپ کی ایل سی کی درخواست منظور کر کے آپ کو کہہ دیتا ہے کہ آپ رقم منگوا لیں۔ ادائیگی کی اس صورت میں بینک آپ کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر غیر ملکی کمپنی آپ کو رقم ادا نہیں کرتی، تو اس صورت میں بینک آپ کو رقم ادا کرتا ہے۔

رقم کی ادائیگی کے دوسرے طریقے کو ''سی ڈی''

www.pdfbooksfree.pk

(C/D) کہتے ہیں یعنی دستاویزات کے بدلے نقد ملنا۔

اس میں یہ ہوتا ہے کہ اپنا امپورٹ شدہ مال کلیئر کروانے کے لیے آپ کو بل آف لیڈنگ، اصل انوائس اور پیکنگ لسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ یہ دستاویزات اپنے بینک میں جمع کرواتے ہو۔ وہ انھیں غیر ملکی کمپنی کے بینک کو بھیجتا ہے۔ وہ غیر ملکی بینک اپنے ملک کی کمپنی کو بھی مال دیتا ہے جب وہ انھیں نقد رقم دیتی ہے۔ لیکن اگر غیر ملکی کمپنی آپ کی دستاویزات نہ لینے آئے، تو اس صورت میں بینک آپ کی رقم لوٹانے کا ذمے دار نہیں ہوتا۔"

اب علی نے لقمہ دیا: "نقیب بھائی، ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے وقت کسی سرکاری یا نجی ادارے سے مالی مدد مل سکتی ہے؟"

میں نے جواب دیا: "تم نے اچھا اور بروقت سوال پوچھا۔ مالی مدد بالکل مل سکتی ہے، لیکن افسوس پاکستان میں یہ رقم تمھیں نجی سیکٹر ہی سے ملے گی۔ دنیا میں ہر ملک نے اپنا ایکسپورٹ امپورٹ بینک بنا رکھا ہے۔ وہ ایکسپورٹ کا کاروبار کرنے والوں کو آسان شرائط پر قرضے دیتا ہے۔ افسوس پاکستان میں ایسے کسی بینک کی سرکاری منظوری ہونے کے باوجود اس کا دور دور تک نام و نشان نہیں۔ بہرحال ڈی ایس کونسیپٹ (ds concept) نامی بین الاقوامی کمپنی کی ایک شاخ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں بھی کھلی ہے۔ اس کی ویب سائٹ کا نام ہے:

www.ds-concept.net.pk

یہ کمپنی آپ کو ایکسپورٹ کا کاروبار کرنے کے لیے مخصوص شرائط پر سرمایہ فراہم کرتی ہے بشرطیکہ آپ کے پاس آرڈر ہو۔

"عام طور پر غیر ملکی کمپنی جب آپ سے مال خریدے، تو وہ آپ کو سامان کی تیاری کے لیے ۳۰ سے ۹۰ دنوں کا وقت دیتی ہے۔ اگر آپ نے اس کمپنی کے ساتھ یہ طے کیا کہ رقم دستاویزات کے بدلے ملنی ہے، تو وہ آپ کو ۹۰ دن بعد ملے گی جبکہ آرڈر تیار کرنے کے لیے آپ کو ابھی روپے چاہئیں۔

اگر آپ سرمایہ فراہم کرنے والی کمپنی کو اپنے آرڈر کی دستاویزات دے دیں، تو وہ آپ کو نقد رقم دیتی ہے۔ اس رقم سے پھر اپنا آرڈر تیار کرانا ممکن ہوتا ہے۔ جب آپ کا بل خریدار کمپنی ادا کرے گی، تو اسے سرمایہ کار کمپنی رقم لے کر اور اپنی فیس رکھ کر باقی رقم آپ کو دے گی۔

سرمایہ کار کمپنی سے مدد لینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے نیٹ ورک کے ذریعے آپ کی خریدار کمپنی کی صلاحیت بھی جانچتی ہے کہ آیا یہ پیسے بھی دے گی یا نہیں اور اس حوالے سے اس کی تاریخ کیسی ہے۔ سی ڈی کے علاوہ یہ کمپنی بقیہ ادائیگی کے طریق کار پر بھی کام کرتی ہے جس کی تفصیلات تم ان کی ویب سائٹ سے جان سکتے ہو۔"

ہم باتوں باتوں میں ایک کلو مٹن کڑاہی کھا گئے تھے اور پتا بھی نہیں چلا۔ علی نے حیران ہو کر کہا "اتنی زیادہ کڑاہی تو میں نے آج تک نہیں کھائی۔"

میں نے اسے بتایا کہ جتنے انہماک سے تم نے باتیں سنی ہیں، اس میں غرق ہو کر انسان کی دوسرے کاموں پہ توجہ نہیں رہتی۔ اگر تم اسی انہماک سے کاروبار پر محنت کرنے لگے، تو ان شا اللہ کامیاب ہو گے۔ چلو پشاوری قہوہ پیتے ہیں۔ وہ ہاضمے کے لیے اکسیر ہوتا ہے۔ میں وہاں تمھیں بتاؤں گا کہ جانوروں کی انتڑیاں برآمد کر کے منافع بخش کاروبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ♦♦♦

www.pdfbooksfree.pk

معرکہ کارگل کا دلیر مجاہد

جس نے بے سروسامانی کے باوجود برف پوش وادیوں میں طاقتور عدو کو تگنی کا ناچ نچادیا

شاہ زیب

"میرے جوانو! آج ہم جس مشن کے لیے روانہ ہونے والے ہیں، اس میں کامیابی پانا مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں۔ ہمیں دلیری و جرأت سے یہ مشن کامیاب بنانا ہے تاکہ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں مسلمان بہنوں، ماؤں اور بچوں کی بے حرمتی کرنے والی بھارتی فوج کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔"

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے یہ الفاظ اپنی سی کمپنی سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کہے جب وہ ان کی زیر قیادت کارگل کے محاذ پر جانے لگی۔ یہ ولولہ انگیز خطاب سننے کے بعد کمپنی کے افسروں اور جوانوں میں جہاد کا جذبہ زیادہ تھا۔ تمام نے بیک آواز ہو کر کہا "سر! آپ نے جو مشن ہمارے سپرد کیا، ہمیں پیچھے نہیں پائیں گے۔ آپ کے ساتھ جئیں گے اور آپ کے ساتھ ہی شہید ہوں گے۔"

www.pdfbooksfree.pk

اس پر لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی گرجدار آواز پھر گونجی "آج سے نہ میں آپ کا افسر اور نہ آپ میرے ماتحت، ہم سب برابر ہیں۔ اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے ہی شہید ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی فضا اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ سرفروشوں کا یہ قافلہ ۲ر جولائی ۱۹۹۹ء کو گلگت روانہ ہوا۔ یونٹ ۳۳ ایف ایف کے باقی افسر اور جوان بھی ہمراہ تھے۔ عام طور پر جب کوئی یونٹ سرد علاقوں میں تعینات ہو، تو اسے پہلے تین ماہ گلگت چھاؤنی میں رکھا جاتا ہے تاکہ جوان مقامی موسم سے مانوس ہو جائیں۔ اکثر اوقات بلند برفانی پہاڑی سلسلوں میں پہنچ کر جوان بے شمار جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آکسیجن کی قلت کے باعث انسانی پھیپھڑے پھٹ جاتے ہیں اور دشمن سے نبرد آزما ہونے کے بجائے موذی بیماریوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

لیکن ۳۳ ایف ایف یونٹ کو صرف ایک دن کا قیام دے کر کارگل کی ۱۸ ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر جنگ لڑنے بھیج دیا گیا۔ اس سے جوانوں کی صحت پر برا اثر پڑا۔ لیکن دفاعِ وطن کی پکار پر سبھی جوانوں نے اپنی ہمت اور حوصلے سے بڑی صعوبتوں کو مات دے دی۔ انھوں نے برفانی گھاٹیوں اور برف پوش بلند ترین پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنے کا ناقابلِ یقین سفر چار دن میں پیدل ہی طے کر لیا۔ یونٹ کے جوان اور افسر دن رات سخت برف کی تہ پر چلتے رہے۔ جہاں دس قدم چل کر تھوڑا سانس بحال کرنے کی غرض سے رکنا پڑتا۔ ان غیور جوانوں کی منزل وہ بلند اور دشوار ترین چوٹیاں تھیں جہاں سے کارگل اور سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی ہے۔ عسکری لحاظ سے اس سڑک پر قبضہ بہت ضروری تھا تاکہ دشمن کی شہ رگ کاٹ کر اسے کشمیر سے بھاگنے پر مجبور کیا جا سکے۔

دورانِ مسافت ایک مقام ایسا آیا جہاں برف پوش پہاڑی بالکل عمودی تھی۔ آسمان سے چھوتی چوٹی کو عبور کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے مطابق یہ کام کمانڈوز ہی انجام دے سکتے تھے کہ وہ چوٹی پر پہنچ کر رسی کے ذریعے جوانوں کو پہاڑی کی بلندی پر چڑھاتے۔ سبھی جوان طویل مسافت پیدل طے کرنے اور سرد ترین موسم میں چلتے چلتے نڈھال ہو چکے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ عمودی پہاڑی پر چڑھ سکیں۔

اسی اثنا میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر سے کہا "سر! کمانڈوز بلوانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت سے میں یہ معرکہ سر کر کے دکھاتا ہوں۔" اس پتلے نوجوان کے چہرے پر تھکاوٹ اور بے آرامی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک دیکھ کر محسوس ہوتا کہ دشمن کا یہ جوان یہ کٹھن کام کر سکتا ہے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اسے سمجھایا کہ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنا آسان کام نہیں۔ پھر تم ابھی پاکستان ملٹری اکیڈمی سے فارغ ہوئے ہو۔ پیشہ وارانہ تربیت کے دیگر کورس بھی نہیں کیے۔ انفنٹری کا بنیادی کورس ۲ر اگست کو شروع کرنا تھا کہ کارگل کی دشوار گزار وادیوں نے اسے پکار لیا۔

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر کو کہا "مانا کہ میں آج پہلی مرتبہ یہ بلند ترین چوٹیاں عبور کرنے آیا ہوں۔ ہتھیاروں کے ساتھ ان چوٹیوں پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے لیکن جناب، میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ میرے اٹھتے قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھتے ہیں، کبھی پیچھے نہیں ہٹے پھر مجھے ایک غازی کا بیٹا ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔"

دراصل فیصل ضیا گھمن بچپن سے عسکری ناول بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اسی شوق کی بدولت اس نے کئی مرتبہ

www.pdfbooksfree.pk

اپنے والد سے ڈانٹ بھی کھائی۔ لیکن عسکری ناولوں نے اس کے اندر ایسا معرکہ آرا انسان پیدا کر دیا جو مشکل سے مشکل جنگی مہم سر کرنے کے لیے ہمہ وقت خود کو تیار پاتا۔ اب بھی وہ خود کو جنگی ناول کا کردار ہی محسوس کرتا۔

آخر کمانڈنگ افسر نے اجازت دے دی۔ وہ ایک حوالدار کے ساتھ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یونٹ کے سبھی افسر اور جوان فیصل کی ہمت و جذبے کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔ انھوں نے اس کی کامیابی کے لیے دعا بھی مانگی۔ کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد لیفٹیننٹ فیصل حوالدار سمیت اس عمودی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب رہا۔ اس پر وہ بلاشبہ مبارک باد کے مستحق تھے۔ یونٹ کا ہر شخص اس کی جرأت اور بہادری کی تعریف کر رہا تھا۔

سی کمپنی کے وہ جوان چھولے نہ سماتے جنھیں لیفٹیننٹ فیصل کی سرپرستی حاصل تھی۔ اب چوٹی سے رسے نیچے پھینکے گئے۔ تمام جوانوں نے باری باری پہاڑی تسخیر کی۔ گھروں میں نرم و گداز بستروں پر سونے والے مجاہدوں کے لیے آرام کرنے اور سونے کو یہاں برف کا بستر بچھا تھا۔ سخت سرد موسم اور برفانی طوفان ان کے ارادے پست کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن شیر دل جوان وطن کی خاطر سبھی دکھ اور مصیبتیں جھیلنے پر آمادہ تھے۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو یونٹ کی سبھی کمپنیاں مقررہ جگہ پہنچ گئیں۔ لیفٹیننٹ فیصل سی کمپنی کے دس جوانوں سمیت اپنی یونٹ سے تین سو گز دور جانب مشرق اس مقام پر مورچہ زن ہوئے جہاں کارگل سے سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی تھی۔ معرکہ کارگل میں بھارتی فوج کو اس لیے زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ پستی میں تھے۔ بلند چوٹیوں پر بیٹھے مجاہدین انھیں دور ہی سے دیکھ کر گولیوں سے بھون دیتے۔ مزید برآں سیاچن میں ہزارہا بھارتی فوجی محصور تھے۔ پاک فوج کے جوانوں نے ان کی خوراک اور اسلحے کی رسد روک دی۔ اگر ۵ جولائی کو واشنگٹن میں نواز کلنٹن جنگ بندی معاہدہ نہ ہوتا اور پاکستانی فوج محاصرہ جاری رکھتی، تو سیاچن پر ہزارہا بھارتی فوجی اپنی موت آپ مر جاتے۔

کارگل لیہہ روڈ سے کچھ ہی فاصلے پر ارشد نامی پوسٹ پر لیفٹیننٹ فیصل دس جوانوں سمیت دشمن کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یاد رہے، کارگل کی ان وادیوں میں بھارتی بوفورز توپوں نے اتنی شدید گولہ باری کی تھی کہ ان کے دہانے ناقابل استعمال ہو گئے۔ بعد میں بھارت کو وہ دہانے سوئٹزرلینڈ سے منگوانے پڑے۔ پورے علاقے میں بھارتی ہیلی کاپٹر اور جنگی جہاز مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ وہ پاکستانی ٹھکانوں پر نہ صرف میزائلوں سے حملہ کرتے بلکہ پوزیشن بتا کر بھارتی توپ خانے سے فائر کراتے۔ ان ہیلی کاپٹروں سے زہریلی گیس کے بم بھی گرائے گئے۔ لیکن پاکستانی مجاہدوں اور کشمیری مجاہدین کو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس لیے گیس بم اور میزائل کارگر ثابت نہ ہوئے۔ بلکہ ہوا کے بدلتے رخ نے ہر بار ان گیس میزائلوں نے بھارتی فوجیوں ہی کو متاثر کیا۔

۱۶ جولائی کی شام بھارتی فوج نے ارشد پوسٹ پر زبردست حملہ کر دیا۔ کئی گھنٹے مقابلہ جاری رہا۔ جنگ کے دوران سی کمپنی کے دو جوان شہید ہو گئے۔ بھارت کے درجنوں فوجی جہنم واصل ہوئے۔ سفید برف سے ڈھکی برفانی ڈھلوانیں بھارتی فوجیوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ حملہ تو پسپا ہو گیا لیکن رات کے سناٹے میں زخمی انسانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی رہی۔

www.pdfbooksfree.pk

۱۷ر جولائی کا سورج طلوع ہوا، تو برفانی پہاڑیاں سرخ دکھائی دیں۔ سی کمپنی کے باقی ماندہ آٹھ جوان مستعدی سے اپنی پوسٹ پر دشمن کا انتظار کرتے رہے لیکن بھارتیوں کو دوبارہ حملے کی ہمت نہ ہوئی۔

۱۹ر جولائی کو بھارتی فوج نے ارشد پوسٹ پر ایک کمپنی کی نفری سے حملہ کیا جسے لیفٹیننٹ فیصل کی زیرقیادت پاک فوج کے غیور جوانوں نے روک لیا۔ دشمن کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچا کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی رات کارگل لیہہ روڈ پر بھارتی فوج کا ٹرکوں پر مشتمل قافلہ نظر آیا۔ یہ قافلہ سیاچن میں تعینات بھارتی فوج کے لیے خوراک لے کر جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ فیصل نے توپوں سے نشانے لگوا کر بھارتی فوج کا پورا قافلہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ فیصل ضیا کے کامیاب جنگی معرکوں کی خبریں کمانڈنگ افسر تک مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ وہ فیصل کو ہر معرکے کے بعد وائرلیس پر شاباش دیتے۔

۲۲ اور ۲۳ر جولائی کی رات دشمن نے ایک بار پھر نفری کے ساتھ ارشد پوسٹ پر چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر حملہ کیا۔ بھارتی میجر نے دستی مائیکروفون پر ارشد پوسٹ پر تعینات پاک فوج کے جوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”تمہیں گھیرا ڈال لیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ بھارتی فوج ان کو زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔“

یہ اعلان سن کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا نے بلند آواز میں کہا کہ میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔“

فیصل کا جواب سن کر بھارتی میجر ششدر رہ گیا کہ بارہ سو بھارتی سپاہیوں کی موجودگی میں جو ہر قسم کے جدید اسلحہ سے لیس تھے، پاک فوج کا یہ کتنا دلیر افسر ہے کہ گھیرے میں آنے کے باوجود مقابلے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ ۴ گھنٹے تک ارشد پوسٹ پر بھارتی فوج چاروں طرف سے گولہ باری کرتی رہی۔ لیکن فیصل کی قیادت میں مجاہدوں نے مردانہ وار مقابلہ کر کے حملہ پسپا کر دیا اور بھارتیوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ چناں چہ نفری سمیت بھارتی میجر اپنے زخم چاٹتا واپس لوٹ گیا۔

میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔“

بھارتی فوج کی اندھا دھند گولہ باری سے برفانی پہاڑیوں پر پھیلی برف زہریلی ہو گئی۔ پیاس بجھانے کے لیے جب برف پگھلائی جاتی، تو زہریلا پانی پینے والوں کو خونی پیچش لگ جاتے۔ فیصل سمیت سی کمپنی کے تمام جوان پیچش ہونے سے انتہائی لاغر اور کمزور ہونے لگے۔ پھر بھی ان کی جرأت اور بہادری کے باعث دشمن ارشد پوسٹ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔

بھارتی فوج کا رخ پھر ارشد پوسٹ سے چند سو گز دور واقع ایک اور پاکستانی چوکی کی طرف ہو گیا۔ وہاں کیپٹن کھوسہ مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ تعینات تھے۔ بھارتی فوج کا دباؤ اس چوکی پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد، کیپٹن کھوسہ کی مدد کے لیے نیچے اترے۔ دشمن مسلسل گولہ باری کر رہا تھا۔ بھارتی فوج کی بھاری نفری اس پاکستانی چوکی کو گھیرے میں لیے زبردست فائرنگ کر رہی تھی۔ اب اس جنگی معرکے میں

www.pdfbooksfree.pk

لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد بھی شریک ہو گئے کیونکہ دونوں تجربہ کار افسر بھارتی حربوں کو اپنی حکمت سے کئی مرتبہ ناکام بنا چکے تھے۔ انھیں بھارتی فوج سے نمٹنے کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔

لیکن جونہی لیفٹیننٹ فیصل وہاں پہنچے، ان کے ماتھے کو چیرتی ایک گولی جسم میں پیوست ہو گئی۔ عزم و ہمت کے پیکر کا لہو برفانی چوٹیوں پر بہنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی انھوں نے جام شہادت نوش کر لیا جس کے لیے وہ پاک فوج میں شامل ہوئے تھے۔ یہ ۲۳ جولائی کی شب تھی جب فیصل ضیا نے شہادت کو گلے لگایا۔ آہستہ آہستہ ارشد پوسٹ کے دیگر جوان بھی اپنے قائد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اس طرح انھوں نے یوں وعدہ پورا کر دکھایا جو محاذ جنگ پر روانہ ہونے سے قبل اپنے قائد اور راہنما لیفٹیننٹ فیصل گھمن کے ساتھ کیا تھا۔ ارشد پوسٹ (لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کی شہادت کے بعد فیصل ضیا چوکی) پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ دشمن کے زیر قبضہ علاقے سے شہیدوں کی میتیں واپس لانا مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں کئی کمانڈو ایکشن کیے گئے۔ جس میں میجر سمیت کئی جوان زخمی ہوئے۔ تب کہیں جا کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا سمیت شہداء کی میتیں سکردو واپس لائی جا سکیں۔

☆☆☆

۲۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو نماز مغرب کی ادائیگی کے دوران فون کی گھنٹی بجی جس کا لاشعور میں پہلے سے انتظار تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد لیفٹیننٹ فیصل ضیا کے والد گرامی، میجر ضیا قادر گھمن نے فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب ایف ایف ۳۳ کے کرنل سجاد بول رہے تھے۔ انھوں نے نہایت ضبط و تحمل سے بتایا کہ لیفٹیننٹ فیصل ضیا کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی حالت میں ہیں ڈاکٹران کی مکمل دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ فیصل کے بارے میں وقفے وقفے سے آپ کو اطلاع دی جاتی رہے گی۔ جونہی فون بند ہوا، باپ کو بیٹے کی شہادت کا یقین ہو گیا۔ کارگل جانے سے پہلے ہی میجر ضیا قادر نے نمازوں کے بعد جب بھی اپنے بیٹے کا تصور کیا، وہ انھیں سبز ہلالی پرچم میں لپٹا چارپائی پر لیٹا دکھائی دیا۔

والد کی بے قراری میں اضافہ ہوا، تو انھوں نے ایک عزیز کو فون کیا جو ان دنوں سکردو ہی میں تعینات تھے اور کہا کہ آپ سکردو کے فوجی اسپتال میں جا کر پتا لگائیے، فیصل واقعی وہاں موجود ہے اور کس حالت میں؟۔ دس منٹ بعد دوبارہ فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سکردو سے میجر صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ ضیا قادر گھمن کو بتانے لگے، کہ یونٹ میں شہدا کی جو فہرست آئی ہے، اس میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کا نام بھی درج ہے۔ یہ کہتے ہی ان کی زبان سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" نکلا اور فون بند ہو گیا۔

اسی روز لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہزارہا لوگ شہید کے آبائی گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ ہر شخص کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ لوگ جب بلند آواز میں کلمہ پڑھتے، تو محسوس ہوتا جیسے آج شہید کے گھر اللہ کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور جمع ہونے والے انسان نہیں فرشتے ہیں جو شہادت کی گواہی دینے زمین پر اترے۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۹ء کی دوپہر جب سبز ہلالی پرچم میں لپٹا شہید کا جسد خاکی گھر پہنچا، تو شدت جذبات سے ماں کی حالت غیر ہو گئی۔ بھائی تابوت سے لپٹ لپٹ جاتے۔ شہید کے والد نے کسی حد تک خود کو سنبھالے رکھا۔ شہادت کے پانچ روز بعد بھی لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی نعش تروتازہ تھی۔ جسم اتنا نرم جیسے زندہ انسان کا۔ ماتھے پر جہاں

www.pdfbooksfree.pk

گولی لگی تھی، پانچ دن بعد بھی زخم سے خون قطروں کی صورت رس رہا تھا۔

جب شہید کا جسد خاکی تدفین کے لیے ڈیفنس قبرستان لے جایا گیا، تو وہاں بادلوں کا ایک ٹکڑا قبرستان پر سایہ کرنے ٹھہرا رہا۔ تدفین کے بعد سب لوگ واپس چلے گئے۔ دوسری صبح محسوس ہوا کہ قبر پر کتبہ تیار ہے۔ شہید کے والد کی اجازت سے جب کتبے والی جگہ کھودی گئی تو وہاں سے سیمنٹ کا ایسا ٹکڑا ملا جس پر کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ" کندہ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی عظیم تخلیق کار نے کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ نہایت محنت اور خوبصورتی سے تراشا ہے۔ یہ ٹکڑا آج بھی شہید کے گھر فریم میں محفوظ ہے۔ اسے دیکھ کر شہید کے والد کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی۔ قرآن مجید میں آیا ہے، بے شک اسلام کی سربلندی اور دفاع وطن کے لیے جان کی قربانی دینے والا شہید زندہ ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس کی زندگی کا شعور نہیں۔ فیصل کی شہادت نے یہ سچ کر دکھایا۔

لیفٹیننٹ فیصل ضیا محسن یکم مئی ۱۹۷۸ء گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد میجر ضیا قادر تعینات تھے۔ ابتدائی تعلیم منگلا میں پائی۔ میٹرک کا امتحان ایف جی پبلک اسکول، منگلا سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایف ایس سی گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ سے کیا۔ ایف ایس سی کے بعد ۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی چلے گئے۔ ۱۹۹۸ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے ابتدائی تربیت مکمل کی۔ بعدازاں شہید نے والد کی یونٹ ایف ایف ۳۳ کو منتخب کیا۔ یونٹ میں انھوں نے محنت اور جدوجہد سے اپنا لوہا منوایا۔ وہ باپ کی بیساکھی لیے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ بلکہ آزمائش اور امتحان کی ہر گھڑی میں ثابت قدم رہا۔

شہید کے والد میجر ضیا قادر محسن کہتے ہیں، چونکہ میں خود فوج میں تھا اس لیے فیصل سمیت میرے تینوں بیٹوں کی تربیت نیم عسکری ماحول میں ہوئی۔ فیصل کو بچپن ہی سے فوج میں جانے کا بے حد شوق تھا۔ میں جب گھر آ کر وردی اتارتا تو فیصل میرے فوجی بوٹ پہن کر گھر میں گھومتا پھرتا۔ وہ بہت بہادر، خوددار اور ملنسار تھا۔ لیکن اس کی حقیقی دوستی اسلامی، عسکری اور تاریخ کی کتابوں سے تھی۔ وہ مطالعے کا اس حد تک شوقین تھا کہ مجھ سے کئی مرتبہ ڈانٹ کھائی۔ میری تمنا تھی کہ وہ زیادہ وقت دری

کارگل کی جنگ

یہ مئی ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب کشمیری مجاہدین نے مقبوضہ کشمیر میں کارگل سیکٹر کی پہاڑیوں پر قبضہ کیا۔ مدعا بھارتی فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ یوں اس معرکے کا آغاز ہوا جو "کارگل جنگ" کہلایا۔ کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے بعدازاں پاک فوج کو بھی جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ یہ جنگ جولائی تک جاری رہی۔ بھارتی فوج نے عددی برتری جدید ترین اسلحے سے فائدہ اٹھا کر پھر کارگل کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

کارگل جانے والی پاک فوج کے دستوں میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی یونٹ بھی شامل تھی۔ آپ نے معرکہ کارگل میں جام شہادت نوش کیا۔ زیر نظر مضمون ان کی شہادت کے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔ اب شہید کے والد میجر (ر) ضیا قادر بھی وفات پا کر رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے۔

www.pdfbooksfree.pk

کتابوں کے مطالعے میں گزارے۔ لیکن جب بھی سمجھانے کی کوشش کی، تو اس نے ایک ہی جواب دیا "ابا جان آپ کو اچھے نتائج چاہئیں، وہ آپ کو مل جائیں گے۔ آپ مجھ سے مطالعے کا شوق نہ چھینیے۔"

کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ کہ ذرا کی وجہ سے وہ کوئی نہ کوئی جنگی ناول لیے غسل خانے چلا جاتا۔ کافی دیر تک نہ نکلتا، تو والدہ کو فکر لاحق ہوتی۔ وہ چوری چھپے دھیمی آواز میں فیصل کو نکلنے کا کہتی۔ جب وہ نکلتا، تو پسینے سے شرابور ہوتا۔ نکلتے ہی والدہ سے کہتا کہ تھوڑا سا ناول رہ گیا تھا، وہ بھی پڑھ لینے دیتیں۔ نسیم حجازی کے ناول، فیصل ضیا محسن شہید کے پسندیدہ ناول نگار تھے۔ ان کے تمام ناول اور کردار اسے ازبر ہو گئے تھے۔ وہ چھوٹے بھائیوں سے ناولوں کے کرداروں کی جرأت و بہادری پر اکثر بحث کرتا۔

حضرت خالد بن ولید، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم اس کے پسندیدہ مسلمان جرنیل تھے۔ وہ اکثر کہتا کہ جب بھی قدرت نے موقع دیا، تو میں بھی ان کی طرح کے کارنامے انجام دوں گا۔ اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ وہ نہ صرف اچھا قاری بلکہ بہترین لکھاری بھی تھا۔ اپنی ڈائری روزانہ لکھتا جس میں دوران تربیت کے واقعات تفصیل سے درج کرتا۔

شہید کے والد مزید بتاتے ہیں کہ فیصل عام بچوں کی طرح بھارتی فلموں اور گانوں کا شوقین نہیں تھا بلکہ فارغ وقت مطالعے ہی میں گزارتا۔ ایک ذمے دار بیٹا تھا۔ اس کے ذمے جو کام لگایا جاتا، وہ نہایت خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا۔ وہ میرا بیٹا تھا اور دوست بھی۔ فوج میں شمولیت کے بعد ذمے داری کا احساس اس کی شخصیت کا خاصہ رہا۔ فیصل کو سفارش سخت ناپسند تھی۔ وجہ یہ کہ اس سے حق دار کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسکول سے لے کر فوج میں جانے تک ہر امتحان کا سامنا فیصل نے از خود کیا اور کسی جگہ میری سفارش نہیں لی۔ فوجیوں کی زندگی حق تلفی اور ناانصافی ختم کرنے کے لیے ہی وقف ہے۔ فوج میں اگر کوئی سفارش کا سہارا لے، تو وہ اپنے عظیم مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔

میجر ضیا قادر بتاتے ہیں "میں گزشتہ ۲۳ سال سے سگریٹیں پینے کے باعث سگریٹ نوشی کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن فیصل نے یہ کہہ کر میرے سگریٹ چھڑوا دیے "ابو تمباکو نوشی اچھی بات نہیں۔" میں نے پھر آج تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ میں بیٹے فیصل کا کہا ٹال بھی سکتا تھا۔ لیکن بیٹے کی نصیحت میں کیا مصلحت پنہاں تھی کہ میں اس سے صرف نظر نہیں کر سکا۔ میرا بیٹا بہت ذہین تھا، ہمیشہ ہر امتحان میں اول آتا۔ شہادت کا جام پی کر بھی اس نے عسکری امتحان میں اول پوزیشن لی جس پر بلاشبہ مجھے فخر ہے۔

شہید کی والدہ کا کہنا ہے "بے شک شہادت عظیم اعزاز ہے جو ہمیں فیصل کی بدولت حاصل ہوا۔ میں جب فیصل شہید کی تصویر پہ نگاہ ڈالوں، تو اس کی آنکھیں اور ہونٹ ہلتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید وہ مجھے یہ کہتا ہے کہ امی جان! میں جنت میں بہت خوش و خرم ہوں اور مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اس کی جدائی ناقابل برداشت ہے۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے تسلی ہوتی ہے کہ بیٹے نے بھی کشمیری مسلمان بہنوں اور ماؤں کی آبرو بچانے کے لیے اپنی جان دی۔ میرے خاندان کے کئی لوگ فوج میں موجود ہیں۔ لیکن محسن خاندان کا یہ پہلا شہید ہے جسے ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا"۔ یہ نشان حیدر کے بعد سب سے بڑا فوجی اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت انجینئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد امدادی کام شروع ہوا، تو میں نے بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر بارسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چناں چہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام تسلی بخش تھا۔ جلد ہی مجھے ایگزیکٹو انجینئر بنا کر موتی باری بھیج دیا گیا۔

اس جگہ پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقع ملا۔ دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹیں چھپانے کے لیے دری بچھا دی گئی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا جہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت چپراسی کے علاوہ عملے میں آٹھ کے قریب دیگر ملازمین بھی شامل تھے۔

جب با اصول اور عزت دار نے کیا

ایک روپے کا سوال

انسان دوستی اور لافانی محبت کے خمیر سے گندھی طرح دار کہانی

بلونت سنگھ

www.pdfbooksfree.pk

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کر دیے، وہاں بیکاروں کے لیے روزی کے دروازے بھی کھول ڈالے۔ کئی اشخاص کے لیے یہ سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لایا۔ جب شام کو ہم لوگ سیر کرنے نکلتے، تو جگہ جگہ دھرتی ماتا کو نہنگ کی طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ درازوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح میں دفتر پہنچا، تو رگوناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہو گئے تھے۔ پہلے رگوناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا، لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے، میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے۔

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے چپراسی خبر لایا کہ پنڈت دینی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ گھر چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائی بھی دے گیا تھا۔ میں نے بلوالیا، اس پر رگوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دینی دیال سینما کے "پاس" لایا تھا۔ وہ شہر کا متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اتنی چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہا، دھکے دے کر باہر نکلوادوں۔ میری بے اعتنائی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دُور از کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا، وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھتے کی اینٹوں کی سفارش کروں۔

صاحبِ تحریر

ہندوستان کے جن غیر مسلم قلم کاروں نے اردو افسانہ کو پروان چڑھایا، ان میں بلونت سنگھ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں چل بسے۔ آپ نے پنجاب کے رسوم و رواج، روایات اور معاشرتی زندگی کو نہایت خوبی سے اپنے افسانوں میں موضوع بنایا۔ وہ انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات کو افسانوں میں چابک دستی سے بیان کرتے تھے۔ خوددار ان کے فن کا نمائندہ افسانہ ہے۔

میرا دھیان رگوناتھ کی طرف تھا۔ وہ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا بلکہ دوسرے تو سب نوجوان تھے۔ دسویں پاس اسٹینوگرافر، نشست و برخاست میں سلیقہ مند، بات چیت میں ہوشیار، مجھے رگوناتھ پر ہی بھروسا تھا۔ وہ ہمیشہ رک رک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اُسے دیکھ کر لگتا کہ وہ ایک ذمے دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اسے کام بھی زیادہ کرنا پڑتا۔

ملازمت کے لیے وہ براہ راست مجھے ملنے آیا تھا۔ اس دن دوپہر کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگوناتھ کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت لینے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ایک

www.pdfbooksfree.pk

کتاب لینے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھے رگھوناتھ واپس جاتا دکھائی دیا۔ کھدر کا نیل لگا ہوا پائجامہ، انگلش ٹویڈ کا پرانا گرم کوٹ اور سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی۔ گھٹنے کے قریب اس کے پائجامے میں ابھار سا پیدا ہوگیا تھا۔ اسے دیکھ کر خیال آیا، بیچارا بوڑھا شخص ہے، اس کو بلا لینا چاہیے۔ چناں چہ نوکر بھیج کر بلوا لیا۔

جب اس کے چہرے خصوصاً نیچے کو لٹکتی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی، تو مجھے اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد پر معذرت چاہی۔ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لیے آیا تھا اور ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کارروائی نیز دفتری خط کتابت میں اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

میں نے اسے شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا اور اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیے۔ پہلے وہ متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا وزری ڈاکٹر کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہو جانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی۔ کیونکہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ بیٹوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا۔

لیکن جب برے دن آئیں تو آنکھ جھپکتے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ بھرا پرا گھر بری طرح تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، زلزلے نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ گھر کے سب افراد کو یکجا کر کے کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی، اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی، بیوہ بہن اور اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ صرف بڑا لڑکا بچا، لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کر دی، لیکن موت کے چنگل سے نہ بچا سکا۔۔۔۔ اس کی آپ بیتی سن کر میرا دل بھر آیا۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا ’’رگھوناتھ جی، اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کا حوصلہ اور ثابت قدمی دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں۔‘‘

وہ اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگا۔ ’’نوازش ہے جناب کی۔۔۔۔‘‘ قدرے سکوت کے بعد مجھ سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے بولا۔۔۔۔ ’’لیکن میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔۔۔۔ میں بھول جاتا ہوں کئی باتیں۔۔۔۔‘‘

وہ رخصت ہوا، تو میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہوگیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ مجھے تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمے دار شخص موجود ہے۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمے دار شخص ہوں، اسی لیے اس قسم کے اشخاص پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمے دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھے رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دورے پر چلا جاتا۔ میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑبڑ نہ ہوتی۔

رگھوناتھ کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کا کالر اس پر چڑھائے چھپائے رکھتا۔ کبھی

www.pdfbooksfree.pk

ایسا بھی ہوتا کہ فائل لیے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رُک جاتا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے۔ کبھی کبھی بوسیدہ کف کوٹ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کے بازو کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھے پتا نہ چلے، لیکن میری متجسس نگاہوں سے کوئی حرکت پوشیدہ نہ تھی۔

دیوی دیال باتیں کیے جا رہا تھا لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ چناںچہ جس قدر جلد ہو سکا، میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک رگھوناتھ کا منتظر رہا، لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بہانے سے چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی کے آگے کھڑا لمبے لمبے کش لیتا رہا تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے، میں اتنا مصروف بھی نہیں، وہ چاہے، تو آ کر مجھ سے بات کرے۔ اس کے بعد کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا۔ کھانا بھی دفتر ہی میں منگوایا لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہو جانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپراسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں کے قریب سے ہو کر جاتے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ ابھی کام کر رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا ''کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت بھی آرام نہیں فرمایا... اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے......''

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا ''آپ بزرگ ہیں، خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے... آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو، تو کل کر لیجیے۔''

''جی بس اب چلا جاؤں گا... آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟''

''جی ہاں میں ایک صاحب کا منتظر ہوں۔''

رگھوناتھ ادھر ادھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا ''آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہیے تو کرسیاں نکلوا دوں۔''

میں رگھوناتھ کے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ کچھ اس لیے اور کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ بھی کبھی پدرانہ لہجے میں باتیں کرنے لگتا تھا۔

''نہیں رگھوناتھ جی، میں ذرا یہ کاغذات دیکھوں گا۔''

قیاس سے معلوم ہوتا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کچھ تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی نامکمل عمارت، فرنیچر، ٹھیکیداروں، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اوورسیئر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں ہمہ تن گوش تھا... ''اچھا... تو... اگر آپ اجازت دیں... میں جا سکتا ہوں۔''

میں مایوس سا ہو گیا۔ ''ضرور، ضرور...'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے کھانس کر چھڑی اٹھائی۔ ٹوپی سر پر درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''رگھوناتھ جی!''

''جی'' وہ واپس چلا آیا۔ اور میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ ''کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر یونہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے مبہم سی آواز نکلی۔

''کہیے نا۔''

''میں... میں...'' اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ ''مجھے...''

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ کوئی حرج نہیں، تشریف رکھیے۔''

وہ بیٹھ گیا۔ مجھے منتظر پا کر وہ آہستہ سے بولا ''میں بہت شرمسار ہوں۔''

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ''رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کر دی... توبہ!''

لاٹھی سے فرش بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لے کر بولا۔ ''مجھے ایک روپیہ درکار ہے...''

''ایک روپیہ؟'' میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا ''شاید آپ کو یاد ہو۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین ساڑھے تین مہینے پہلے کی بات ہے...''

ایک روپیہ؟... وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پر غور و خوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا۔ ''اس دن بینک کا چپراسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے پھر مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے، تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔'' وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ ''اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں... سچ پوچھیے تو میں بھول چکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں، میرا حافظہ کمزور ہو چکا... لیکن کل شام مجھے نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آ گئی۔ مجھے امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے۔''

مجھے یاد آ گیا۔ رگھوناتھ پر مجھے بے اعتمادی نہیں تھی۔ افسوس اس امر کا تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھولا کیوں؟ وہ روپیہ... لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے واپس کر دیا تھا، اسی دن شام کو۔ یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔

رگھوناتھ اس جرأت کے لیے معذرت کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ لکھا تھا، اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا۔ میں نے یادداشت کے لیے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا۔ اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے انگریزی میں نوٹ لکھ دیا۔

میں اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمے دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ ''رگھوناتھ جی میں نے وہ روپیہ...''

''میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمائیے، شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی ورنہ میں ایک روپیہ کے لیے تقاضا نہ کرتا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

بارگاہِ ایزدی میں مناجات

تیرے در پہ جب کوئی بھولا بھٹکا بندہ آتا ہے
فضل و کرم تیرا ہی اس کو سیدھی راہ دکھلاتا ہے

خالق کا مخلوق سے اپنی رشتہ بڑا پرانا ہے
پالن ہار ہے خلقت کا وہ سارے جگ کا داتا ہے

تجھ کو اپنے دل کا سارا حال سناتے رہتے ہیں
تیرے وہ بندے کہ جن کا تجھ سے سچا ناتا ہے

غم کے اندھیاروں کے اندر رستہ جب کھو جاتا ہے
بھولے بھٹکے راہی کو پھر منزل تو دکھلاتا ہے

دنیا کے آلام کے ہاتھوں جو کوئی ہمت ہار گیا
لطف و کرم تیرا ہی مولا اس کی آس بندھاتا ہے

لے لیتی ہے رحمت تیری اس کو اپنے ہاتھوں میں
جو کوئی تیری یاد میں چپکے چپکے نیر بہاتا ہے

جل تھل کر دیتی ہے تیری رحمت دنیا والوں کو
نیلی چھت کی چھتری سے جب اپنا مینہ برساتا ہے

یوں تو تیری قربت سے محروم کوئی انسان نہیں
ڈھونڈنے والا سچے دل سے تجھ کو آخر پاتا ہے

خادمؔ بھی رہتا ہے ہر دم طالب تیری بخشش کا
ورنہ بے حد وزنی اس کی بدعملی کا کھاتا ہے

(خادم بلاغوی، اسلام آباد)

اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

"نہیں نہیں رکھو نا تھ جی، معمولی بات ہے۔" یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ "شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلب گار، تو مجھے ہونا چاہیے۔"

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ "آپ سے کیا چھپانا... کل سے روٹی نہیں پکی... آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں... بس یہ تھی اصل بات... ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت کیا... میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر واپس دے دیجیے گا۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ "میں نے آپ کو گھر کی حالت اس لیے بتائی کہ آپ ایک روپیہ کے لیے تقاضا کرنے پر مجھے اوچھا اور بیچ نہ سمجھنے لگیں۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔ "میں ایک بااصول اور عزت دار شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کروں۔ لیکن میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ ایک کوڑی کا قرضدار بننا منظور کیا۔ اس لیے آخری عمر میں بھی اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا..."

میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ کچھ پیشانی سے پسینا پونچھتا پردہ ہٹا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے لافانی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

روایت ہے، یونانی سپہ سالار اسکندر اعظم ہمیشہ کی زندگی پانا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ "آب حیات" کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، یعنی ایسا پانی جسے پی کر وہ ہمیشہ کی زندگی پا سکے۔ دوران سفر اسے حضرت خضرؑ مل گئے۔ لہٰذا وہ اکٹھے سفر

www.booksp
www.urdumovie

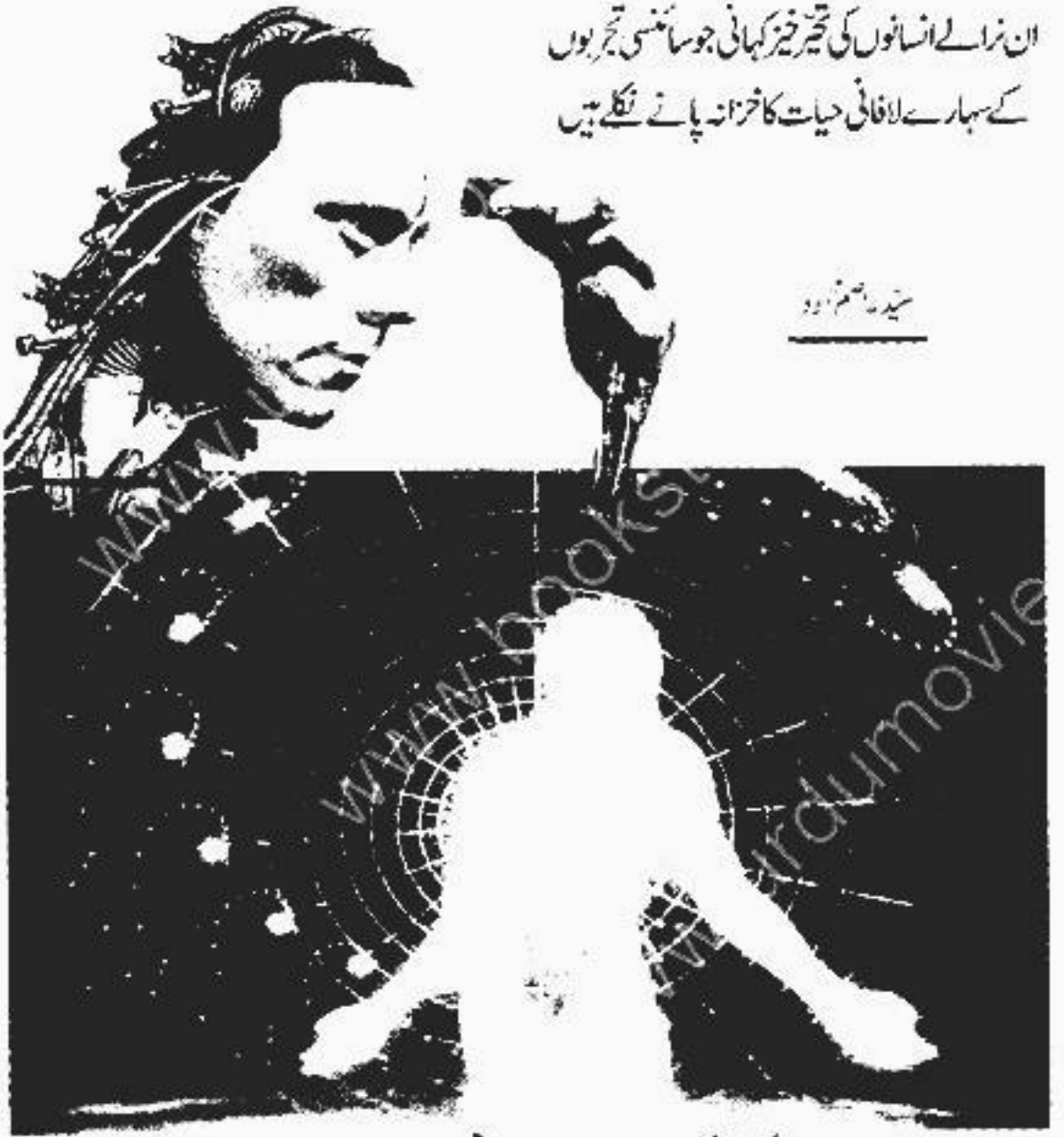

www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگے۔ چلتے چلتے وہ بحرِظلمات پہنچے جہاں سورج کی روشنی کا کوئی گزر نہ تھا۔

اسکندر اعظم تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا، لیکن حضرت خضر اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کے باعث آب حیات تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے پھر آب حیات نوش کیا اور ہمیشہ کی زندگی پائی۔ گویا اب حضرت خضر تاقیامت زندہ رہیں گے۔

یہ تو صدیوں پرانی روایت تھی۔ مگر دورِ جدید کا انسان بذریعہ سائنس ہمیشہ کی زندگی پا لینے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہا ہے۔ بعض سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ وہ ایسی کمپیوٹر نما مشین ایجاد کرلیں جس میں انسانی روح سما سکے۔ دیگر ماہرین طب ایسی ادویہ بنانا چاہتے ہیں جو انسان کی عمر زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ اس جدوجہد میں اب محققوں کو نامی گرامی اور امیر شخصیات کی مدد حاصل ہو رہی ہے۔

مثال کے طور پر امریکی کمپنی، پے پال (Paypal) کے شریک بانی، کھرب پتی پیٹر تھیل کو لیجیے۔ وہ کم از کم ۱۲۰ سال تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ دیگر کھرب پتی افراد کے مقابلے میں اس کی تمنا خاص نہیں لگتی۔ روسی انٹرنیٹ کا ''گاڈ فادر'' دیمتری اسکلوف ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مشہور امریکی سافٹ ویئر کمپنی، اوریکل کے شریک بانی، لیری ایلیسن کو یقین ہے کہ مستقبل میں انسان لافانی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ گوگل کا شریک بانی، سرگی برن بھی ''موت سے دو دو ہاتھ'' کرنے کی آرزو رکھتا ہے۔

دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں شامل یہ شخصیات مذاق نہیں کر رہیں اور نہ ہی ان کی باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ وجہ یہی کہ کئی ماہرین طب ایسی تحقیقات میں محو ہیں جو مستقبل میں زندگی اور موت کے معنی ہی بدل ڈالیں گی۔

لافانی حیات کی تلاش

ہزارہا سال قبل جب باشعور انسان کا ارتقا ہوا اور وہ عقل و تدبر پا کر آدمی بنا، تو اس کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا... ہمیشہ کی زندگی کیونکر پائی جائے۔ وہ کون سا طریقہ ہے کہ انسانوں کو موت نہ آئے اور انھیں لافانی حیات مل جائے۔

تاریخ افشا کرتی ہے کہ مختلف چینی ریاستیں فتح کر کے مملکت چین کی بنیادیں رکھنے والا پہلا بادشاہ، قن شی ہوانگ بھی ہمیشہ کی زندگی چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے حکیموں و وزیروں کو ''آب حیات'' ڈھونڈنے کا حکم دیا۔

اس زمانے میں پارہ (Mercury) دریافت ہوا، تو اسے جادوئی مادہ سمجھا گیا۔ چناں چہ حکیموں نے پارے سے گولیاں بنائیں اور چینی بادشاہ کو یہ کہہ کر تھما دیں کہ ان کے ذریعے وہ لافانی انسان بن جائے گا۔ مگر ۲۱۰ سال قبل مسیح قن شی صرف پچاس سال کی عمر میں عالم بالا جا پہنچا۔ یوں وہ لافانی حیات پانے کی تمنا کا پہلا مشہور شکار بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

رفتہ رفتہ انسان ترقی کے مدارج طے کرنے لگا، مگر ہمیشہ کی زندگی پانے کا خیال اس کے دامن سے وابستہ رہا۔ کیتھولک عیسائیوں کا ۲۱۳ واں پوپ، انوسینٹ ہشتم بھی لافانی حیات کا طلبگار تھا۔ اس نے ایک یہودی ڈاکٹر، گیاکوموڈی سان سے مشورہ کیا۔

ڈاکٹر گیاکومو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ تین نو دس سالہ لڑکوں کا خون پیے۔ یوں ان لڑکوں کی جوانی اس میں منتقل ہو جائے گی۔ وہ جوان تو کیا ہوتا، انسانی خون نے اس کے جسم میں زہریلے اثرات پیدا کر ڈالے۔ چناں چہ ۲۵/ جولائی ۱۴۹۲ء کو وہ چل بسا۔

۱۸۶۸ء میں امریکا میں حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ریاست کنٹکی کے ایک سیاست داں، لیونارڈ جونز نے امریکی صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ جونز نے انتخابی مہم اس نعرے پر چلائی کہ وہ عبادت کرکے اور بھوکا رہ کر ہمیشہ کی زندگی پا چکا۔ اگر امریکی عوام نے اسے صدر منتخب کیا، تو وہ لافانی حیات پانے کے گر انھیں بھی بتا دے گا۔ افسوس کہ امریکیوں نے اسے منتخب نہیں کیا... اور اگلے ہی سال بیچارا نمونیے سے چل بسا۔

ان لرزہ خیز تاریخی حقائق کے باوجود دورِ جدید کے بعض کھرب پتی ہمیشہ کی زندگی پا کر ہر قیمت پر اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اسی لیے پیٹر تھیل نے حال ہی میں ایک غیر منافع بخش تحقیقی ادارے، میتھوزلا (Methuselah) فاؤنڈیشن کو ۳۵ کروڑ روپے (۳۵ لاکھ ڈالر) کی خطیر رقم عطیہ کی۔ اس امریکی ادارے سے منسلک سائنس داں ایسی ادویہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو بڑھاپا پیدا کرنے والی سات جسمانی وجوہ کا خاتمہ کر سکیں۔ یہ وجوہ درج ذیل ہیں:

خلیوں کی کمی، خلیوں کا حد سے زیادہ تقسیم ہونا (Excessive Cell division)، خلیوں کا بے وقت مر جانا، خلیوں میں کوڑا کرکٹ بھرنا، خلیوں کے باہر فضلہ جمع ہونا، مائٹو کونڈریا (Mitochondria) یعنی خلیے کے بجلی گھر میں تبدیلیاں اور خلیوں کے سالمات (Molecules) میں بڑھتا تال میل۔

چوہوں کے تجربے سے بڑھاپا روک پروٹین جی ڈی ایف اا دریافت ہوا

میتھوزلا فاؤنڈیشن کے محققوں اور دیگر ماہرینِ طب کا خیال ہے کہ انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ لہٰذا وہ ایک ڈھانچا رکھتا ہے تاکہ روزمرہ کے تمام فعل بخوبی انجام دے سکے۔ جب اسی ڈھانچے کے کل پرزے استعمال سے ناکارہ ہو جائیں، تو وہ بکھر جاتا ہے... گویا موت انسان کو آن دبوچتی ہے۔ لیکن ادویہ کی مدد سے خلوی و سالماتی سطح پر اس ڈھانچے کی مرمت کر دی جائے، تو وہ پھر ٹھیک طرح کام کرنے لگے گا۔ گویا انسان کو نئی زندگی مل جائے گی۔

لیکن سرگئی برن کے کالیکو (Calico) کمپنی منصوبے کے سامنے میتھوزلا فاؤنڈیشن کی تحقیق معمولی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کمپنی ادویہ ساز امریکی ادارے، ایب وائی (Abbvie) کے تعاون سے "بڑھاپا روک دوا"

www.pdfbooksfree.pk

بنانا چاہتی ہے۔ اور مرتی بدن اس منصوبے پہ "کھربوں روپے" (اربوں ڈالر) خرچ کرنے کو تیار ہے۔

گوگل کے مالکان اپنے منصوبے بہت خفیہ رکھتے ہیں۔ تاہم امریکی میڈیا یہ جاننے میں ضرور کامیاب رہا کہ کیلیکو کے سائنس داں فوکس او ۳ (Fox03) نامی جین جیسا اثر رکھنے والی دوا ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن انسانوں میں درج بالا جین ہو، وہ طویل عمر پاتے ہیں۔ گویا فوکس او ۳ کا اثر رکھنے والی دوا کھا کر ہر انسان اپنی عمر بڑھا سکے گا۔

امریکا اور یورپ میں کئی ادارے انسان کو لافانی بنانے والے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں امریکی ادارے "ایلیسن فاؤنڈیشن فار میڈیکل ریسرچ" کو تمام اداروں میں ممتاز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۹۵ء میں امریکی سرمایہ دار، پال ایلیسن نے قائم کیا تھا۔

۲۰۰۰ء سے ایلیسن فاؤنڈیشن ہر سال ان محققوں میں بذریعہ "ایلیسن ایوارڈ" ساٹھ لاکھ روپے تقسیم کرتی ہے جو بڑھاپا روک ادویہ پر مفید کام کر رہے ہیں۔ یہی ادارہ ایک اور ادارے، ایلیسن میڈیکل فاؤنڈیشن سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ دونوں ادارے ان سائنس دانوں کو کھلے دل سے امداد دیتے ہیں جو موت کو شکست دینے والی ٹیکنالوجی تیار کرنے پر جتے ہیں۔

ایک انوکھا تجربہ

۱۹۵۶ء میں ایک امریکی سائنس داں، کلائیو میکے نے کارنیل یونیورسٹی کی لیبارٹری میں خاصا عجیب تجربہ کیا۔ اس نے دو چوہے لیے اور انھیں بذریعہ آپریشن پہلو کی جانب سے باہم سی دیا، گویا انھیں جڑواں بنا ڈالا۔ یوں وہ دونوں چوہوں میں خون کا نظام مشترک ہو جاتا تھا۔

اس تجربے کی خاصیت یہ تھی کہ ایک چوہا تو نوجوان، چونچال اور چست و چالاک تھا۔ جبکہ دوسرا بوڑھا، لاغر اور تقریباً مرنے کے قریب تھا۔ لیکن جونہی دونوں کا دوران خون مشترک ہوا، بوڑھے چوہے میں حیرت انگیز تبدیلیاں آنے لگیں۔ کھال پر سے جھریاں دور ہو گئیں اور وہ نوجوان دکھائی دینے لگا۔ دوسری طرف نوجوان چوہے پر بڑھاپا چھا گیا۔

تھری ڈی پرنٹر میں بننے والا [illegible] انسانی کان

۱۹۵۶ء میں سائنس داں خون کی کیمیائی ہیئت کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ کلائیو میکے کا تجربہ حیرت افزا تھا، مگر وہ یہ نہیں جان سکا کہ بوڑھا چوہا کیونکر جوان ہوا۔ اسی لیے امریکی محقق نے حراروں (کیلوریز) کی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اسی تحقیق سے دریافت ہوا کہ جاندار کم حرارے کھائے تو اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم خون کا تجربہ بھلا دیا گیا۔

اڑتالیس سال بعد ۲۰۰۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک محققہ، ایمی ویگرز نے کلائیو کے تجربے کی بابت پڑھا۔ ایمی بھی بڑھاپا روک ٹیکنالوجی پر تحقیق کر رہی تھی۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

نے فیصلہ کیا، وہ بھی متوفی محقق کا تجربہ دہرا کر دیکھے گی کہ کیا نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے۔

ایمی ویگرز نے بھی نوجوان اور بوڑھے چوہوں کو پہلو سے سی دیا۔ یوں ان کا بھی دوران خون یکساں ہو گیا۔ اس تجربے کے ذریعے بھی بوڑھا چوہا چند ہی دنوں میں نوجوان بن گیا۔ جبکہ نوجوان چوہے پہ بڑھاپا چھانے لگا۔ ایمی نے چوہوں کے خون پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ جان سکے، کیا شے بوڑھے چوہے کو نوجوانی کا تحفہ عطا کرتی ہے۔

مختلف چوہوں پر تجربات کرنے کے بعد آخر ایمی نے ان کے خون میں "جی ڈی ایف ۱۱" (GDF-11) نامی پروٹین دریافت کیا۔ یہی پروٹین بوڑھے چوہے کو جوان بنا ڈالتا تھا۔ مزید تحقیق نے انکشاف کیا کہ یہ پروٹین بنیادی (Stem) خلیوں کو متحرک کرتا ہے۔

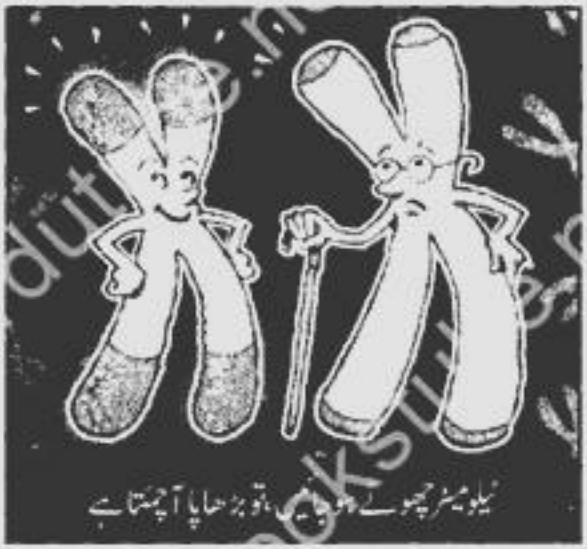
ٹیلومیئر چھوٹے ہو جائیں، تو بڑھاپا آ ٹپکتا ہے

دنیا کے ہر جاندار میں بنیادی خلیے ہی بافتوں (ٹشوز) کی مرمت کرتے ہیں۔ ایمی کو تحقیق سے پتا چلا کہ رفتہ رفتہ جاندار پر بڑھاپا چھائے، تو اس چوہے میں جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ تب بنیادی خلیے بھی عمر رسیدہ ہو کر اپنا کام درست طریقے سے انجام نہیں دے پاتے۔ یوں بافتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور مرمت نہ ہونے کے باعث جاندار میں بڑھاپے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ایمی ویگرز نے تحقیق جاری رکھی اور نت نئے انکشافات سامنے آتے گئے۔ معلوم ہوا کہ انسانی نوال میں بھی جی ڈی ایف ۱۱ پروٹین ایک جین کی صورت پایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ ایک چوہا یا انسان چاہے کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس میں بنیادی خلیے موجود رہتے ہیں۔ گو جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار کم ہونے کے باعث وہ تقریباً بے اثر ہو جاتے ہیں۔

لیکن نوجوان خون جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار رکھتا ہے۔ اسی لیے جب بوڑھے چوہوں کو نوجوان خون ملا، تو جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار پا کر ان کے بنیادی خلیے دوبارہ متحرک ہو گئے۔ وہ پھر بافتوں کی مرمت کرنے لگے اور انھیں دوبارہ "جوان" بنا دیا۔ جب اعضا کی بافتیں جوان ہوئیں، تو چوہوں میں خود بخود شباب عود کر آیا اور وہ بڑھاپے کے دور سے نکل آئے۔ جی ڈی ایف ۱۱ کے کرشماتی کردار پر مزید تحقیق جاری ہے۔

۲۰۰۵ء میں امریکا کا مشہور سائنس داں، ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہو بھی بوڑھے چوہوں پہ تجربات کرنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کن طبی طریقوں سے ان کا بڑھاپا روکنا ممکن ہے۔ ڈاکٹر رونالڈ کی دلچسپی کا مرکز ٹیلو میئر (Telomere) تھے۔ یہ ہر ڈی این اے کے اختتامی سرے ہیں، جیسے تار کے سروں پر پلاسٹک باندھ کر انھیں بند کر دیا جاتا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کے جسم میں ایک خامرہ (Enzyme)، ٹیلومیری (Telomerase) ٹیلومیئروں کو صحت مند اور پائیدار رکھتا ہے۔ یوں ہر ڈی این اے انسانی بدن میں بخوبی اپنی ذمے داریاں انجام دیتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ لیکن بوڑھا ہونے پر جسم میں ٹیلومیری کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ تب ٹیلومیئر بھی چھوٹے ہونے لگتے ہیں اور یوں ڈی این اے اپنا کام صحیح طرح نہیں کر پاتے۔ اسی خرابی سے بڑھاپے کی ظاہری خصوصیات جنم لیتی ہیں اور ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہوان کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر رونالڈ نے اپنی ٹیم کے ساتھ جینیاتی طور پر ایسی چوہیا پیدا کی جس میں ٹیلومیری خامروں کو حسب منشا بے حس یا سرگرم کرنا ممکن تھا۔ جب چوہیا نوجوان ہوئی، تو ایک دن ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے بدن میں موجود سبھی ٹیلومیری خامروں کو بے حرکت کر دیا۔

جب ٹیلومیئروں کو اپنی خوراک نہیں ملی، تو وہ ناکارہ ہونے لگے۔ ان کی خرابی نے دیکھتے ہی دیکھتے چوہیا کو نوجوانی ہی میں بوڑھا کر دیا۔ اس کے بال جھڑ گئے، کمال لٹک گئی، دماغ سوکھ گیا اور ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ غرض وہ گور کنارے جا پہنچی۔

جب چوہیا مرنے کے قریب تھی، تو ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے ٹیلومیری خامروں کو دوبارہ سرگرم کر دیا۔ بعدازاں جو کرشمہ ظہور پذیر ہوا، اس نے سبھی کو متحیر کر ڈالا۔ چوہیا کے مرجھائے اعضا پھر تندرست و توانا ہونے لگے۔ دماغ کی جسامت بڑھ گئی۔ بال بڑھے اور چمک دار ہو گئے۔ غرض بڑھاپے کی تمام نشانیاں دور ہو گئیں۔ گویا جانور کے جسم میں ٹیلومیری خامروں نے آب حیات جیسا کام کر دکھایا۔

سائنس داں اب جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیری، دونوں پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ اب انسانوں پر تجربات کر کے ان کے کمالات دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہ دونوں انسان کی عمر میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں گے اور مستقبل کا انسان بیمار ہوئے بغیر طویل عرصہ زندہ رہ سکے گا۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسانوں میں غیر فطری طور پر جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیری کی مقدار بڑھانے کی سعی ہوئی، تو وہ غیر معمولی امراض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر رونالڈ اور دیگر ماہرین طب نے ان خدشات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

دیمتری اتسکوف اپنے پروگرام کے ساتھ

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کامیاب تجربات نے ثابت کر دیا، سائنسی طور پر انسان کی عمر بڑھانا ممکن ہے۔ یہ اضافہ دو تین عشروں سے لے کر چند صدیوں تک محیط ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ماہرین طب کے جوش و جذبے میں اضافہ کر چکی۔ دوسری طرف طویل عمر کا خیال فلسفیوں کو دنگ کر دیتا ہے۔ ایک برطانوی فلسفی، مائیکل اسمتھ کا کہنا ہے:

''اگر انسان ۸۰ یا ۹۰ سال کے بجائے ۴۰۰ سو برس تک زندہ رہنے لگا، تو زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آ جائے گا۔ تب ہمیں زندگی سے لے کر موت تک..... ہر شے کی نئے سرے سے تعریف کرنا ہوگی۔''

ایک تصور یہ ہے کہ اگر سائنس دانوں نے انسان کو دوبارہ نوجوان بنانے کا طبی طریقہ دریافت کر لیا، تو پھر کیا ہوگا؟ تب ہر انسان جیسے ہی بڑھاپے کی سرحد پر پہنچا، وہ

www.pdfbooksfree.pk

طبی طریقے کی مدد سے دوبارہ نوجوان ہو جائے گا۔ گویا اسے ایک طرح سے ہمیشہ زندہ رہنے کا لائسنس مل سکتا ہے۔ تب دل کا اچانک تھم جانا یا دماغی شریان پھٹنے ہی سے وہ بمشکل "موت کے منہ میں پہنچے گا۔

تقریباً ہمیشگی کی یہ زندگی اپنے جلو میں مثبت اور منفی، دونوں قسم کے پہلو رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر تب سبکدوشی کا عمل ختم ہو جائے گا۔ انسان صحت مند رہ کر تا عمر کام انجام دے گا۔ معاشرے میں بیمار اور بوڑھے نظر نہیں آئیں گے۔ شادیاں بھی کئی سو سال چلیں گی۔ غرض انسانی عمر میں اضافہ کئی عجیب و غریب حقائق کا موجب بنے گا۔

ایک اور ندرت کی وجہ سے مستقبل میں انسان کو یہ فکر بھی نہیں رہے گی کہ اس کا خراب دل، گردے یا جگر اسے قبر میں دھکیل دے گا۔ وجہ یہ کہ اب ایک طرف لیبارٹریوں میں نامیاتی مادوں کے ذریعے انسانی اعضا "اگائے" جا رہے ہیں، تو دوسری سمت تھری ڈی پرنٹر میں جگر اور گردے تیار ہونے لگے ہیں۔ ماہرین کا تیسرا گروہ بنیادی خلیوں سے انسانی اعضا تیار کرنے میں لگا ہے۔ غرض مستقبل قریب میں انسانی اعضا کی اتنی کثرت ہوگی کہ جوں ہی کسی کا دل خراب ہوا، وہ بازار سے نیا خرید لے گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے، بڑھاپے کو دور رکھنے کے لیے مستقبل کے انسان کو بہت پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ کبھی وہ اپنا جگر بدلوائے گا، تو کبھی گردہ! پھر اس پر یہ خطرہ بھی منڈلاتا رہے گا کہ اگر وہ اسپتال سے دور ہوا اور یک دم دو سو سالہ دل جواب دے گیا تو قصہ تمام!

درج بالا خرابیاں مدنظر رکھ کر بعض سائنس دان جسم کا بکھیڑا ہی ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یعنی جسمانی ڈھانچے سے وابستہ ساری پریشانیاں ہی ختم ہو جائیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم منصوبہ "۲۰۴۵ انشی ایٹو" (2045 Initiative) ہے۔ اسے کھرب پتی روسی، دیمتری اتسکوف کی مالی مدد حاصل ہے۔

۲۰۴۵ انشیٹیو کی بنیاد چار سال قبل رکھی گئی اور اس منصوبے سے ماہرین کی متاثر کن تعداد منسلک ہو چکی۔ یہ ماہرین روبوٹکس اور دیگر جدید ترین سائنسی شعبوں سے

غزل

تیری باتیں تیرے دن رات تو کچھ اور کہتے ہیں
میرے ہمدم ترے حالات تو کچھ تو اور کہتے ہیں

ہمارے سنگ رہنے کی تیری حسرت بجا لیکن
تیرے یہ خوبصورت ہاتھ تو کچھ اور کہتے ہیں

میں کیوں اخبار کی خبروں کو اب سچ مان لوں صاحب
میرے شہروں کے سب حالات تو کچھ اور کہتے ہیں

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اب بات کر ظالم
تیرے گزرے ہوئے لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں

جو دن میں فلسفہ ہوتا ہے یارو شیخ صاحب کا
مگر پھر رات کو وہ بات تو کچھ اور کہتے ہیں

تیرے وعدوں کو میں اب کس طرح سچ مان لوں جاناں!
تیری باتیں، تیرے جذبات تو کچھ اور کہتے ہیں

بظاہر خوش نظر آتے ہیں یہ سب لوگ جو حسنینؔ
کسی پھر غمزدہ نغمات تو کچھ اور کہتے ہیں

(حسنین اقبال منہاس، سبی، بلوچستان)

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی منزل یہ ہے ۲۰۴۵ء تک انسانی دماغ کو گوشت پوست والے ڈھانچے سے نکال کر روبوٹ یا ہولوگرافک ہیولے میں منتقل کر دیا جائے۔

درج بالا منصوبہ بظاہر کسی دیوانے کی بڑ لگتی ہے، مگر یہ اتنا بھی مضحکہ خیز نہیں۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں ماہرین ''مشین نما انسانی ڈھانچا'' (Artificial humanoid body) بنانا چاہتے ہیں جسے ''اوتار'' کہا جائے گا۔ ساتھ ہی ''ایڈوانسڈ برین کمپیوٹر انٹرفیس سسٹم'' بھی ایجاد کیا جائے گا۔ مدعا یہ ہے کہ انسانی دماغ اس انسانی ڈھانچے میں نصب ہو کر اس سے روزمرہ کے سارے کام کرائے۔

منصوبے کے دوسرے مرحلے میں ماہرین مصنوعی دماغ بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں انسان کا شعور منتقل ہوگا۔ گویا مصنوعی دماغ کی ایجاد کے بعد انسان حقیقی طور پر ہمیشہ زندہ رہ سکے گا۔ اور یہ حیرت انگیز منزل زیادہ دور نہیں۔

دنیا کے کمپیوٹر کی دیو ہیکل امریکی کمپنی، انٹل ۲۰۱۸ء تک ''ایکسا سکیل'' (Exascale) کمپیوٹر تیار کرنا چاہتی ہے۔ ایسی غیر معمولی مشین جو انسانی دماغ جتنی رفتار سے کام کرے گی۔ یاد رہے، ہمارا دماغ ''فی سیکنڈ دو کروڑ ارب پیمائش'' کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے، اتنی زیادہ پیمائش کرنے کے لیے انتہائی ترقی یافتہ اور جدید ترین کمپیوٹر تخلیق کرنا پڑے گا۔

ایک اہم سوال

سائنس کی بے پناہ ترقی دیکھتے ہوئے یقین آتا ہے کہ پچاس، سو، دو سو سال بعد انسان کسی نہ کسی ذریعے سے زندہ جاوید صورت اختیار کر لے۔ تاہم یہ پریشان کن سوال اپنی جگہ رہے گا: ''کیا ہم واقعی لافانی ہونا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں، تو کیوں؟''

اس سوال کا جواب دیمتری اتسکوف کچھ یوں دیتا ہے: ''میں جوا کھیلتا، ویٹ لفٹنگ کرتا، نشانے بازی آزماتا اور تیراکی سے دل بہلاتا ہوں۔ لیکن میں ہر مشغلہ آزمانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مجھے کم از کم دس ہزار سال کی زندگی درکار ہے۔ یوں میں اپنی ساری نا آسودہ تمنائیں پوری کر سکوں گا۔''

لیری ایلیسن کا نقطہ نظر جدا ہے۔ وہ بڑھاپے سے وابستہ اذیت و بے چارگی سے خوف کھاتا ہے جو بالآخر موت پر منتج ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے: ''میری ماں سرطان کے باعث چل بسی تھی۔ میں نے رفتہ رفتہ ان کا جسم گھلتے اور موت کی نذر ہوتے دیکھا۔ یہ ایک ہولناک تجربہ تھا جس سے میں دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا۔''

اخلاقیات اور مذاہب کے ماہر سائنس دانوں کی کوششوں کو مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے، جدید انسان اس لیے اپنی عمر بڑھانا چاہتا ہے تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے اسے مزید وقت مل جائے۔ حالانکہ انسان کو جتنی بھی عمر ملے، اس کا مقصد زندگی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسے باتقویٰ اور نیکیاں کر کے گزارے۔

انسان نے عمر خضر پائی، تو مستقبل کے انسانوں کو ایک اور گمبھیر مسئلے سے پالا پڑے گا۔ وہ یہ کہ جب کسی کو موت نہیں آئی، تو رفتہ رفتہ زمین پر اربوں انسان آباد ہو جائیں گے۔ تب ان کی خوراک، رہائش، لباس وغیرہ کا بندوبست کیسے ہوگا؟ کیا ارضی وسائل ان اربوں انسانوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے؟ یہ شاید تب انسان کے لیے سب سے اہم سوال بن جائے۔

ایک انہونے واقعے نے جنم دیا

من کا بوجھ

اپنی مدد آپ کے سنہرے اصول کی
سچائی عیاں کرتی چشم کشا داستان

جاوید بسام

انسان کا ذہن بسا اوقات نمایاں اور انوکھی باتیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کا اثر اس طرح لیتا ہے کہ بے سکونی آ پہنچتی ہے۔ اس دن میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ رات آٹھ بجے میں کام سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں کچھ سامان بھی تھا۔

ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔ وہ ایک گھر سے بڑی بڑی پلاسٹک بوتلوں میں پانی بھر کر ہتھ گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک لڑکا بولا "انکل! یہ بوتل ذرا گاڑی میں رکھ دیں۔"

کسی کے کام آ کر جو خوشی ملتی ہے، اس کا الگ ہی مزا ہے۔ میں نے فوراً بوتل اٹھا کر گاڑی میں رکھ دی۔

لڑکا بولا "ایک اور سر!"

میں نے دوسری بوتل بھی اٹھائی۔ میرا خیال تھا اب وہ مزید اٹھانے کا نہیں کہیں گے۔ لیکن وہ بولا "ایک بوتل اور رکھ دیں۔"

میری کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا "بھئی کیا یہ سب مجھ سے ہی اٹھواؤ گے؟"

"اچھا رہنے دیں۔" وہ بولا۔

میں آگے بڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں منہ چھپا کر ہنس رہے ہیں۔ میں نے اس حرکت کی کوئی خاص پروا نہ کی۔ چند قدم چل کر کانوں میں پھر آواز آئی، تو بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ وہ کسی اور راہ گیر کو روک کر اسے بوتلیں

www.pdfbooksfree.pk

اٹھانے کا کہہ رہے تھے۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا پھر سونے لیٹ گیا۔ عموماً لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے۔ لیکن اس دن میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ میری طبیعت بے چین تھی اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور۔ دماغ میں خیالات گھوم رہے تھے، خاص طور پر وہ لڑکے مجھے بار بار یاد آنے لگتے۔ ان کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا جس نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

اپنا کام دوسروں سے دھڑلے سے کرانا اور پھر اس پر فخر بھی، کچھ عجیب سی بات تھی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، لیکن ایسا ہوا تھا۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا، یہ حقیقت تھی۔ ان کی اس حرکت سے میرا ذہن منتشر ہو گیا۔ مجھے لگا کہ ایسا ایک واقعہ میرے ساتھ پہلے بھی پیش آ چکا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر میں نے اپنے دماغ سے تمام خیالات نکالے اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔

میرا ذہن گھوم پھر کر دوبارہ اسی طرف چلا جاتا۔ نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ آخر میں خود کو تسلیاں دینے لگا کہ وہ ابھی کم عمر ہیں۔ بچے شرارتی بھی ہوتے ہیں، جب سمجھ آئی، تو یہ روش تبدیل ہو جائے گی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ بچپن کی منفی باتیں بڑے ہونے پر مثبت میں بدل جاتی ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا۔ کوئی مبہم سی یاد تھی جو ماضی کے اندھیرے میں کہیں چھپی تھی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک ذہن میں کھڑکی سی کھلی اور مجھے تیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں تب بھی اسی علاقے میں رہتا تھا۔ جب یہاں کی آبادی بہت کم تھی۔ خالی میدان دور تک نظر آتے۔ بس اسٹاپ بھی گھر سے دور تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آیا، تو آنکھوں کے سامنے گویا فلم سی چلنے لگی۔ شام کا وقت تھا۔ میں کہیں سے آ رہا تھا۔ اسٹاپ پر بس رکی، تو بہت سے لوگ اترے۔ میں نے ان لوگوں میں آگے جاتے ہوئے دو لڑکوں کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے کندھوں پر ایک ایک آٹے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

ان دنوں آٹے کی قلت تھی۔ لوگوں کو آٹا دور دراز راشن ڈپو سے لانا پڑتا۔ میں ان لڑکوں کو جانتا تھا۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے اور میرے دوست صادق کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی عمریں یہی کوئی دس گیارہ سال ہوں گی۔ وہ کندھوں پر بوجھ اٹھائے میدان میں تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور جلد ان تک پہنچ گیا۔ قدموں کی چاپ سن کر انھوں نے گھوم کر دیکھا اور ایک ساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا ”وعلیکم السلام، لاؤ ایک تھیلا مجھے دے دو۔“

میں نے چھوٹے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خیال تھا کہ وہ بے چون و چرا میری بات مان لیں گے۔ لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب بڑا لڑکا جلدی سے بولا ”نہیں بھائی جان! ہم لے جائیں گے۔“

”ارے بھئی میں کوئی غیر تو نہیں اور جا بھی اسی طرف رہا ہوں۔ آدھے آدھے راستے تم دونوں مجھے اپنا اپنا تھیلا اٹھانے دینا۔ اس طرح تمھیں سہولت ہو گی اور راستہ آرام سے کٹ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”نہیں، ہم تو پہلے بھی اسی طرح آٹا لاتے ہیں۔ ہماری امی کہتی ہیں کہ انسان کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا چاہیے۔“

میرے بڑھتے ہاتھ واپس لوٹ آئے۔ میں نے کہا ”ہاں دوست، تمھاری امی ٹھیک کہتی ہیں۔“

خیر میں ان کے ساتھ چلنے لگا۔ لیکن ان کے قدم مجھ سے تیز اٹھ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ مجھ سے آگے نکل گئے۔ میری نظریں ان پر جمی تھیں۔ دونوں بھائی بہت

www.pdfbooksfree.pk

ذہین اور فرماںبردار تھے۔ میرے اسکول ہی میں نچلی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ (صادق اور میں نے اسی سال میٹرک کا امتحان دیا تھا) ان کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ پرورش کر رہی تھیں۔ صدر میں ان کے شوہر کی ایک دکان تھی جس کے کرائے سے اب ان کی گزر بسر ہوتی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ وہ لوگ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور جگہ چلے گئے۔ میں نے پھر انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میرے دماغ کو سکون مل گیا، جیسے کوئی گتھی سلجھ گئی۔ پھر حیرت انگیز طور پر مجھے فوراً نیند بھی آ گئی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ میں نے کچھ کام نمٹائے۔ پھر خیال آیا کہ صادق سے ملے بہت دن ہو گئے، کیوں نہ آج اس سے ملاقات کی جائے۔ وہ ساتھ والی گلی ہی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں کسب معاش میں اس طرح مصروف تھے کہ صرف آتے جاتے حال چال پوچھ لیتے، ورنہ شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کی خبر ہوتی۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ گرم جوشی سے ملا، لیکن چپ چپ سا تھا۔ اس نے فوراً میرے لیے چائے بنوائی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں نے اداسی کی وجہ پوچھی۔

وہ بولا "بس یار اپنی ملازمت کے باعث پریشان ہوں۔ جہاں پچھلے دس سال سے کام کر رہا تھا، وہ کمپنی دبئی منتقل ہو گئی۔ دوسری ملازمت مل تو گئی لیکن تنخواہ کم ہے۔ بس گزارہ کر رہا ہوں۔ ہم لوگ پڑھ لکھ کر کچھ زیادہ نہ پا سکے۔"

میں نے کہا "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم وہ کچھ حاصل نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔"

وہ اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ آخر میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ میں نے پوچھا "صادق! تمھارے ماموں کے لڑکے آج کل کہاں ہیں؟"

وہ چونک کر بولا "نعیم اور کلیم کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ پُرجوش لہجے میں بولا "وہ لوگ گلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے اپنا بنگلہ بنا لیا ہے۔"

"اچھا، بہت خوشی ہوئی۔ وہ کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نعیم نے بی اے کیا تھا، وہ ایک فرم میں کام کرتا ہے۔ کلیم نے سائنس پڑھی اور مکینیکل انجینئر بن گیا۔ دونوں بہت محنتی تھے اور قسمت بھی ان کے ساتھ تھی۔ بھائی! ہمارے خاندان میں تو ان کی کامیابی اور خوشحالی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ کسی غیر کو بتاؤ تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تمھیں بھی یقین نہیں آ رہا ہوگا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں، مجھے یقین آ گیا بلکہ میرے ذہن میں ان کی کچھ اسی قسم کی تصویر تھی۔"

پھر میں نے اسے تیس سال پہلے پیش آنے والا واقعہ سنایا اور ساتھ ہی گزشتہ رات ہوئی ان لڑکوں کی حرکت بھی بتائی۔ وہ حیرت سے میری باتیں سن رہا تھا۔ پھر بولا "ہاں ہاں، ہمارے بچپن میں کسی سے اپنا کام کہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو اپنی مدد آپ کی تلقین کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل رویے بدل چکے۔"

"ہاں، اب اسے ذہانت اور ہوشیاری میں شمار کیا جاتا ہے۔ خیر چھوڑو، کیا خیال ہے، کسی دن ان دونوں سے ملنے چلیں؟"

وہ بے تامل بولا "ہاں ضرور، اگلی اتوار کو چلتے ہیں۔"

میں کچھ دیر اور بیٹھا رہا، پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ باہر نکل کر میں نے ایسی خوشی اپنے اندر امڈتی محسوس کی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات جو بوجھ ان دو بچوں نے مجھ پر ڈالا تھا، اسے تیس سال پہلے وہ آٹے کے تھیلوں نے ہٹا دیا جو مجھے اٹھانے نہیں دیے گئے تھے۔

◆◆◆

پچاس سال قبل مشہور سائنس داں، آئن سٹائن نے پیش گوئی کی تھی "تین قوتیں یہ دنیا تباہ کر سکتی ہیں: ہوس، بے وقوفی اور خوف۔" یہ سو فیصد درست قول ہے۔ خاص طور پر ہوس کا شکار انسان، تو شیطان بن جاتا ہے اور پیسا کمانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"جب تم بے حیا ہو جاؤ، تو پھر جو جی میں آئے، کرو۔" (روایت حضرت ابن مسعود، البخاری)

اب یہی دیکھیے کہ پچھلے چند برس سے بے حیا پاکستانی دکانوں میں کتوں، بلیوں اور گدھوں کا گوشت بیچنے لگے ہیں۔ اس گھناؤنے فعل کے پیچھے یہی مقصد

ہمارے بازاروں میں کھلے عام

گدھے کا گوشت کیوں بک رہا ہے؟

کھال کی مانگ نے راتوں رات پاکستانی گدھوں کو بیش قیمت بنا ڈالا

[illegible] خان

کارفرما ہے کہ جیسے تیسے پیسا کمایا جائے۔ خاص طور پر پچھلے ایک دو برس سے گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت خاصی مقدار میں فروخت ہونے لگا ہے۔ آئے دن یہ خبر آتی ہے کہ فلاں مقام پر قصائی گدھے کا گوشت بیچتے پکڑا گیا۔ یاد رہے، بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق جنگلی گدھے (Onager) کا گوشت حلال ہے۔ تاہم پالتو گدھے کا گوشت کھانا نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح حنفی گھوڑے کے گوشت کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ شوافع، حنابلہ اور مالکی کے نزدیک یہ حلال ہے۔

سوال یہ ہے کہ پچھلے چند برس سے یکایک گدھے کا گوشت اتنی زیادہ مقدار میں کیوں بکنے لگا؟ اس کی وجہ یہ ہے، پاکستانیوں کو معلوم ہو چکا کہ پڑوسی ملک، چین میں گدھے کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں وہ بیش قیمت شے کی حیثیت اختیار کر چکا۔

چین میں لوگ گدھے کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں اور اسی لیے وہ مہنگی غذا بن گیا ہے۔ چین میں گدھے کے ایک کلو گوشت کی قیمت "۱۶۰۰ روپے" ہے۔ کئی چینی صوبوں میں اس گوشت سے بنے برگر، کباب اور سموسے

www.pdfbooksfree.pk

رغبت سے کھائے جاتے ہیں۔

مزید برآں چین میں گدھے کے کھال کی چربی مختلف دیسی ادویہ اور سامان بار سنگھار میں ڈالی جاتی ہے۔ چین میں گدھے کی کھال سے بنی ایک کلو خالص چربی کی قیمت "دس ہزار روپے" ہے۔ درحقیقت اسے روایتی چینی طب میں استعمال ہونے والے تین اہم ترین اجزا میں شامل کیا جاتا ہے۔

چند سال پہلے کچھ چینی تاجر گدھے کی کھال تلاش کرتے کرتے پاکستان کے شہر قصور آن پہنچے۔ وہاں چمڑے کی بڑی منڈی واقع ہے۔ یہ چینی تاجر جانتے تھے کہ پاکستان میں گدھے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں گدھوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد ہے۔ (جبکہ چین اور بھارت میں بالترتیب ایک کروڑ اور پچھتر لاکھ گدھے پائے جاتے ہیں)

جب چینی تاجر قصور شہر کی منڈی پہنچے، تو وہاں گدھے کی کھال تین چار سو روپے میں دستیاب تھی۔ وطن عزیز میں بھیڑ، بکری کی کھال کے برعکس گدھے کی کھال سے خالص اشیا نہیں بنتیں۔ اسی لیے چمڑا مارکیٹ میں اس کی مانگ نہیں تھی۔ گدھے کی کھال کے چمڑے سے جوتوں کے تلوے بنتے ہیں یا ڈھول کی تانت۔

چینی تاجروں کو محض چند سو روپے میں گدھے کی کھالیں مل گئیں، تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ کیونکہ چین میں اس کھال کی قیمت کئی گنا زیادہ تھی۔ انھوں نے فوراً مارکیٹ میں موجود ساری کھالیں خرید لیں اور وطن واپس لوٹ گئے۔

چین جا کر انھوں نے دیگر تاجروں کو بتایا کہ پاکستان میں تو گدھے کی کھال بہت سستی ہے۔ چناں چہ مزید چینی خریدار پاکستانی منڈیوں میں آ پہنچے۔ انھیں صرف گدھے کی کھال درکار تھی۔ ادھر پاکستانی تاجروں نے چینیوں کی بڑھتی آمد دیکھی اور یہ بھی جانا کہ وہ "کھوتے" کی کھال مانگتے ہیں، تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔

تعلیم یافتہ پاکستانی تاجروں نے پھر مہمان چینی تاجروں سے پوچھ گچھ کی، کچھ انٹرنیٹ سے مدد لی۔ یوں ان پر انکشاف ہوا کہ چین میں تو گدھے کی کھال بہ حساب پاکستانی کرنسی کئی ہزار روپے میں بکتی ہے۔ اس حقیقت نے پاکستانی تاجروں کے کان کھڑے کر دیے۔

اب قصور اور لاہور کی چمڑا منڈیوں میں راتوں رات گدھے کی کھال کی قیمت بڑھنے لگی۔ یہ کھالیں عموماً چینی تاجر ہی خریدتے ہیں۔

چینی تاجروں کو دس ہزار روپے میں بھی گدھے کی کھال سستی پڑتی ہے، وجہ یہی کہ ایک کھال سے دو تین کلو چربی نکل آتی ہے۔ اسی لیے پاکستانی گدھے کی کھال مہنگی ہونے کے باوجود چین میں اس کی مانگ بدستور موجود ہے۔

چین میں گدھے کی کھال سے بنی چربی یا (جیلاٹن) "ایجیاو" (Ejiao) کہلاتی ہے۔ چین میں مشہور ہے کہ اس کے استعمال سے چہرے اور جسم کی جھریاں دور ہوتی ہیں۔ خون کی روانی بڑھتی ہے۔ چہرہ چمک دار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے گدھے کی کھال سے حاصل کی گئی یہ چربی زیبائش بنانے میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہے۔

پاکستان میں مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب لیڈروں اور چوروں کو پتا چلا کہ گدھے کی کھال دس ہزار روپے میں بکنے لگی ہے، تو وہ چوکنا ہو گئے۔ تب خصوصاً پنجاب کے دیہی علاقوں میں وہ سرگرم ہوئے اور غریب دیہاتیوں کے گدھے چرانے لگے۔

ان چوروں کو صرف کھال درکار ہوتی ہے، لہٰذا وہ گدھے کا گوشت اونے پونے داموں قصابوں کو بیچنے

www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے باعث پاکستانی بازاروں میں اچانک بڑی تعداد میں گدھے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ چور ہوں، قصائی یا گدھے کا گوشت خریدنے والے حرام خور ہوٹل والے، انھیں بس اپنی کمائی سے غرض ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ گوشت کھلا کر ہم وطن پاکستانیوں کا ایمان وصحت خراب کررہے ہیں۔

یہ ہوس پرست چور غریب دیہاتیوں کو بھی نقصان پہنچارہے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہمارے دیہی گھرانوں میں گدھا چھوٹے موٹے کارخانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسان ہو یا مزدور، وہ اس جانور سے دن بھر کئی کام لیتا ہے حتیٰ کہ بہت سے دیہاتی گدھے کی مدد ہی سے روزی روٹی کماتے ہیں۔ لیکن بے حس اور ظالم چور ان کے گدھے چرا انھیں زندہ درگور کردیتے ہیں۔

پچھلے دو برس میں فیصل آباد، گجرات، لالہ موسیٰ اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں آباد سیکڑوں دیہاتی اپنے گدھوں سے محروم ہو چکے۔ اسی لیے وہ اکثر شاہراہوں پر ٹریفک روک کر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں۔

حکومت پنجاب کو چاہیے، وہ پولیس کو سختی سے ہدایت دے کہ گدھا چوروں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ویسے دیہات میں آباد لوگ اب اپنے جانوروں کی زیادہ نگرانی کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح گدھا چوروں کے عزائم کے آگے بند باندھنا ممکن ہے۔

یہ چور گدھا چرا کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ پھر کھال اتار کر چمڑا منڈی میں فروخت کرتے ہیں۔ یوں وہ اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ اب گوشت بیچنے سے بھی انھیں آمدنی ہونے لگی ہے۔ اسی لیے وہ گدھوں کی چوری سے باز نہیں آرہے۔

یاد رہے کہ گدھے کا گوشت دیکھنے میں گائے یا بھینس کے گوشت سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم اس سے زیادہ تیز بو اٹھتی ہے۔ یہ اس حرام گوشت کی ایک بڑی نشانی ہے۔

◆◆◆

ادھار کا بدلہ

ایک دفعہ امام ابوحنیفہ کسی صحرا میں سفر کررہے تھے۔ ان کے پاس پانی ختم ہوگیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی، تو ریت کے بگولے اڑ رہے تھے۔ امام صاحب کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے انھیں ایک بدو مل گیا جس کے پاس پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ آپ نے اس سے پانی مانگا۔ بدو نے پہلے تو پانی دینے سے صاف انکار کردیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "اگر پانچ درہم دو تو یہ مشکیزہ تمھیں مل سکتا ہے۔"

امام صاحب نے پانچ درہم دے کر مشکیزہ لے لیا اور سیر ہوکر پانی پیا۔ پھر بدو سے پوچھا "بھائی میرے پاس کچھ ستو ہیں۔ کیا تم انھیں کھانا پسند کرو گے؟"

اس نے کہا "کیوں نہیں۔"

آپ نے اس کو ستو دے دیے جن میں خوب روغن زیتون ڈالا گیا تھا۔ بدو نے ستو خوب پیٹ بھر کر کھائے۔ پھر اسے بھی پیاس لگی۔ اس نے آپ سے پانی کا ایک پیالہ مانگا۔ امام صاحب نے فرمایا "پانچ درہم میں ملے گا، اس سے کم میں نہیں۔"

یوں بدو نے پانی کے بدلے میں جو پانچ درہم لیے تھے، اس کو واپس دینے پڑے۔

اس طرح امام ابوحنیفہ نے اس بدو کو سبق دیا کہ کسی ضرورت مند کے ساتھ نیکی خدا کو خوش کرنے کے لیے کرنی چاہیے نہ کہ پیسے کی خاطر۔ اگر وہ بدو خوشی سے پانی آپ کو دے دیتا، تو شاید آپ اسے پانچ درہم سے بھی زیادہ رقم انعام میں عطا فرماتے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، واربرٹن)

www.pdfbooksfree.pk

قدیم زمانے کا ذکر ہے کہ ایک نیم وحشی دراوڑ راجا بندھیاچل سے اس پار کی زمینوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ آریہ نسل نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں ہندوستان کے قدیم دراوڑوں کا خون موجزن تھا جس سے تاحال وحشت کی بو نہ گئی تھی۔ تاہم وہ بنگال، اودھ اور وسط ہند کے کھشتری راجاؤں کا ہم نبرد اور مہذب آریہ ورت کا ہمسایہ تھا۔ اس مقدس پڑوس نے خیالات کو متاثر ضرور کر دیا۔ اس لیے وہ فیاض تھا، تند مزاج بھی۔ آزاد خیال تھا، پرانی وحشیانہ رسموں کا پابند بھی۔ اس کی طبیعت تلون سے معمور تھی مگر حکم اٹل ہوا کرتا۔

وہ راجا تھا، مطلق العنان، اس لیے اپنے خیالات کو جب اور جس طریق سے چاہتا عملی جامہ پہنانے میں تامل نہ کرتا۔ اسے اپنی رائے پر پورا اعتماد تھا لہٰذا ہر کام اپنی رضامندی کے مطابق انجام دیتا۔ ایودھیا اور کپل وستو کے عظیم الشان درباروں کی طرح اس کا بھی ایک دربار تھا جس میں اپنی نیم وحشی رعایا میں سے اچھے اچھے رتن جمع کر رکھے تھے۔ ان سے مشورہ طلب بھی ہوتا مگر اپنی رائے کی مخالفت اسے پسند نہ تھی۔ تائید کلام سے بے حد خوش ہوتا لیکن اختلاف رائے برداشت نہ کرتا۔ مخالفت کا خیال بھی اسے اپنے درباریوں کی تمنائیں کو تباہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

بند دروازے میں سے کیا نکلا

شیر یا دوشیزہ......

نسوانی فطرت کی بھول بھلیاں اور پیچیدگیاں اجاگر کرتا معنی خیز فسانہ

فرینک سٹوکٹن / ابوالاثر حفیظ جالندھری

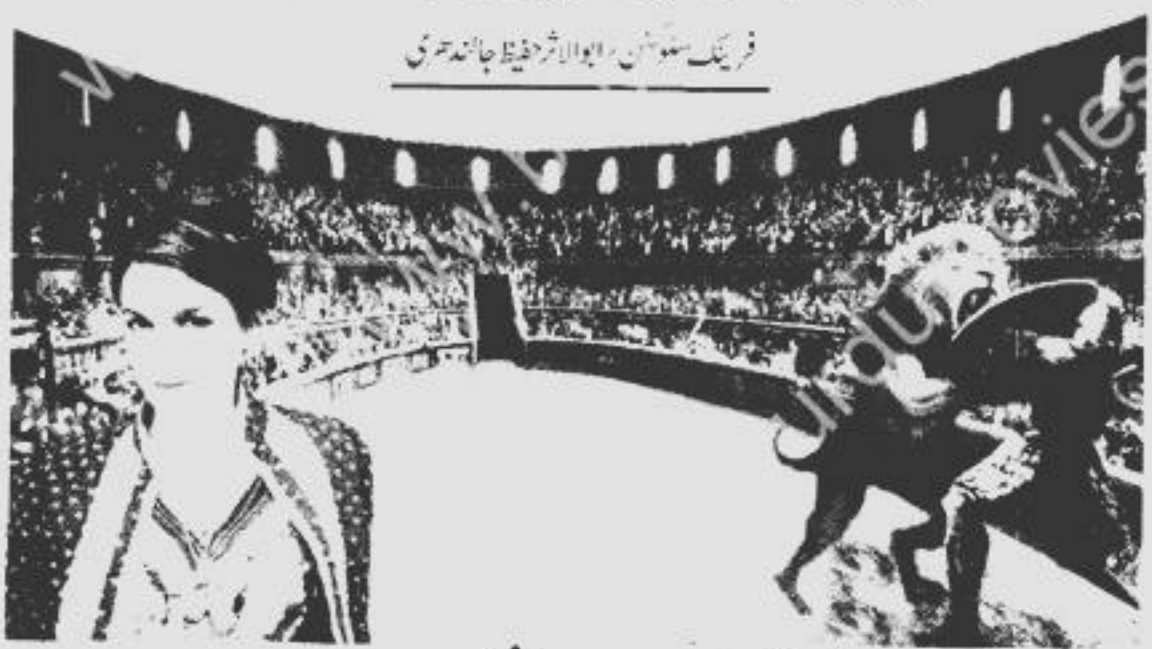

www.pdfbooksfree.pk

صاحبِ تحریر

امریکا کے ممتاز قلم کار، فرینک سٹوکٹن ۵/اپریل ۱۸۳۴ء کو دی وڈلینڈ نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ والد پادری تھے۔ فرینک بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھے، مگر باپ نے انھیں منع کر دیا۔ چناں چہ انھوں نے چوب کندہ کاری کا پیشہ سیکھا اور اس کی مدد سے گزر اوقات کرنے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں جب والد دنیا سے رخصت ہوئے، تب فرینک بے شمار کہانیاں لکھنے لگے۔ انھوں نے بچوں اور بڑوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور اخلاقی برائیوں مثلاً لالچ، تشدد، حسد وغیرہ کو موضوع بنایا۔ ان کی نمائندہ کہانی ''دی لیڈی اور دی ٹائیگر'' آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ فرینک سٹوکٹن نے ۲۰/اپریل ۱۹۰۲ء کو وفات پائی۔

ہمسایہ قوم کے پرتو نے اس کی جہالت کو کسی قدر زائل کر دیا۔ اپنے ہم عصر سورماؤں کے بہادرانہ اشغال کے مقتبے میں اس نے بھی اپنی راجدھانی میں ایک تماشا گاہ قائم کی تھی۔ وہاں وہ انسانی اور حیوانی درندگی کے نظارے دکھا کر نیم وحشی رعایا کو اپنے وقت کی تہذیب سے آراستہ کرنے میں بے حد دلچسپی لیتا۔

لیکن تماشا گاہ میں بھی اس کی بے باک وحشت اور وہم خیالی نے ملی جلی جدت پیدا کر دی۔ یہ تماشا گاہ اس لیے نہیں بنائی گئی تھی کہ لوگ وہاں آ کر جمع ہو کر وہ تلواریوں کو لڑتے اور پھر ایک و زخموں سے نڈھال ہو کر مرتے دیکھیں یا اس کی بے ربط گفتگو سنیں۔ نہ اس لیے کہ ایک خونخوار ہیبت ناک درندے کے مقابل کسی بے دین راہب کا حشر دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ بلکہ تماشا گاہ کی بنیاد کا مقصد ان باتوں سے بلند تر تھا۔ وہ یہ کہ لوگوں کے ذہنی قویٰ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع کیا جائے۔

تماشا گاہ کا منڈپ اپنے پیچیدہ برآمدوں، پراسرار اور پوشیدہ دالانوں اور بھول بھلیوں سے بھی زیادہ عجیب النظیر گزرگاہوں کے سبب شاعرانہ عدل و انصاف کا ایک دلچسپ ذریعہ تھا۔ جب رعایا کا کوئی فرد ایسا مجرم ٹھہرایا جاتا جس سے خود راجا کو دلچسپی ہو، تو اعلان کر دیا جاتا کہ فلاں روز اس کی قسمت کا آخری فیصلہ شاہی اکھاڑے میں ہوگا۔

اکھاڑہ تماشا گاہ کے وسیع منڈپ کا مناسب نام تھا۔ گرچہ اس کی ساخت کسی دور دراز تہذیب کا پتا دیتی مگر راجا نے اس کے استعمال میں بھی جدت پیدا کر دی۔ وہ پرانے زمانے کے کارناموں کو وقیانوسی خیالات سے زیادہ قعت نہ دیتا۔ وہ اپنی اختراعات کو مناسب اور ہر شخص کے لیے قابل عمل خیال کرتا۔

مقررہ دن جب لوگ اکھاڑے کے وسیع برآمدوں میں جمع ہو جاتے، تو راجا بھی اپنے گراں ڈیل اور نیم عریاں درباریوں کے جھرمٹ میں برآمد ہوتا اور سب سے بڑی عدالت کے سنگھاسن پر بیٹھ جاتا۔ ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور وحشیانہ نعروں کی گونج مہیب چپ چاپ سے بدل جاتی۔ اس وقت راجا اشارہ کرتا۔ اشارے پر سنگھاسن کی نچلی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا جاتا اور مجرم اکھاڑے میں داخل ہوتا۔

راجا کے عین مقابل دیوار میں ایک ہی طرح کے دو بند دروازے بنائے گئے تھے۔ مجرم کا فرض تھا کہ عدالت عالیہ کے سامنے پس و پیش کیے بغیر ان کی طرف بڑھے اور دونوں میں سے ایک دروازہ کھول دے۔

www.pdfbooksfree.pk

دروازے کا انتخاب مجرم کی اپنی خوشی اور پسند پر تھا۔ اس پر نہ تو کسی قسم کا جبر و تشدد روا رکھا جاتا نہ رہبری کی جاتی، بلکہ فیصلہ نہایت عادلانہ طور پر مجرم کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایک دروازہ کھلنے پر خوفناک، ظالم اور بھوکا شیر برآمد ہوتا۔ وہ دروازے سے گرجتا ہوا نکلتا اور نہتے بدنصیب مجرم پر جھپٹا مار چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔ یہی اس مجرم کی سزا سمجھی جاتی۔

جب مجرم کی قسمت یہ فیصلہ کرتی، تو لوہے کے گھڑیال ماتمی انداز سے شور مچاتے۔ اکھاڑے کے باہر چاروں طرف اُجرت پر بلائے ماتمی اپنی دردناک چیخوں اور سنکھ دھوتو دھوتو کی پکار سے افسوس کا اظہار کرتے۔ عام تماشائی گردن جھکائے افسردہ صورت بنائے آہستہ آہستہ اپنے گھر لوٹ جاتے۔ ان کے دلوں میں مقتول کے حسن و شباب یا بزرگی و عزت کا احساس لہریں مارتا نظر آتا۔

لیکن جب مجرم دوسرا دروازہ کھول لیتا، تو اس میں سے ایک کم سن دوشیزہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس دوشیزہ کا بے حد حسین ہونا لازمی تھا۔ راجا اپنی سلطنت میں سے خود انتخاب کرتا۔ دوشیزہ کی شادی اس مجرم کے ساتھ کر دی جاتی۔ اس امر کو مجرم کی معصومیت کا انعام خیال کیا جاتا۔

اس حالت میں یہ پروا نہیں کی جاتی کہ مجرم کی پہلے بھی کوئی بیوی ہے یا نہیں۔ خواہ وہ کسی عورت کو دل و جان سے ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔ راجا اپنے عطیے کے مقابلے میں کسی بات کا خیال نہ کرتا تھا۔

شادی کی رسمیں اسی وقت اکھاڑے کے اندر راجا کے سامنے ادا کی جاتیں۔ راجا کے اشارے سے فوراً ایک اور دروازہ کھلتا۔ لمبے لمبے بالوں والے پجاری گویّوں اور ناچنے والی کنواری لڑکیوں کو لیے باجے گاجے کے ساتھ اس جوڑے کے قریب پہنچتے۔ شادی کا اہتمام نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا۔

رسوم کے خاتمے پر گھڑیال بجتے۔ تمام لوگ اپنی وحشیانہ اچھل کود سے خوشی کا اظہار کرتے اور معصوم مجرم اپنی نئی دلہن کے ساتھ گھر روانہ ہو جاتا۔ راستے میں لڑکے لڑکیاں ان پر پھولوں کی برکھا کرتے جاتے۔

راجا کی عدالت کا یہی نیم مہذب فیصلہ تھا۔ اس طریق عمل کی خوبی ظاہر ہے۔ مجرم کسی طرح یہ سمجھ نہ پاتا کہ عورت کس دروازے سے برآمد ہوگی۔ وہ اپنی خوشی سے ایک دروازہ کھول دیتا۔ اسے اس بات کی مطلقاً خبر نہ ہوتی کہ اب شادی سے ہمکنار ہوں گا یا موت سے!

اب تک جتنے واقعات گزرے تھے، ان میں شیر کبھی ایک دروازے سے برآمد ہوتا اور کبھی دوسرے سے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو واقعی مجرم پاتا تو چشم زدن میں اسے سزا مل جاتی۔ اگر وہ معصوم ظاہر ہوتا، تو دوشیزہ کو پسند کرے یا ناپسند، اسے راجا کے فیصلے سے، بائی مل ہی نہیں سکتی تھی۔

اکھاڑہ مشہور مقام تھا۔ جب لوگ اہم فیصلے کے دن وہاں جمع ہوتے، تو انھیں اس امر کا بالکل علم نہ ہوتا کہ وہ ایک مجرم کا قتل دیکھیں گے یا شادی! یہ لاعلمی ان کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیتی۔ تماشائی پرجوش اور بے تاب نظر آتے۔ اکثر اپنے ذہن سے کام لیتے اور اُوٹ پٹانگ قیاس دوڑاتے۔ لیکن فیصلے پر الزام نہ دھرتے کیونکہ ان کے خیال میں فیصلہ مجرم کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔

اس وحشی کے پکے نیم مہذب راجا کی ایک بیٹی بھی تھی۔ وہ حسین و جمیل تھی اور آرام و آسائش سے رہتی۔ راجا قدرتی طور پر اس لڑکی کو سارے جہان بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

اس کے درباریوں میں ایک نوجوان معزز قبیلے سے

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتا تھا۔ اور یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے کہ اکثر درباری نوجوان شہزادیوں کے دامِ محبت میں پھنس کر صدمے اٹھاتے رہے ہیں۔ چناں اس نوجوان پر بھی راجا کی بیٹی فریفتہ تھی۔ اسے اپنے محبوب کی جاں نثاری پر پورا بھروسا تھا کیونکہ وہ ساری مملکت میں بہادری، خوب صورتی اور مردانگی میں بے نظیر تھا۔ وہ اسے انتہائی گرمی وشوق کے ساتھ چاہتی تھی، اس حد تک کہ چاہت میں تشدد کا جذبہ بھی موجود تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ دل سوز اور پُرجوش بنانا چاہتی تھی۔ اس آتشیں عشق کا سلسلہ مدت تک جاری رہا، لیکن ایک وقت آیا کہ راجا پر یہ راز افشا ہوگیا۔

اس نے اپنے فرائض ادا کرنے میں زیادہ تامل نہیں کیا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر نوجوان کو حراست میں لیا اور مقدمے کی تحقیقات کے لیے آخری دن مقرر کر دیا۔ یہ دن واقعی یادگار تھا۔ رعایا اور خود راجا اس مقدمے کی تحقیق میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا تھا کہ ایک غلام خاص راجا کی بیٹی سے محبت کرنے کی جرأت کا مرتکب ہو۔ شاید دنیا کے آغاز میں یہ بات معمولی خیال کی جاتی ہو مگر ان قوموں کے لیے معاملہ نہایت اہم تھا۔

خونخوار جلادوں نے تمام سلطنت کے پنجرے دیکھے بھالے تاکہ سب سے زیادہ تند، ظالم اور ہیبت ناک شیر منتخب کیا جاسکے۔

ادھر نسوانی فن کے بڑے بڑے ماہروں نے ملک کی دوشیزاؤں میں سے ایک بہترین حسین دوشیزہ تلاش کی تاکہ نوجوان کی قسمت کا ستارا اسے معصوم ثابت کردے، تو اس الزام کی نسبت سے اتنا ہی بڑا انعام بھی دیا جائے۔

البتہ ایک بات سب پر ظاہر تھی۔ یہ کہ ہر شخص جانتا تھا، الزام قطعاً درست اور سچا ہے۔ مجرم نے راج کماری سے محبت کی۔ اس سے نہ وہ جوان انکار کرتا تھا نہ راج کماری۔ لیکن راجا اس ظاہر ثبوت کی رو سے فیصلہ کر کے اپنی عدالت کے دستور کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مقررہ دن آن پہنچا۔ قرب و جوار کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ تماشا گاہ ہجوم سے بھر گئی۔ یک کثیر التعداد انبوہ جسے اندر جگہ نہ مل سکی، اکھاڑے کے باہر جمع ہوگیا۔

راجا اور اس کے درباری ہم صورت دروازوں کے بالمقابل متمکن ہوئے۔ سب کچھ تیار تھا۔ لوگوں کی سرگوشیاں ایک گہرے سکوت میں چھپ گئی تھیں کہ راجا نے اشارہ کیا۔ شاہی نشستوں کے نیچے بنا دروازہ کھلا اور راج کماری کا جاں نثار اکھاڑے میں داخل ہوا۔

سروقد، وجیہہ، جیسل، خوش وضع، خوش اطوار بانکے نوجوان کے لیے تماشائیوں کے دلوں میں خوشی اور رنج، دونوں قسم کے جذبات ابھر آئے۔

آدھی سے زیادہ خلقت کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا شاندار انسان بھی ان کے درمیان رہتا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ ایسے نوجوان سے کسی شہزادی کا محبت کرنا اچنبھے کی بات نہیں لیکن اس کا امتحان کی جگہ موجود ہونا خطرناک ہے۔

جب نوجوان نے اکھاڑے میں قدم رکھا، تو دستور کے مطابق وہ راجائی تعظیم کے لیے جھکا۔ لیکن اس نے راجا کی موجودگی کا مطلق احساس نہ کیا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت راج کماری پر جمی ہوئی تھیں جو راجا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھی تھی۔

اُف اس عورت کی فطرت کتنی بے باک تھی ورنہ شاید وہ ایسے وقت یہاں موجود نہ ہوتی۔ مگر اس کی روح میں ایک تڑپ تھی اور محبت کی آگ نے اسے یہ نظارہ دیکھنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

جب یہ اعلان ہوا کہ اس کا محبوب امتحان کے اکھاڑے میں اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کرے گا، تو اس کے لیے دن رات برابر ہو گئے۔ شہزادی نے سوائے اس خاص امر کے کسی بات سے سروکار نہ رکھا۔ اس کے پاس دولت اور حکومت تھی۔ اس اونچی عدالت میں اس سے پہنچی تھی۔ اسے دروازوں کے راز معلوم تھے۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ دونوں دروازوں کے پیچھے کس طرف کس کمرے میں بھوکا شیر خوفناک دانت نکالے کھڑا ہے اور کس کمرے میں حسین دوشیزہ بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔

راج کے پرانے محل کے دروازے جن میں موٹے پردے لٹک رہے تھے، کسی قسم کا شور یا آواز سنائی دینے کے لیے ہرگز ناقابل تھے۔ لیکن زور، زر اور عورت کے جذبۂ محبت نے ساری حقیقت آشکار کر دی۔ اسے نہ صرف یہ معلوم تھا کہ دوشیزہ کس دروازے کے پیچھے اس کے عاشق کی منتظر ہے، بلکہ یہ بھی خبر تھی کہ وہ دوشیزہ کون ہے؟

وہ دوشیزہ جو نوجوان مجرم کی بے گناہی کے صلے میں منتخب ہوئی تھی، دربار کی تمام لڑکیوں سے بدرجہا خوبصورت اور دلربا تھی۔ خود راج کماری اسے خوبصورت سمجھتی تھی لیکن اس سے نفرت بھی کرتی۔ اس نے بارہا دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ نازک اندام حسینہ محبت بھری نظروں سے اس کے محبوب کو دیکھا کرتی ہے۔ بعض اوقات راج کماری کو محسوس ہوتا کہ اس کی نگاہیں کامیاب لوٹ رہی ہیں۔ اس کا محبوب بھی پیغام محبت کا جواب دے رہا ہے۔ کبھی کبھی اس نے انھیں گفتگو کرتے بھی دیکھا۔ یہ گفتگو جو سرسری اور بہت مختصر ہوتی تھی، ممکن ہے کہ نہ موافق پہلوؤں پر ہو لیکن راج کماری کس طرح جان سکتی تھی؟

راج کماری کے محبوب پر نگاہیں ڈالنے والی لڑکی محبت کی دیوی تھی لیکن راج کماری اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی انتہائی وحشت کے ساتھ اس لڑکی سے نفرت کرتی۔ اب وہی لڑکی اس وقت سامنے کے دروازوں میں سے ایک کے پیچھے پوشیدہ تھی۔

جب محبوب نے مڑ کر اس طرف دیکھا، تو دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس وقت راج کماری سب سے زیادہ سفید اور زرد رو نظر آتی تھی۔ اردگرد بے نقاب چہروں میں کوئی بھی اس سے زیادہ بے حس و حرکت نہ تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو ایسے تیز جذبے سے دیکھا جو انھی دلوں کا خاصہ ہوتا ہے جن کی روحیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہوں۔ راج کماری جانتی تھی کہ کون سے دروازے کے پیچھے کیا ہے۔ نوجوان کو بھی یقین تھا کہ وہ ضرور جانتی ہے۔ نوجوان عاشق اپنی محبوبہ کی محبت بھری فطرت کو سمجھتا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ میری نگاہیں دروازوں کا سربستہ راز معلوم کیے بغیر راج کماری کے چہرے سے نہیں ہٹیں گی۔ وہ راز جو تمام تماشائیوں کی نظروں سے پنہاں تھا۔ نوجوان کو پوری امید تھی کہ شہزادی یہ معمہ حل کرنے میں کامیاب ہو چکی۔

نوجوان کی متجسس، آرزومند اور پرشوق نگاہ نے پوچھا "کدھر؟"

راج کماری پر یہ استفسار اس طرح واضح ہوا گویا نوجوان نے پورے زور سے پکارا ہو۔ ایک بھی ساعت ضائع نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سوال بغیر آنکھ جھپکائے صرف نگاہ کی لطیف جنبش کے ذریعے پوچھ گیا اور جنبش نگاہ ہی اس کا جواب ہو سکتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

راج کماری نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا۔ اس کی روشن آنکھوں میں سے نگاہ نے داہنی جانب جنبش کی۔ اس لطیف اشارے کو راج کماری کے محبوب کے سوا کوئی نہ دیکھ سکا۔ نوجوان کی آنکھوں کے سوا ہر فرد و بشر کی آنکھیں سامنے کے دروازوں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ مڑا اور مضبوط قدموں کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازوں کا درمیانی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دلوں کی حرکت بند ہوگئی۔ سانس رک گئے۔ آنکھیں آئینہ کی طرح اس پر جم گئیں۔ وہ بنا پس و پیش داہنی دروازے کی سمت بڑھا اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے کھول دیا۔

اب کہانی کا آخری معمہ یہ ہے کہ اس دروازے میں سے شیر نکلا یا دوشیزہ؟ ہم سوال پر جتنا غور کریں اسی قدر اس کا حل مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اس سوال کا حل انسانی قلب کے مطالعے میں ہے اور اسی نے ہمیں جذبات کے پُراسرار گورکھ دھندے میں پھنسا دیا۔

کہانی پڑھنے والو! اس سوال کے جواب پر غور نہ کرو، بلکہ اس پُرجوش اور نیم وحشی راج کماری کے دل کا مطالعہ کرو جس کی روح مایوسی کی سفید آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔ وہ بار بار سوچتی "میں نے اسے کھو دیا لیکن اس کو کون حاصل کرے گا؟"

آج سے پیشتر اپنی مرکز تفتیش کے آغاز پر وہ بارہا وحشت ناک خوابوں سے چونک گئی ہوگی۔ اس نے کئی بار یہ خیال آتے ہی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا ہوگا کہ اس کا محبوب وہ دروازہ کھول رہا ہے جس کے دوسری جانب بھرا ہوا شیر اس کا منتظر ہے۔

کئی مرتبہ اس کے تصور نے اپنے محبوب کو دوسرے دروازے پر دیکھا اور درد و کرب سے دانت پیس لیے ہوں گے۔ اپنے بالوں کو نوچا ہوگا۔ اس خیال سے کہ میرا محبوب اپنی خوشی سے ایسا دروازہ کھول رہا ہے جس کے پیچھے ایک بے انتہا حسین دوشیزہ ہے۔

تصور ہی تصور میں اپنے عاشق کو پُراشتیاق نگاہوں سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیکھ کر راج کماری کا دل رقابت کی آگ سے جل اٹھا ہوگا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے افسردہ جسم کو نئی روح سے جگمگاتے دیکھا اور عوام الناس کو خوشی کے نعرے لگاتے سنا ہوگا۔ کبھی خیال کیا ہوگا کہ شیر اس کا جسم چیر پھاڑ رہا ہے۔ تب اس کی چیخیں نکلی ہوں گی۔ کبھی پجاری نے اپنے روبرو اسے ایک دوسری لڑکی کا خاوند بنتے دیکھا ہوگا۔ کبھی اس کی بڑی کڑکتی اور لوٹتی دکھائی دی ہوں گی اور کبھی اس پر پھولوں کی برکھا ہوتی نظر آئی ہوگی۔

ان تصورات کے ہنگاموں میں اس کی روح مایوسانہ آہ میں غرق ہوئی ہوگی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسی وقت مر جاؤں اور اگلی دنیا میں اپنے محبوب کا انتظار کروں جہاں اسے مجھ سے چھینا نہیں جا سکتا۔

اس نے نگاہ کی ایک ہی جنبش سے اپنا فیصلہ سنا دیا مگر یہ فیصلہ کرنے کے لیے اس نے کئی اندوہناک دن اور راتیں بسر کیں۔

وہ جانتی تھی کہ مجھ سے سوال کیا جائے گا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ میں کیا جواب دوں گی۔

اس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنا نازک ہاتھ داہنی جانب پھیر دیا مگر اس فیصلے کا نتیجہ جاننا آسان نہیں۔ دروازے میں سے کیا نکلا! دوشیزہ یا شیر؟ آپ خود اس سوال پر غور کریں، میں اس معمے کو حل کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ورلڈ کپ کی وبا

جو چار سال بعد آئے، تو پاکستان میں زندگی کا پہیہ جام کر ڈالے

عائشہ ظاہر

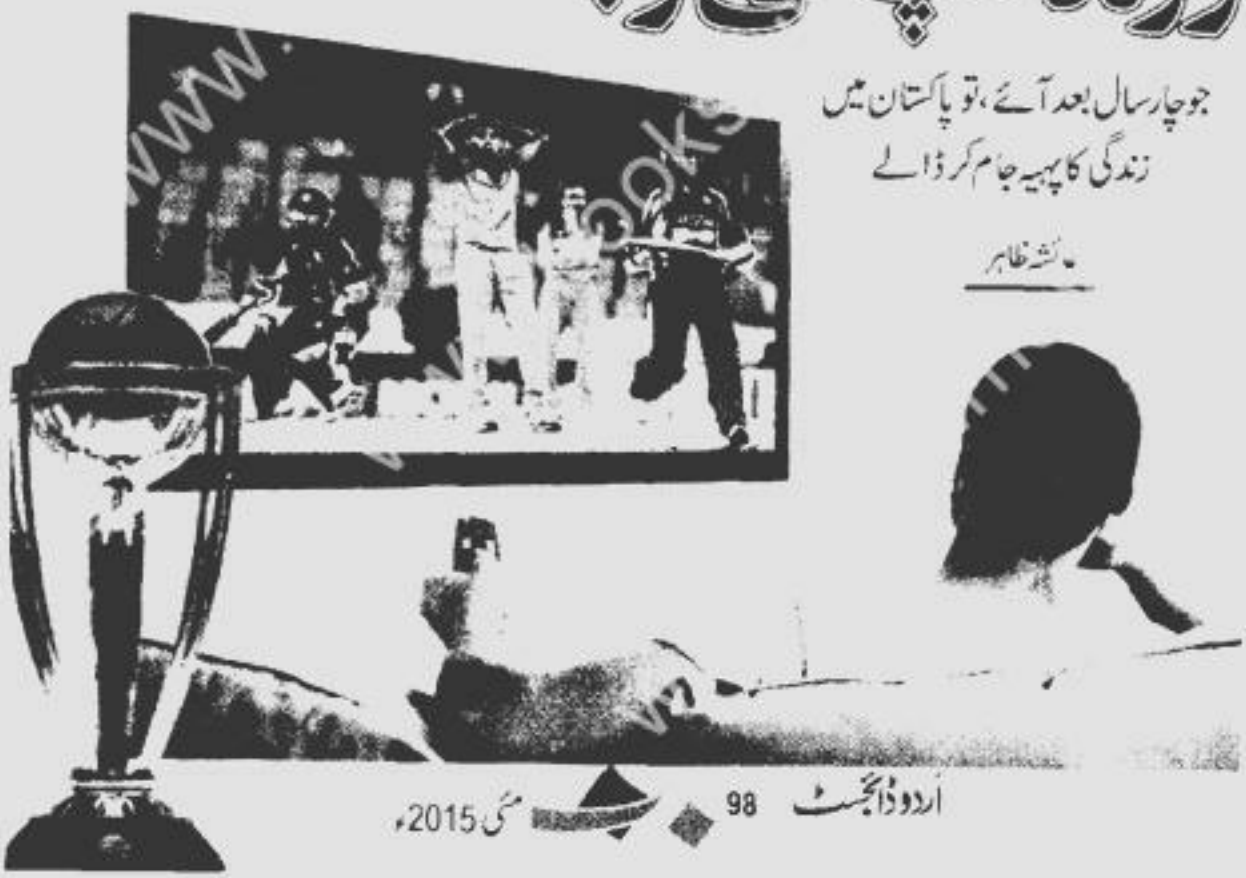

"بیگم! لو۔" ندیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔

گھر کا تمام ضروری سامان اور راشن منگوا

"یا اللہ خیر! کیا پڑوسی ملک نے حملہ کر دیا؟ ہائے رہا، ہمیں یہی خطرہ تھا۔ آئے دن سرحدوں پر چھیڑ خانی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اب کیا ہوگا؟" بیگم سہم گئیں۔ وہ بچپن ہی سے جنگ کے نام پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ ہمیشہ دعا کرتی کہ ان کی زندگی میں کبھی جنگ نہ ہو۔

"ارے نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں۔" ندیم بولے۔

"تو پھر کیا دہشت گردی کا خطرہ ہے؟" بیگم نے یوں سرگوشی کے انداز میں پوچھا گویا کوئی دہشت گرد آس پاس ہی موجود ہے۔

"او خدایا ایک تو تم عورتوں کو واویلا کرنے کا بہت شوق ہے۔ ارے بھئی بات تو پوری سن لیا کرو۔" ندیم جھنجھلا کر بولے۔

"تو پھر آپ ہی بتائیے کہ یہ ذخیرہ اندوزی کرنے کا حکم نامہ کیوں جاری کر رہے ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"بھئی کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے۔ مجھے وقت بے وقت بازار سے سودا سلف لانے کا مت کہنا۔ جو منگوانا ہے، ابھی منگوا لو۔ پھر میں ذمے دار نہ ہوں گا۔" ندیم نے 'میں' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ کہیے نا کہ ورلڈ کپ کی وبا حملہ آور ہوگئی۔ اس بیماری میں مبتلا کوئی مریض کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔" بیگم نے چڑ کر کہا۔

یوں تو کرکٹ کے شوق میں مبتلا مریضوں کی تعداد کم نہیں۔ لیکن جب چار سال بعد ورلڈ کپ شروع ہو، تو اس بیماری سے شاید ہی کوئی بچ پاتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان ہر کسی پر یہ بیماری پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہے۔ رہ جاتے ہیں، تو مجھے جیسے معدودے چند لوگ جن کی بدولت کاروبارِ حیات چلتا ہے۔ ورنہ ایسا لگتا ہے، یہ وبا زندگی کا پہیہ ہی جام کر دے گی۔

کئی لوگ پہلے سے گھر میں راشن اکٹھا کرنے لگتے ہیں کہ دوران میچ کون باہر نکلے گا۔ والدین بچوں کو تمام اسباق پیشگی یاد کراتے ہیں کہ ورلڈ کپ کے دوران پڑھانے کا وقت نہیں ہوتا۔ خواتین کئی طرح کے کھانے بنا کر منجمد کر دیتی ہیں۔ غرض تمام لوگ ذوق و شوق سے ورلڈ کپ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ورلڈ کپ کا شیڈول آتے ہی پہلے تو ان تمام تاریخوں پر نشان لگایا جاتا ہے، جن میں پاکستان کا مقابلہ کانٹے دار ٹیم سے ہو، خاص طور پر بھارت کے ساتھ! جس دن بھارت کے ساتھ پاکستان کا میچ ہو، پورے ملک میں کاروبارِ زندگی معطل ہو جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ملک بھر میں ہڑتال ہے۔ بہت سے دیوانے اسے پاک بھارت جنگ ہی شمار کرتے ہیں۔

دورانِ میچ لوگ کسی قسم کا کام کرنا کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں۔ اس دوران مریض (یعنی کرکٹ کے شائقین) کی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے۔ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے، آنکھیں پھاڑے اور سانس روکے نظریں ٹی وی پر جمی ہوتی ہیں۔ گویا کھلاڑی کے آؤٹ ہونے کا تعلق ان کے پلک جھپکنے یا سانس لینے سے ہے۔

رت جگے منانے کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی بہت شوق سے تمام رات جاگتے ہیں جو شاید ہی کبھی رمضان میں عبادت کی غرض سے جاگے ہوں۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ خواتین سر پر دوپٹہ لپیٹے، مصلے بچھائے، ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں ریموٹ پکڑے خشوع و خضوع سے دعا میں مصروف ہیں۔ ان پر رقت طاری ہے۔ چہرے پر ایسی التجا اور درد ہوتا ہے کہ لگتا ہے آج مصلے سے اپنے تمام گناہ بخشوا کر ہی اٹھیں گی۔ لیکن درحقیقت وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوتی ہیں۔

ان دنوں ہر کوئی دوسرے سے اسکور پوچھتا نظر آتا ہے..... گاہک دکاندار، باس ملازمین، مریض ڈاکٹر اور خواتین رشتے داروں سے بات کریں، تو حال احوال سے پہلے میچ کی صورتِ حال ضرور پوچھتی ہیں۔ دورانِ میچ اگر لوڈشیڈنگ ہو جائے، تو واپڈا کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام رشتے دار بھی یاد آنے لگتے ہیں جنھیں کئی سال سے فون نہیں کیا گیا۔ پھر انھیں فون یا میسج بھیج کر اسکور معلوم کیا جاتا ہے۔

دورانِ میچ جب کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو یا ٹیم ہار جائے، تو ایسا ردِعمل سامنے آتا ہے کہ بچے سہم کر ماؤں کی گود میں دبک جاتے ہیں۔ پرندے گھبرا کر اپنے گھونسلوں سے اڑتے اور کمزور دل حضرات دل پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

کمزور دل کے وہ افراد جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ پاکستانی ٹیم ناقابلِ شکست ہے، عموماً یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتے اور دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ ان افراد کو ڈاکٹر فائنل میچ تک اسپتال ہی میں رکھتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ہر میچ کے دوران ان کے بلڈ پریشر اور دل کی رفتار کے اتار چڑھاؤ کی مکمل پڑتال ہو سکے۔

یوں تو پاکستانی ٹیم ہماری امیدوں کے برخلاف ایک مرتبہ ورلڈ کپ جیت کر لا چکی۔ ورنہ عموماً ہماری توقعات کے عین مطابق سیمی فائنل سے پہلے ہی منہ لٹکا واپس آ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر مجھ جیسے دل جلے کہتے ہیں "شکر ہے، اب کم از کم زندگی معمول پر تو آئے گی۔" لیکن راز کی بات یہ ہے، ہمارا یہ جملہ انگور کھٹے ہیں کہ مترادف ہے۔ ورنہ کون کافر ہے جو اپنی ٹیم کی ہار پر خوش ہو؟

www.pdfbooksfree.pk

مشورہ حاضر ہے

رخسانہ فضل

گنج کا خاتمہ

مجھے گنج کے خاتمے کا تیر بہدف نسخہ درکار ہے۔ مزید برآں سفید بال سیاہ کرنے کا طریقہ بھی بتائیے؟
(علی احمد نور، اسلام آباد)

عمر کے ساتھ ساتھ اکثر مرد گنجے ہوجاتے ہیں۔ گنج جنم لینے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً اجداد میں گنج پایا جانا، ناقص غذا، تھائیرائڈ غدود کی خرابی اور خون کی کمی (انیمیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ گنج پن کا کوئی شافی علاج نہیں، البتہ غذائیت سے پُر غذا کھا کر بال جھڑنے کا عمل روکا جاسکتا ہے۔

بالوں کی نشوونما کے لیے پروٹین ضروری ہے۔ لہٰذا دن میں گوشت کی دو تین بوٹیاں کھائیے۔ دودھ بھی لیجیے۔ نیز انڈے، پھل اور سبزیاں غذا میں شامل رکھیے۔ مزید برآں جسم میں فولاد، زنک اور بائیوٹن کی کمی نہ ہونے دیجیے۔ یہ معدنیات بھی بالوں کی افزائش کرتی ہیں۔ نہاتے ہوئے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیریے۔ ذہنی دباؤ سے بچیے بال اگانے کی ادویہ بازار میں دستیاب ہیں لیکن ان کے استعمال سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا۔

خضاب کے بغیر سفید بال سیاہ کرنے کے مختلف دیسی نوٹکے موجود ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مہندی کا آمیزہ بنائیے۔ اس میں تین چمچ کروندے کا سفوف اور ایک چمچ کافی پاؤڈر ملائیے۔ اب آمیزے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی طرح پیچ چلائیے تاکہ تینوں اشیا حل ہوجائیں۔

یہ آمیزہ ٹوتھ پیسٹ والے برش کی مدد سے بالوں میں لگائیے اور کم از کم دو گھنٹے لگا رہنے دیجیے۔ اس کے بعد اچھی قسم کے صابن یا شیمپو سے سر دھو لیجیے۔ یہ نسخہ نہ صرف بال سیاہ کرتا بلکہ انھیں چمک دار اور نرم و ملائم بھی بناتا ہے۔

بال اگر زیادہ سفید نہ ہوں، تو چائے کی پتیوں کا نوٹکا بھی قابل عمل ہے۔ دو چمچ چائے کی پتی پانی میں ابال لیں۔ جب پانی کچھ ٹھنڈا ہوجائے، تو بالوں پر لگائیے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک گھنٹے بعد صابن یا شیمپو استعمال کیے بغیر سر دھو لیجیے۔

ایک اور ٹوٹکا یہ ہے کہ سکاکائی، آملہ اور ریٹھا ہم وزن لیں۔ انھیں اچھی طرح دھو کر پیس لیں۔ یہ آمیزہ یا پیسٹ ایک چمچ کھولتے پانی میں ڈال دیں اور اسے اچھی طرح ملا لیں۔ یہ آمیزہ جب پانی نیم گرم ہو جائے، تو اس سے سر دھوئیے۔ یہ آمیزہ بال سیاہ اور لمبے کرتا ہے۔ خیال رہے، یہ پانی چہرے پہ لگا، تو اسے کالا کر دے گا۔ لہٰذا چہرہ بچا کر رکھیے۔

کالا جادو

میں ایم اے سیاسیات ہوں۔ شکل وصورت اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی نہیں ہو رہی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے خاندان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دیجیے۔

(شاہین، راولپنڈی)

آیت ۱۰۲ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ قدرت صرف اللہ پاک رکھتے ہیں۔

آپ نماز اور قرآن پاک باقاعدگی سے پڑھیے اور امید رکھیے کہ رب کائنات آپ کی مدد فرمائیں گے۔ رشتوں کی تلاش جاری رکھیے کہ ہاتھ پاؤں مارنے ہی سے منزل ملتی ہے۔ ان شاء اللہ ہم سب کا پالن ہار آپ پہ کرم فرمائے گا۔

بال گرتے ہیں

میرے بال بہت گرتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج بتائیے۔

(راحیلہ، لاہور)

خواتین گھنے بال رکھتی ہیں۔ لہٰذا روزانہ ان کے ۵۰ تا ۱۰۰ بال گرنا معمول کی بات ہے۔ اگر اس تعداد سے زیادہ بال گرنے لگیں، تو یہ درست نہیں۔ خوش قسمتی سے بال گرنے و ٹوٹنے سے بچانے والے عمدہ ٹوٹکے موجود ہیں۔

قدرتی علاج یہ ہے کہ ایک درمیانہ پیاز لیجیے اور اسے اتنا کاٹیے کہ اس کا رس نکل سکے۔ یہ رس بالوں پہ لگائیے اور انھیں ۱۵ منٹ تک کھلا چھوڑ دیں۔ پھر عمدہ شیمپو سے بال دھوئیے اور انھیں ہوا میں خشک ہونے دیں۔ یہ ٹوٹکا ہفتے میں دو بار استعمال کیجیے۔ امید ہے، بال گرنے کی تعداد کم ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ خواتین کے بال مختلف وجوہ کی بنا پر گرتے ہیں مثلاً حمل، ذہنی دباؤ، پریشانی، بلیچنگ، بیماری اور سر کی چھوت۔ اگر بال گرنا وراثت میں ملا ہے، تو ڈاکٹر کے مشورے سے مانوکسیڈل (Minoxidil) دوا استعمال کیجیے۔

مزید قدرتی علاج یہ ہے کہ ورزش کیجیے جو سر سمیت پورے جسم میں خون کی روانی بڑھاتی ہے۔ سر پہ ناریل یا آملے کا تیل لگائیے، یوں بالوں کو غذائیت ملتی ہے۔

انڈا بھی گرتے بالوں کی خرابی دور کرتا ہے۔ ایک انڈے کی سفیدی لیجیے اور اس میں زیتون کے تیل کی ایک چمچی ڈالیے۔ آمیزہ اچھی طرح ملائیے اور پھر سر پہ لگائیے۔ پندرہ منٹ بعد سر ٹھنڈے پانی اور عمدہ شیمپو سے دھو لیجیے۔ امید ہے یہ ٹوٹکا کارگر ثابت ہو گا۔

توجہ فرمائیے

قارئین اپنا مسئلہ ڈاک سے بھجوانے کے علاوہ موبائل نمبر ۰۳۰۳-۴۴۸۰۸۱۴ پر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ اپنا نام اور شہر کا نام ضرور لکھیے۔ درج بالا نمبر پر صرف ایس ایم ایس وصول کیے جاتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

دستوں میں خون

میرا بیٹا ۱۰ ماہ کا ہے۔ وہ ہر دو ہفتے بعد ایسے دست کرتا ہے جن میں خون آتا ہے۔ یہ خرابی کیسے دور ہوگی؟
(جاوید اکبر، لالہ موسیٰ)

دست میں خون آنا خطرے کی نشانی ہے اور اس خلل کی اصل وجہ طبی معائنے سے ڈاکٹر ہی دریافت کر سکتا ہے۔ عموماً قبض یا سخت پاخانہ آنے سے مقعد میں زخم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے نکلتا خون پھر پاخانے یا دست میں شامل ہوتا ہے۔

بچے کا نظام ہضم خراب ہو، تبھی وہ ہر پندرہ دن بعد دست کرتا ہے۔ تب بعض ناپسندیدہ غذاؤں کے ردعمل سے بھی آنتوں سے نکلا خون دست میں شامل ہو سکتا ہے۔ بہرحال مشورہ یہی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں بچے کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔ وہ بہتر مشورہ دے گا۔

کبوتر کی بیٹ

ہمارے گھر میں کافی چھجے بنے ہیں جہاں کبوتر بسیرا کر چکے۔ ان کی بیٹیں سارے صحن کو گندا کر دیتی ہیں۔ کبوتر بھگانے کا نسخہ بتائیے۔ (علیم خان، کوئٹہ)

کبوتروں سے انسانوں کو بعض بیماریاں منتقل ہوتی ہیں۔ ان میں پھیپھڑوں کو نشانہ بنانے والی ہسٹولازموسیس (Histoplasmosis)، شدید بخار پیدا کرنے والا مرض پسیٹاکوسس (Psittacosis) اور ایڈز جیسی خصوصیات رکھنے والی بیماری کرپٹوکوکوسیس (Crptococcesis) شامل ہیں۔

غذا اور پناہ گاہ... کبوتر عموماً ان دونوں چیزوں کی مدد سے پلتے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا گھر کے چھجوں میں بستے کبوتروں کو دانہ نہیں ڈالیے اور نہ ہی کوئی اور غذا دیجیے۔ دوسرا قدم یہ اٹھائیے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے، کبوتر چھجوں میں بسیرا نہ کر سکیں۔

مثال کے طور پر تاریں لگا کر چھجے بند کریں یا وہاں اینٹیں رکھ دیں۔ غرض ایسی تدبیر کیجیے کہ کبوتر چھجوں پر نہ بیٹھ سکیں۔ غذا اور پناہ گاہ سے محروم ہونے کے بعد کبوتر خود بخود چلے جائیں گے۔ یوں آپ کو بدبودار بیٹوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

شدید قبض

میں شدید قبض کا شکار ہوں۔ قسم قسم کے علاج کر لیے، مگر کم ہی فائدہ ہوا۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیجیے۔
(مسرت بیگم، راولپنڈی)

انسان کو جب ہفتے میں صرف ایک بار پاخانہ آئے، تو وہ شدید قبض کا نشانہ بنتا ہے۔ تقریباً ہر بیماری کی طرح قبض ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ آپ ڈاکٹروں سے طبی علاج کرا چکیں، لہٰذا اب قدرتی نسخے آزما کر دیکھیے۔ قبض دور کرنے والے قدرتی ٹوٹکے درج ذیل ہیں۔

ڈیڑھ چمچ اسپغول ایک گلاس پانی میں ملائیے۔ پانی دو گھنٹے کے لیے محفوظ مقام پر رکھ دیں۔ پھر پانی میں آدھ چمچ شہد اور ایک لیموں کا عرق ملائیے اور نوش کیجیے۔

ایسی غذائیں کھائیے جن میں فائبر یا ریشہ ہو۔ مثلاً مٹر، چھلکوں والی دالیں، بند گوبھی، ناشپاتی اور سیب بنا چھیلے کھائیں۔

صبح سویرے ایک چمچ زیتون کے تیل میں ایک چمچ لیموں کا عرق ملائیے اور پی جائیے۔ یہ آمیزہ خالی پیٹ لینا ضروری ہے۔ چند دن استعمال سے افاقہ ہوگا۔ یہ نسخہ نظام ہاضمہ کو متحرک رکھتا ہے۔ یوں قبض سے چھٹکارا ملتا ہے۔

ایک تازہ لیموں کا عرق نیم گرم پانی کے گلاس میں

www.pdfbooksfree.pk

ڈالیے اور نوش کیجیے۔ یہ پانی جسم کے زائد مادے نکال پھینکتا ہے۔

اپنے آپ کو متحرک رکھیے۔ دن کا بیشتر حصہ بیٹھ کر گزارنے سے عموماً قبض چمٹ جاتی ہے۔

کھانے کا (بیکنگ) پاؤڈر میٹھا سوڈا قبض سے عارضی نجات پانے کا عمدہ نسخہ ہے۔ ایک چوتھائی پانی (۴/۱) کے گلاس میں ایک چمچی میٹھا سوڈا ملایئے اور فوراً پی جایئے۔ یہ معدے میں دباؤ ختم کر کے طبیعت ہلکی کر دیتا ہے۔

سوکھے آلو بخارے کا رس لیجیے۔ ایک گلاس صبح اور ایک گلاس رات کو نوش کریں۔ چند دن بعد دیکھیے افاقہ ہو گا۔ آپ سوکھے آلو بخارے کے چھ سے سات دانے کھا بھی سکتی ہیں۔

گروندے کے پتوں سے بنی چائے پیجیے۔ دو چمچ پتے لیجیے۔ انھیں ایک پیالی میں ڈالیے اور اوپر سے ابلتا پانی ڈال دیجیے۔ پیالی ڈھک کر دس منٹ انتظار کیجیے پھر یہ چائے پی لیجیے۔ اگر قبض شدید ہے، تو یہ چائے صبح، دوپہر اور شام پیجیے۔ ان شاءاللہ چند دن میں افاقہ ہوگا۔

> آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھایئے بلکہ صحت بخش خوراک کھایئے...... ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارت فراہم کرے۔

بچی تنگ کرتی ہے

میں ایک دو سالہ بچی کی ماں ہوں۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت تنگ کرتی ہے۔ اکثر کھایا پیا اگل دیتی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی حل بتایئے۔

(بیگم فریدہ مرزا، کوئٹہ)

دو سے پانچ سال کے بچے من موجی ہوتے اور اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی سے کھائیں پییں۔ اسی لیے اگر آپ کی پیاری بیٹی صحت مند ہے اور اس کی نشوونما معمول کے مطابق جاری ہے، تو پریشان نہ ہوں۔ یہ اعتماد رکھیے کہ بیٹی کو جب بھی بھوک لگی، وہ خود کھانا مانگے گی۔ لہٰذا اسے زبردستی کوئی غذا نہ کھلایئے۔ مزید برآں بعد میں بھی یہ سوچ کر اسے زائد غذا نہ دیں کہ اس نے ایک وقت کا کھانا نہیں کھایا۔

اس کے علاوہ بیٹی جو اشیا کھانا پسند کرتی ہے، اسے وہ کھلایئے۔ ذرا سوچیے، آپ کو جو غذائیں پسند نہیں، اگر کوئی زبردستی وہی آپ کو کھلانا چاہے، تو یقیناً آپ ناگواری محسوس کریں گی۔ لہٰذا بیٹی کو کھانے پینے کے معاملے میں کچھ اختیار دیجیے، صورت حال بہتر ہو جائے گی۔

بیٹی کچھ نہیں کھاتی پیتی

میں ۱۰ ماہ کی بیٹی کا باپ ہوں۔ میری بچی دودھ پینے کے علاوہ کچھ نہیں کھاتی پیتی۔ کیا یہ تشویش ناک بات ہے؟ (سجاد احمد، خان گڑھ)

چھ سے بارہ ماہ کی عمر کے کئی بچے بچیاں دودھ کو ٹھوس غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چوسنی سے دودھ پینا آسان ہے۔ جبکہ غذا کو چبا کر نگلنا مشکل لگتا ہے۔ اگر آپ کی بچی مطلوبہ مقدار میں ماں یا ڈبے کا دودھ پی رہی ہے، تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دس ماہ کی بچی کو روزانہ فی پونڈ وزن کے لحاظ سے ۳/۲ اونس دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر بچے بچیاں ۳۲ تا ۳۶ اونس پیتی ہیں۔ یہ دودھ وٹامن اور معدنیات کی مطلوبہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ چناں چہ بچوں کی ٹھوس غذا نہ کھانے والی "ہڑتال" سے انھیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچتا۔

www.pdfbooksfree.pk

زندگی کے پہلے سال نشوونما کے لیے درکار بیشتر حرارے بچے کو چکنائی (Fat) سے ملتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ماں کے دودھ کا ۵۰ فیصد حصہ چکنائی پر مشتمل تخلیق کیا ہے۔ اگر والدین یہ دیکھیں کہ بچے یا بچے کی نشوونما سست ہو چکی، تو اسے دودھ کے ساتھ کوئی چکنائی والی شے بھی دیں۔ مثال کے طور پر دودھ کی ہر بوتل میں آدھی چمچی السی کا تیل شامل کر دیں۔ یہ تیل بچے کو روزانہ ۸۰ زائد حرارے دے گا۔

ٹھوس غذا پسند نہ کرنے والے بچے بچیوں کو ایسا کھانا دیجیے جو غذائیت سے پُر ہو، مثلاً دہی، انڈا (ایک سال کا ہونے پر)، گاجر اور السی کا تیل۔

بعض اوقات بچے بازار سے دستیاب بچوں کے لیے مخصوص کھانے نہیں کھاتے۔ ایسی صورت میں والدین یہ کریں کہ ان بچوں کو وہی کھلائیں جو خود کھاتے ہیں۔ یعنی تازہ پھل، پکی ہوئی سبزیاں، چربی سے پاک گوشت اور مچھلی۔ اس غذا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بچہ شروع سے گھر کا پکا کھانا بہ رغبت کھانے لگتا ہے۔ اسے پھر بازاری کھانے پسند نہیں آتے جو عموماً بچوں کو فربہ کر انھیں ذیابیطس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

پیٹ میں کیڑے

میرے بھانجے بھانجیوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بیمار رہتے ہیں۔ ان کے خاتمے کا کوئی طریقہ بتائیے۔ (صدف انصاری، کراچی)

پیٹ کے کیڑوں کی پانچ چھے اقسام ہیں۔ یہ بھی کیڑے جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا گوشت کھانے سے انسانی معدے میں بھی آ پہنچتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان پیٹ درد، دست، بخار، جسمانی کمزوری، تھکن وغیرہ کا شکار رہتا ہے۔

آپ نے بچوں کی عمریں نہیں لکھیں اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ ان کے پیٹ میں کیڑوں کی کون سی قسم تنگ کر رہی ہے۔ بہرحال ذیل میں کیڑے مارنے کے قدرتی نسخے پیش ہیں:

☆ بچوں کو صبح ناشتے میں ایک چمچ باریک کٹا ناریل کھلائیے۔ ڈھائی تین گھنٹے بعد ایک گلاس نیم گرم دودھ میں دو چمچ ارنڈ کا تیل (کیسٹر آئل) ملائیے اور بچوں کو پلائیے۔ لیکن بچوں کی عمر ۵ سال سے کم ہے، تو ارنڈ کا تیل نہ دیجیے۔

☆ ایک چمچ پپیتے کے گودے میں ایک چمچی خالص شہد ملائیے۔ یہ آمیزہ صبح سویرے خالی پیٹ بچوں کو کھلائیے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں گرم دودھ پلائیے اس میں ایک چمچی ارنڈ کا تیل ملا دیں۔ یہ عمل دو تین دن کیجیے۔

پیٹ کے کیڑے مارنے والی ایلوپیتھک ادویہ بھی دستیاب ہیں تاہم وہ زہریلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کا زہر ہی کیڑے مارتا ہے۔ مزید برآں خصوصاً بچوں میں ان کے منفی اثرات بہ شدت ظاہر ہوتے ہیں۔

موٹا ہونا چاہتا ہوں

میں کمزور بدن کا مالک ہوں۔ فربہ ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے۔ (یاسر، بہاولپور)

لوگوں کی اکثریت یہ خواہش رکھتی ہے کہ وہ دبلے ہو جائیں، مگر آپ کی تمنا برعکس ہے۔ بہرحال آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھائیے بلکہ صحت بخش خوراک کھائیے...... ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارے فراہم کرے۔

مثال کے طور پر صبح ناشتے میں روٹی، انڈا اور کیلا کھائیے۔ دوپہر کو معتدل مقدار میں گوشت لیں۔ رات کے وقت سبزی لیجیے۔ ساتھ ساتھ دودھ اور مغزیات کا

www.pdfbooksfree.pk

استعمال بھی جاری رکھیے۔ سبزیوں میں آلو، شلجم، پالک اور گوبھی غذائیت کا خزانہ ہیں۔

مزید برآں دن میں پانچ چھے بار غذا کھائیے تاکہ اپنا وزن بڑھا سکیں۔ عضلات کی موٹائی بڑھانے کے لیے مرغ اور مچھلی کا گوشت کھائیے۔ امید ہے کہ درج بالا تجاویز پر عمل کرنے سے دو تین ماہ میں آپ کا وزن خاطر خواہ بڑھ جائے گا۔

حساس بہن

میری بڑی بہن ۳۸ سال کی ہیں۔ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ وہ بہت حساس ہوچکیں۔ معمولی بات پہ رو پڑتی ہیں۔ غصہ آئے، تو چیزیں اٹھا کر مارتی ہیں۔ ان کا کچھ علاج بتائیے۔ (مریم، جہلم)

آپ کی بہن ڈپریشن کا شکار ہیں۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اہل خانہ ان کی دلجوئی کریں اور ایسی کوئی حرکت نہ ہونے دیں جس سے بہن مشتعل ہو۔ بہتر ہے کہ بہن کی شادی کا بندوبست کیجیے۔ اگر اہل خانہ نے ان کی دیکھ بھال نہ کی، تو معاملہ بگڑ کر شیزوفرینیا تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک حل یہ ہے کہ انھیں اچھے نفسیات دان کے پاس لے جائیے۔ بعض اوقات ادویہ کھانے سے ڈپریشن دور ہو جاتا ہے۔ آپ بہن سے بول چال رکھیے، اس کے ساتھ مختلف اندرون خانہ کھیل مثلاً لڈو کھیلیں اور انھیں زندگی سے پیار کرنا سکھائیے۔ اگر ڈپریشن کی مریضہ کو اہل خانہ کی مدد نہ ملے، تو حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا بہن پر توجہ دے کر آپ ایک قیمتی زندگی محفوظ کرسکتی ہیں۔ اگر بہن کے ناز نخرے بھی اٹھانے پڑیں، تو اٹھائیے۔

کمر میں درد

چھے ماہ قبل میرا بیٹا تولد ہوا۔ تب سے میری کمر میں درد چلا آرہا ہے۔ یہ کیسے دور ہوگا؟ (بیگم علی اختر، سیالکوٹ)

حمل کے دوران اور بعد میں کمر درد ہونا معمول ہے۔ تحقیق کے مطابق ۵۰ فیصد حاملہ خواتین کمر درد کا نشانہ بنتی ہیں۔ آپ اپنی تکلیف سے نجات کے لیے درج ذیل اقدامات کیجیے

☆ ورزش کیجیے۔ اس ضمن میں معتدل رفتار میں پیدل چلنا سودمند ہے۔ تاہم درد بڑھ جائے، تو زبردستی نہ چلیے ورنہ کمر کے پٹھوں میں مزید اکڑن ہوگی۔ شروع میں آہستہ چلیے، پھر رفتار بڑھاتی جائیے۔ کمر کی ورزشیں بھی کرسکتی ہیں۔

☆ نرمی سے کمر کی مالش کیجیے۔ اس ضمن میں زیتون یا سرسوں کا تیل استعمال کرسکتی ہیں۔ تاہم مالش کا دورانیہ زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

☆ کمر پر گرم پانی کی ٹکور کیجیے۔ لیکن پانی زیادہ گرم نہ ہو۔

☆ کمر کے پٹھوں میں زیادہ کھچاؤ ہو، تو ان پر ہومیو پیتھک آرنیکا (Arnica) کریم لگائیے۔

اگر درج بالا تراکیب آزمانے کے باوجود کمر درد برقرار رہے، تو ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

سانس اور جلد کے امراض

ایلوویرا کے فوائد بتائیے۔ کیا یہ سانس اور جلد کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہے؟ (عالیہ علی، تربت)

اردو میں ایلوویرا کو گوار گندل کہتے ہیں۔ یہ ایسا پودا ہے جس کے پتوں میں گودا ہوتا ہے۔ جدید طبی تحقیق کے مطابق یہ گودا وٹامن اے، سی، ای اور فولک ایسڈ کا حامل ہے۔ اس میں انسانی صحت کے لیے مفید امائنو تیزاب بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے اب یورپ میں اس کا گودا بطور سلاد

www.pdfbooksfree.pk

کھایا جا رہا ہے۔ یہ نظام ہضم کو تقویت پہنچاتا اور قبض دور کرتا ہے۔ نیز بدن کے فاسد مادے نکال پھینکتا ہے۔

گودے سے جیلی جیسا مادہ نکلتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایلوویرا کے پتے کا بالائی حصہ چھیل لیں۔ نیچے سے جیلی نما مادہ نکل آئے گا۔ یہ مادہ جلد کے لیے مفید ہے۔ چہرے پہ دانے یا داغ دھبے ہوں، تو ایک ہفتے تک مادہ معتدل مقدار میں لگائیے۔ چہرہ پہلے سے زیادہ صاف اور نکھرا نظر آئے گا۔

ایلوویرا سانس کی بیماریوں خصوصاً دمے میں بھی مفید ہے۔ استعمال کا طریق کار یہ ہے کہ ایک چھوٹی پتیلی میں پانی ابالیے۔ جب پانی ابلنے لگے، تو اس میں ایک چمچ ایلوویرا کی جیلی ملا دیجیے۔ اب اس پانی کی بھاپ لیجیے۔ ایلوویرا کے مفید طبی اجزا سانس کی نالیاں کھول دیں گے۔ یوں سانس لینے میں دشواری نہیں رہے گی۔

اگر گلا خراب ہے، تب بھی ایلوویرا کام دیتا ہے۔ گرم پانی میں ایک چمچ جیلی ملائیے۔ پھر اس سے ہر کھانے کے بعد غرارے کیجیے۔ چند بار یہ عمل کرنے سے گلا ٹھیک ہو جائے گا۔

بھولنے کی بیماری

مجھے بھولنے کا مرض لاحق ہے۔ کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ کیا میری یادداشت درست ہو سکتی ہے؟

(عاقل عمر، سکھر)

سر پر چوٹ لگنے یا کسی صدمے کے باعث یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس خلل کا کوئی ادویاتی علاج نہیں کیونکہ اب تک یادداشت قوی کرنے والی دوا ایجاد نہیں ہو سکی۔ البتہ بعض غذائیں مثلاً تازہ اناج، مچھلی، ثمر، بادام، اخروٹ وغیرہ دماغی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

آپ کسی ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ کرائیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ بھولنے کا مرض کسی جسمانی چوٹ کا نتیجہ ہے یا جذباتی صدمے سے پیدا ہوا۔ تشخیص کے مطابق وہ پھر علاج بھی تجویز کرے گا۔

گلا خراب رہتا ہے

میرا گلا ہر ایک دو ہفتے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق کچھ بتائیے۔

(سلیم ماہر، ڈیرہ غازی خان)

گلے کا عام درد چھوت کے باعث جنم لیتا اور عموماً ایک دو ہفتے میں کافور ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کا مرض کسی سنگین مسئلے کی سمت اشارہ کر رہا ہے۔ یاد رہے، مسلسل گلا خراب رہنا سرطان چھٹنے کی نشانی بھی ہے۔ لہٰذا پہلی فرصت میں ڈاکٹر سے اپنے گلے کا معائنہ کرائیے۔

بال سفید ہو چکے

میری عمر ۱۷ سال ہے۔ میرے بال سفید ہو رہے ہیں۔ جبکہ نظر بھی کمزور ہو چکی۔ تندرستی کے لیے مشورہ دیجیے۔

(ذیشان حسن، قصور)

بال عمر کے کسی بھی دور میں سفید ہو سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ بالوں کی تھیلیوں (Follicles) میں موجود خلیے انھیں رنگ بخشتے ہیں۔ جب یہ خلیے کسی وجہ سے اپنا کام کرنا چھوڑ دیں، تو بال بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ہمیں سفید نظر آتے ہیں۔ عموماً ذہنی دباؤ اور ناقص غذا کے سبب تھیلیوں کے خلیوں میں خرابی جنم لیتی ہے۔ لہٰذا پرسکون ہونے، پریشانیوں سے بچنے اور غذائیت سے بھرپور کھانے کے ذریعے مزید سیاہ بالوں کو بے رنگ ہونے سے روکنا ممکن ہے۔

نوجوانی میں نظر کمزور ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ مثلاً کے طور پر رات دیر تک جاگنا، طویل دورانیہ ٹی وی

www.pdfbooksfree.pk

دیکھنا، وٹامن اے کی کمی، ناقص غذا کھانا، ہر وقت پریشان رہنا وغیرہ۔ کمزوری نظر کے سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ خلل کیوں پیدا ہوا۔ بہرحال بینائی بہتر کرنے کے لیے درج ذیل نسخے آزمائیے۔

☆ بادام، سونف اور مصری ہم وزن لیں اور تینوں کو کوٹ لیں۔ سفوف پھر کسی بوتل میں رکھیے۔ ہر رات کو ایک چمچ یہ سفوف ایک گلاس دودھ میں ملائیے اور پی جائیے۔ یہ عمل چالیس دن تک انجام دیجیے۔ امید ہے، نظر بہتر ہو جائے گی۔

رات کو ۱۰ تا ۱۵ بادام ایک گلاس پانی میں بھگو دیجیے۔ صبح سویرے باداموں کا چھلکا اتار دیجیے اور اچھی طرح چبا کر کھا لیجیے۔ بعدازاں دودھ کا گلاس بھی پی سکتے ہیں۔

ذیابیطس سے چھٹکارا

ذیابیطس کا مریض ہوں۔ پیروں کی انگلیوں میں اکثر درد رہتا ہے۔ اس کا علاج بتائیے

(خالد قریشی، لاہور)

ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں درد اور سنسناہٹ ہونا ذیابیطس کی واضح علامت ہے۔ گو یہ درد کیوں جنم لیتا ہے، ماہرین اس کی وجہ دریافت نہیں کر سکے۔ تاہم انھیں یہ ضرور معلوم ہے کہ انگلیوں میں واصلی بافتوں (Connective tissues) کے سخت ہونے اور اکڑنے سے درد جنم لیتا ہے۔

ہمارے جسم میں واصلی بافتیں رباط (ligamints) اور نسوں (Tenddons) پر مشتمل ہیں۔ انہی کے ذریعے ہمارا ڈھانچہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ بافتیں لچک دار پروٹینی مادے، کولاجن سے بنتی ہیں۔ جب کولاجن مادہ سخت ہو جائے، تو ہمارے جسمانی جوڑ صحیح طرح اپنا کام نہیں کر پاتے اور تکلیف دینے لگتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جب ذیابیطس انسان کو چمٹے، تو خون میں شکر کی بلند سطح پروٹینی مادوں کا قدرتی توازن بگاڑ دیتی ہے۔ یا پھر سوزش پیدا کرنے والا کوئی عمل یہ توازن خراب کرتا ہے۔ بہرحال ذیابیطس میں کولاجن سخت ہونے سے ہاتھ پیروں کی انگلیوں میں سنسناہٹ اور تکلیف ہوتی ہے۔

اس تکلیف کا علاج یہی ہے کہ صبح سویرے انگلیوں کی ورزش کیجیے اور انھیں ہلائیے۔ شروع میں شاید کچھ تکلیف ہو، مگر ورزش عادی ہونے پر جاتی رہے گی۔ اگر انگلیوں کو ہلایا جلایا نہ جائے، تو جوڑوں کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔

گرمائش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔ لہٰذا انگلیوں کو گرمائش اور ٹھنڈک، دونوں دے کر دیکھیے، کسی ایک عمل سے افاقہ ہوگا۔

گرمائش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔

دیگر مشورے یہ ہیں: انگلیوں کی مالش کیجیے۔ (تاہم زیادہ درد ہو، تو نہ کریں)۔ مالش سے عضلات تک تازہ آکسیجن اور غذائیت پہنچتی ہے۔ بھاری وزن اٹھانے سے بچیے اور خون میں شکر کی سطح متوازن کیجیے۔

کمزوری نظر کا علاج

میری نظر کمزور ہے۔ بادام، سونف اور مصری کا مرکب کھایا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نظر تیز کرنے کے لیے تجاویز دیجیے۔

(بیگم ذوالفقار شاہ، پشاور)

جب ایک دفعہ نظر خراب ہو جائے، تو اسے صرف آپریشن کے ذریعے ہی تقریباً ۱۰۰ فیصد درست کرنا ممکن ہے۔ اگر آپریشن نہیں کروانا، تو پھر طرز زندگی میں

www.pdfbooksfree.pk

تبدیلیاں لا کر نظر تیز کی جا سکتی ہے۔ لیکن بادام کھانا محض ایک عمل ہے، طرز زندگی مکمل طور پر بدلے بغیر اس نسخے سے فائدہ نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر روی (Junk) غذا کھانا، مسلسل ٹی وی یا کمپیوٹر پر بیٹھنا، آنکھوں کی ورزش نہ کرنا، فکر مند رہنا یہ تمام اعمال ہماری بینائی پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ایسی صورت میں محض بادام و سونف کھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا میری بہن، ایسی غذائیں کھائیے جن سے جسم کو وٹامن اے، بی اور ای، اومیگا تھری فیٹی تیزابیت، اور آیوڈین میسر آئیں۔ یہ تمام غذائی عنصر بینائی کی حفاظت کرتے ہیں۔

دوسرے ٹی وی اور کمپیوٹر دیکھنا ہی ہے، تو مسلسل نظریں نہ جمائیے۔ ہر ۲۰ منٹ بعد ۲۰ سیکنڈ کے لیے ۲۰ فٹ دور موجود کسی شے کو دیکھیے۔ یہ چھوٹی سی ورزش بینائی طاقتور رکھتی ہے۔ آپ ماہر امراضِ چشم سے پوچھ کر آنکھوں کی دیگر ورزشیں بھی کر سکتی ہیں۔ یہ بینائی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

اچھی غذا کھانے، سات آٹھ گھنٹے نیند لینے، فکر و پریشانی سے دور رہنے اور آنکھوں کی ورزشیں کرنے سے آپ اپنی بینائی ٹھیک کر سکتی ہیں۔

اعضا سن رہتے ہیں

میرے جسم کے تمام اعضا عموماً سن رہتے ہیں۔ کئی ادویہ کھا چکا، مگر آرام نہیں آیا۔ آپ کوئی مشورہ دیجیے۔
(جاوید صدیقی، مانسہرہ)

اعضا میں سنسناہٹ اور درد ہونا کئی وجوہ سے جنم لیتا ہے۔ مثلاً ذیابیطس جسم میں غذائیت (وٹامن معدنیات) کی کمی، نسوں کو ضرب پہنچنا، شریانوں (Arteries) کا سخت ہونا وغیرہ۔ لہٰذا آپ سب سے پہلے کسی اچھے ڈاکٹر سے ملیے تاکہ وہ اعضا سن ہونے کی وجہ جان سکے۔ تب ہی اس کا شافی علاج ہو سکے گا۔

عام طور پر یہ سنسناہٹ بدن میں وٹامن بی ۱۲ کی کمی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا طبی معائنے سے یہ وجہ دریافت ہوگی۔ فولاد کی کمی بھی یہی اثرات پیدا کرتی ہے۔

قبض کا مرض

مجھے اکثر قبض رہتی ہے۔ اس سے چھٹکارے کا طریقہ بتائیے۔ (مجتبیٰ احمد، ہری پور)

قبض ایک موذی بیماری ہے جو شدید ہونے پر انسان کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتی، بہرحال اس مرض سے چھٹکارے کے لیے کچھ مشورے شروع میں بتائے جا چکے، مزید تجاویز درج ہیں:

سب سے پہلے تو خوراک میں ریشے والی (Fiber) غذائیں زیادہ رکھیے مثلاً خوبانی، پھلیاں، آلو (چپس نہیں) ثابت اناج اور گوبھی۔ ریشہ آنتوں میں غذاؤں کو جمنے نہیں دیتا اور یوں پاخانہ کھل کر آتا ہے۔

قبض سے نجات پانے کا ایک اور قدرتی طریقہ یہ ہے: کنو کا ایک گلاس رس لیجیے، اس میں کنووں کا گودا بھی ڈال دیجیے، اس رس میں ایک چمچ السی کا تیل ملائیے اور پی جائیے۔ پانچ چھے گھنٹے بعد آپ افاقہ محسوس کریں گے۔

طرز زندگی میں یہ تبدیلی لائیے یعنی حرکت کیجیے اور زیادہ دیر نہ بیٹھیے۔ صبح سویرے ورزش کیجیے، یہ قبض کا موثر قدرتی علاج ہے۔ نیز پانی خوب نوش کیجیے۔ جسم میں پانی کی فراوانی آنتوں میں فضلہ نہیں جمنے دیتی۔ موسم ہو، تو آلو بخارا کھائیے، یہ بھی قبض دور کرتا ہے۔ یہ تجاویز اختیار کر کے آپ قبض سے نجات پا سکتے ہیں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

معلومات

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، وہ کسی نہ کسی خاندان، قبیلہ، گاؤں، شہر اور ملک سے منسلک ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے بہت ساری خوشیاں اور غم بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ خوشی کے کچھ تہواروں کی نوعیت ہے مثلاً عید یا کرسمس۔ لیکن یہاں ایسے تہواروں کے بارے میں آپ کو آگاہ کیا جارہا ہے جو خاصی حد تک غیر مذہبی ہیں اور ان کی ثقافتی روایت بہت قدیم ہے۔

سعودی عرب

عام تاثر یہ ہے کہ سعودی عرب میں زندگی مذہب کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تاثر ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن عرب اسلام سے پہلے بھی توانا ثقافتی روایات رکھتے تھے۔ وہ ان کا آج بھی فخر سے ذکر کرتے ہیں۔ آپ نے سوق

ہنسی، قہقہوں اور کھیلوں سے سجے

دنیا کے رنگ برنگے تہوار

روزمرہ معمول سے اکتائے لوگوں کو مسرت و خوشی کی انمول گھڑیاں عطا کرنے والے تحفے

محمد خلیل چوہدری

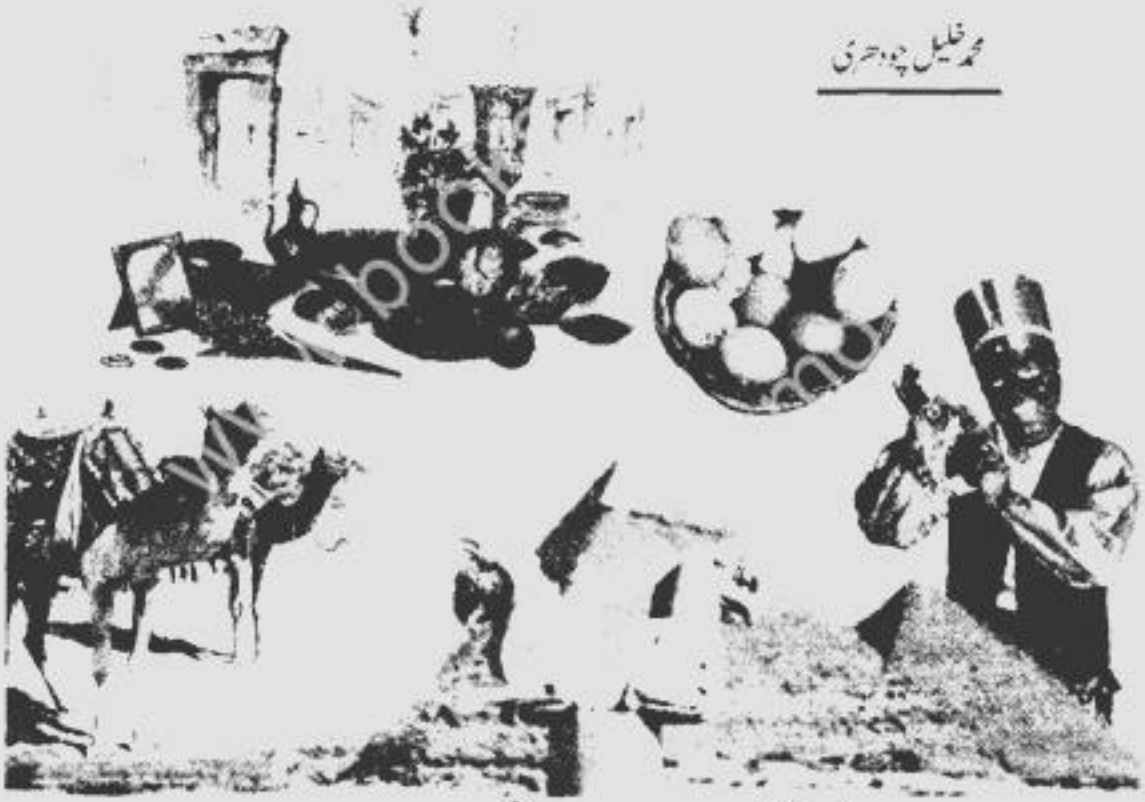

www.pdfbooksfree.pk

عکاظ کا نام نہ ہوگا۔ یہ ایک سالانہ میلا نما بازار تھا جو طائف میں لگتا۔ بہت قدیم وہاں دو چیزیں بہت اہم تھیں: ایک تجارت اور دوسری شاعری۔

جب یہ بازار لگتا، تو وہاں نامی گرامی شعرا اپنے اپنے قصیدے سناتے۔ اس شاعرانہ مقابلے کے باقاعدہ جج ہوتے۔ اوّل آنے والے قصیدے کو خانہ کعبہ کی دیوار پر ایک سال کے لیے لٹکا دیا جاتا۔ وہ تمام شاندار قصیدے جنھیں یہ شرف حاصل ہوا، انھیں شوق سے ''معلقات'' کہا جاتا ہے۔ عربی شاعری سے شغف رکھنے والے آج بھی معلقات شوق سے پڑھتے ہیں۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے، اخباروں میں آیا کہ مکہ المکرمہ کے گورنر، شہزادہ خالد الفیصل سوق عکاظ کا احیا چاہتے ہیں۔ وہ خود بھی نامور شاعر ہیں۔ عربی معاشرے میں شروع سے شعرا کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حال ہی میں مرحوم ہونے والے شاہ عبداللہ جب ولی عہد تھے، تو انھوں نے ریاض کے قریب واقع علاقہ جنادریہ میں لوک میلے کا آغاز کیا۔ یہ ثقافتی میلا دو ہفتے چلتا۔ اس میلے کا سب سے دلچسپ آئٹم اونٹوں کی دوڑ تھی۔ اس کے علاوہ لوک موسیقی اور ناچ بھی میلے کا حصہ تھے۔ کاہر اور میدے سے بنا روایتی کیک مہمانوں میں تقسیم ہوتا۔ سعودی لوک ناچ ''عرضہ'' فتح کا رقص ہے۔ نوجوان لڑکے یہ رقص ہاتھ میں تلوار پکڑ کر کرتے اور ساتھ ساتھ فتح کی خوشی کے گانے گاتے۔

مصر میں شم النسیم کا تہوار بہت اہم ہے۔ اس تہوار کی تاریخ چار ہزار سال پرانی ہے۔ یہ جشن ماہ اپریل میں ایسٹر کے فوراً بعد منایا جاتا ہے۔ یہ بہار کی آمد کا جشن ہے۔ مسلمان اور مسیحی، سب یہ تہوار مناتے ہیں۔ شم النسیم کے لفظی معنی تازہ ہوا میں سانس لینا ہے۔

صاحب تحریر

دینہ کے پُرفضا مقام پر جنم لینے والے محمد خلیل چودھری پچھلے ۲۲ برس سے طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ اسی لیے کتب و رسائل شوق سے خریدتے اور قلم کاری بھی کرتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ سمیت وطن عزیز کے مختلف علمی و ادبی رسائل میں آپ کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریریں معلومات افروز ہوتی ہیں اور دلچسپ بھی۔

اس دن دریائے نیل میں بے شمار کشتیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ خاص طرز کی مچھلی پکاتے ہیں۔ انڈے ابال کر ان کے اوپر رنگ کیا جاتا ہے۔ وہ پھر مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ کرۂ ارض پر آفرینش حیات اسی روز ہوئی تھی۔ تب مصر میں لوگ انڈے ابال ان کے اوپر دعائیں اور نیک خواہشات لکھ درختوں پر باندھ دیتے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اس طرح یہ دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں۔ اب یہ اعتقاد تو بدل چکا البتہ روایت کے طور پر رنگین انڈے اب بھی شم النسیم کا حصہ ہیں۔

جشن نوروز

یہ تہوار ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نوروز آمد بہار کی علامت ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ۲۱ مارچ کو روز و شب کا دورانیہ بالکل برابر رہتا ہے۔ تب سورج برج حوت سے نکل کر برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔ نوروز دراصل ایرانی جشن بہاراں ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

لیکن اب یہ افغانستان، پورے وسطی ایشیا اور ترکی کے مشرقی حصے میں بھی منایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم میں مختلف علاقوں کے والی نوروز کے دن شہنشاہ آریہ مہر کے پاس بیش بہا تحفے تحائف لے کر حاضر ہوتے۔ پورے ملک میں جشن کا سماں ہوتا۔ ان علاقوں میں برف باری خوب ہوتی ہے۔ لیکن اکیس مارچ تک برف پگھل جاتی اور سبز رنگ ہر طرف نمایاں ہو جاتا۔ اب تہران، تاشقند اور دوشنبے جیسے شہروں میں اکثریت فلیٹوں میں رہتی ہے۔ لہٰذا لوگ گملوں میں گندم کے بیج ڈال دیتے ہیں۔ نوروز پر یہ گملے بہار کی علامت بن جاتے ہیں۔

تاجکستان کے باشندے خصوصاً رقص و سرور کے دلدادہ ہیں۔ وہاں جشن نوروز کے موقع پر ہر طرف موسیقی کے سر بکھیرے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں شوخ رنگوں والی ریشمی قمیصیں پہنتی ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں تاجکستان نیا نیا خانہ جنگی سے نکلا تھا۔ تاجک عمومی طور پر افسردہ تھے۔ کیونکہ دوشنبے میں پچاس ہزار لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن نوروز جیسے تہوار اور جشن غم بھلانے کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ جشن نوروز دوبارہ منانے لگے۔ ۲۰۱۰ء میں یونیسکو نے اس تہوار کو انسانی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ یہ جشن اب بہت بڑے خطے میں منایا جاتا ہے۔

پانی کا میلا

رنگون میں آبی میلا (واٹر فیسٹیول) بڑے اہتمام سے برما کے دارالحکومت، منایا جاتا ہے۔ یہ برما کے علاوہ تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں بھی منعقد ہوتا ہے۔ یہ موسمی تہوار ہے۔ اپریل کے وسط میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اپریل اس علاقے کا گرم ترین مہینا ہے۔ آبی میلے کے بعد موسم برسات شروع ہو جاتا ہے۔ وہ چھے ماہ جاری رہتا ہے۔ گویا یہ میلا برسات کا استقبال ہے۔

اسی دن لوگ سڑکوں پر نکل کر ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہیں۔ بنکاک میں دریا میں ڈریگن ریس ہوتی ہے۔ یہ ایسی کشتیوں کی دوڑ ہے جو اژدہے کی شکل میں بنائی جاتی ہیں۔ گھر کی پرانی اشیا باہر پھینک یا غریبوں کو دی جاتی ہیں۔ آبی میلے کے تیسرے روز گوتم بدھ کے مجسمے دھوئے جاتے ہیں۔ تازہ نارنیں، کیلے کے پتوں پر رکھ کر بدھ بھکشوؤں کو تحفتہ دیتے ہیں۔

برف کے میلے

کینیڈا میں عجیب و غریب "کیوبک وِنٹر کارنیوال" منعقد ہوتا اور جاڑوں کی شکل میں چلتا ہے۔ سخت سردی کے موسم میں یہ پریڈ رات کو ہوتی ہے۔ کینیڈا میں پانچ ماہ سخت سردی پڑتی اور ہر طرف برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ یہ کارنیوال کیوبک شہر میں ہوتا ہے۔ لوگ برف سے مجسمے بناتے ہیں۔ مختلف فلوٹ کارنیوال میں آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لوگ رقص و سرور میں مشغول ہوتے ہیں۔

دراصل کینیڈین طویل موسم سرما کے دوران گھروں میں بیٹھ بیٹھ کر اکتا جاتے ہیں۔ لہٰذا موسم کی بوریت ختم کرنے کے لیے سردیوں میں بھی ایک روزہ میلے لگتے ہیں۔ اگر ویک اینڈ ہو اور دھوپ نکلی ہو، تو برف سے بھی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ برف کے مجسمے بناتے اور چھوٹی چھوٹی دکانیں لگا کر دستکاریاں بیچتے ہیں۔ اس مارکیٹ کو فی (Flea) مارکیٹ کہا جاتا ہے۔ انہی برف کے میلوں کے تناظر میں ایک شعر آپ بھی سنیے۔

کل دھوپ کے میلے میں خریدے تھے کھلونے
جو موسم کا پتلا تھا، وہ گھر تک نہیں پہنچا

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں میلے لگتے ہیں تاکہ لوگ خوشیاں منا سکیں اور مزے سے وقت گزاریں۔ دیگر میلوں کا احوال پھر کبھی سہی! ◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

اچھی خاصی معقول لگنے والی

وہ لڑکی تو ٹھگ نکلی

دوست کے بھیس میں لٹیرن بنی
ایک دوشیزہ کا عبرت اثر ماجرا

راحت عائشہ

"اوہ آج بھی مجھے دیر ہو گئی، کیا سر آ گئے؟" ثوبیہ نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ مہینے میں بیس دن اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا۔

"نہیں، سر تو نہیں آئے لیکن آپ پانچ منٹ ضرور دیر سے آئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، تو اس کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے ایک نظر حمیدی صاحب والے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی اور بے وجہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ثوبیہ کو اچانک پریشانی سے آزادی پا لے تو یونہی اکثر وقت بے بات کھلکھلا کر ہنسنے کی عادت تھی اور شاید اسے معلوم بھی تھا کہ وہ ہنستی ہوئی بہت پیاری لگتی ہے۔

"تمہیں تو معلوم ہے، پہلے صبح صبح امی کو ناشتہ کروانا، پھر دوائیں کھلانا، تیاری کرنا اور دو دو بسیں بدل کے یہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام تو نہیں نا؟" اس نے حسب عادت اپنی بات کر کے میری طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں بھائی... "ورکنگ وومن" کے ساتھ یہ مسئلے تو ہوتے ہی ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"معاف کرنا بھئی، میں عورت نہیں لڑکی ہوں۔" اس نے ادا سے کہا اور ہم دونوں ہی ہنس دیے۔

"اچھا تو لڑکی صاحبہ یہ فائل دیکھیے، یہ خط ابھی ٹائپ کر کے سر کو نظرثانی کو بھجوا دو۔ یہ کل کا کام ہے جو رہ گیا تھا، ورنہ حمیدی صاحب نے صبح صبح ہی گردن پکڑ لینی ہے۔"

***

ثوبیہ اور میں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ مجھے اس دفتر میں آئے دو سال ہو چکے تھے۔ پہلے میرے ساتھ ایک اور لڑکی بیٹھا کرتی تھی، لیکن چھ سات ماہ

www.pdfbooksfree.pk

قبل اس کی شادی ہوئی، تو وہ ملازمت چھوڑ گئی۔ کمپنی نے اس کی جگہ ثوبیہ کو ملازمت دے دی۔

بریرہ، ثاقب، عمرانی، کامران اور ثوبیہ دفتر میں سب سے زیادہ میرے قریب تھے۔ ہماری میزیں بھی ساتھ تھیں۔ ہم کھانا بھی اکٹھے کھاتے۔ کچھ میری بھی لیے دیے رہنے کی عادت تھی۔ دفتر میں مرد ملازمین زیادہ تھے، میں بس کام کی حد تک ہی ان سے بات کرتی یا آتے جاتے ہوئے سلام دعا ہو جاتی۔

ثوبیہ تو مجھ سے دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔ وہ بس اپنی دنیا میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے شاید اپنے حسن کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے بات چیت کرنا چاہی، تو آگے سے اس کا رویہ بڑا روکھا ہوتا۔ چنانچہ بات آگے نہ بڑھتی۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اگرچہ گھر کے حالات بقول اس کے اچھے نہ تھے۔ صرف ایک بیمار والدہ تھیں اور ایک بھائی جو بیرون ملک جا کر ماں بہن کو ایسا بھولا کہ اب اس کی کوئی خبر نہیں۔ اسی بنا پر ماں بیٹی نے بھی اسے بھلا دیا۔

وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔

* * *

"واہ ثوبیہ! اتنا خوبصورت جوڑا کہاں سے لیا؟"

آج وہ جو لباس پہن کر آئی تھی، اسے دیکھ کر میں بے ساختہ تعریف کر اٹھی۔ وہ سوتی لان اور شیفون چادر کا حسین جوڑا تھا جس پر ہاتھ کا کام تھا ساتھ چھوٹے بڑے مختلف قسم کے نگوں سے مزید دیدہ زیب بنایا گیا تھا۔

"طارق روڈ سے لیا ہے۔ واقعی بہت اچھا لگ رہا ہے؟" اس نے دوپٹے کا کونا ناز سے پکڑ کر مجھے گھوم کر دکھایا۔

میرے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "اچھا بس سکون سے بیٹھو، ماڈلنگ کا نہیں کہا میں نے... سامنے سے صدیقی صاحب بھی دیکھ رہے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسٹول پہ بٹھایا۔

"اوہ... اف..." وہ جھٹ اسٹول پہ بیٹھ گئی۔

"ایک تو یہ آدمی بھی نا! اب بندہ ان سے پوچھے کہ تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟" آواز آہستہ کیے اس نے منہ ٹیڑھا کرتے ڈائیلاگ بولا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا بتاؤ کتنے کا لیا؟" میں نے حسرت اور رشک سے پھر جوڑے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ساڑھے تین ہزار روپے کا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہم رنگ نیکلس سے سجے نگوں والے ہاتھ میں تھام لیا۔

"کیا؟ ساڑھے تین ہزار؟ ایک جوڑے کے لیے اتنے روپے خرچ کر دیے! پھر اور اخراجات، گھر اور امی کی دوائیں وغیرہ؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ارے کچھ نہیں یار! ایک ہی تو شوق ہے، اچھے کپڑے پہننے کا۔ اب اتنی محنت کرتی ہوں، تو کیا اتنا بھی اپنے لیے نہ کروں؟" اس نے سنجیدہ سی شکل بنائی۔

"ہاں یہ بھی ہے۔ لیکن تمھیں کچھ بچت بھی کرنی چاہیے۔" میں نے صاف گوئی سے اسے مشورہ دیا۔ ہماری دوستی اتنی پکی ہو چکی تھی کہ وہ میری اور میں اس کی کسی نصیحت کا برا نہ مانتی۔ کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت

بھی ہوتی کہ گھریلو حالات کے برعکس اس کے چہرے بہت شاندار ہیں۔ جو زیورات پہنتے اور سجنے کا سلیقہ بھی تھا، اس لیے وہ خوبصورت نظر آتی۔ لیکن اتنے مہنگے ملبوسات!''خیر شوق کا کوئی مول نہیں'' یہ سوچ کر میں اپنی حیرت کو تھپکیاں دے دیتی۔

تقریباً ایک مہینے سے وہ روز دوسرے تیسرے دن دس پندرہ منٹ دیر سے آ رہی تھی۔ آخر اس نے دیر سے آنے کے لیے دفتر سے اجازت لے لی۔ دراصل اس کی والدہ بہت بیمار تھیں۔ حمیدی صاحب اچھے باس ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی تھے جنھیں دوسروں کی مجبوریوں سے سمجھوتا کرنا آتا تھا۔

''نورا آج میں نے امی کو نانی کے گھر چھوڑ دیا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے نا۔ وہ اصرار کر رہی تھیں کہ تم لوگ کچھ دن پہلے آ جاؤ۔''

ثوبیہ نے ٹائپ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

''چلو اچھی بات ہے، ان کا بھی دل بہل جائے گا اور تمھیں بھی سکون رہے گا کہ انھیں کوئی دیکھنے والا ہے۔'' میں نے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف کر کے جائزہ لیا کہ اس کا مزید کتنا کام رہ گیا ہے۔

''ہاں ... یہ تو ہے ... ویسے یار، مجھے تم سے کچھ چاہیے۔'' اس نے لیپ ٹاپ کا رخ میری طرف کر کے فائل بھی مجھے تھما دی۔ مدعا یہ تھا کہ آگے سے میں ٹائپ کرنے لگوں۔

''ہاں ... بولو ...'' میں نے مصنوعی غصے سے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ حسبِ عادت کھلکھلا کے ہنس دی اور بولی ''ایسے گھور گھور کے غصے سے دیکھو گی تو میں کیسے مانگوں؟''

''فی الحال میں آپ سے ملنے نہیں بخشنے پر غور کر رہی ہوں۔'' میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر ٹائپنگ شروع کر دی۔ ''اچھا خیر اب بولو بھی کیا چاہیے؟''

''یار کزن کی شادی کے لیے کچھ جوڑے اور زیور چاہییں۔ مجھے علم ہے تم یہاں پہن کر نہیں آتیں لیکن تمھارے پاس کافی اچھا مال موجود ہے۔'' دراصل میں اسے اپنے گھر میں ہونے والی تقاریب کی تصویریں دکھا چکی تھی۔ اسے میرے کپڑے اور جیولری بہت پسند آئی تھی۔

اس نے بات کرتے کرتے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں کہا ''تم ٹھیک کہتی تھیں کچھ بچت ہونی چاہیے۔ دیکھو اب میرے پاس کچھ رقم نہیں۔ اور شادی جیسی تقریب میں پہننے والے کپڑے بہت دقیانوسی ہیں، عجیب و غریب

اب وہ تو نہیں پہن سکتی۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمھاری چیزیں ویسے ہی واپس کر دوں گی۔'' اس کا جھکا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔

''اوہو ... بس اتنی سی بات تھی۔ ہاں لے لینا ویسے بھی اتنے زرق برق کپڑے قریبی لوگوں کی شادی میں ہی پہنے جاتے ہیں۔ یوں ہی تو رکھے ہیں، اچھا ہے تمھارے کام آ جائیں، کچھ تو قیمت وصول ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اوہ ... میری نور ... دل کا سرور ... ہزاروں سال جیو تم ضرور ... بہت بہت شکریہ۔ تمھیں نہیں پتا تم نے میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔'' وہ چہک اٹھی۔

''اچھا بس اتنی بڑی کوئی قربانی بھی نہیں دے رہی۔'' میں نے اسے شکریہ ادا کرنے سے روکتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوتے ہیں۔"

"اور ویسے ہم رشتے داروں میں تو آج کل ایسا ہی چلتا ہے۔ تم بھی میری بہن کی طرح ہو۔"

لیکن پھر بھی اس کی زبان آخر تک میری تعریف میں رطب اللسان رہی یہاں تک کہ مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

اس رات میں نے پچھے قیمتی جوڑے جو چند ماہ قبل ہی اپنے بھائی کی شادی پر بنائے تھے، وہ پلاسٹک کے لفافوں میں رکھ لیے۔ جیولری کے ساتھ ہی اپنا طلائی کڑا بھی رکھا جو میرے بھائی نے اپنی شادی پر مجھے تحفہ دیا تھا۔ ثوبیہ نے یاد دلا کر کہا تھا "بس صرف ایک دن کے لیے اگر ہو سکے، تو وہ بھی دے دینا۔ میری بہن جیسی نند کی شادی ہے اور میں سب سے منفرد نظر آنا چاہتی ہوں۔" ثوبیہ کی باتیں سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

صبح اٹھ کر نماز کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کپڑوں اور جیولری کی دونوں لفافے تیار کر لیے تاکہ جاتے وقت لے جاؤں، ورنہ اگر امی کے سامنے تیاری کرتی، تو انھوں نے وہیں کسٹم آفیسر کی طرح روک لینا تھا۔ لڑکی (ثوبیہ) نے "بائیوڈیٹا" کے ساتھ انھیں یہ رسید بھی چاہیے ہوتی کہ وہ کب واپس لائے گی۔ پھر ہمارا گھر بہت بڑا تو تھا ہی نہیں، بھابیوں تک یہ خبر نشر ہو جاتی کہ میں اپنے قیمتی جوڑے کسی انجانی لڑکی کو دے آئی ہوں۔ لہٰذا میں نے پہلے مرحلے ہی پر اپنا بچاؤ کر لیا۔

یوں بھی دو بڑی بہنوں اور بھائیوں کی شادی کے بعد فی الحال میں گھر میں اکلوتی ہی تھی اور مجھے اکثر ایسے کام اکیلے ہی کرنے پڑتے۔

٭٭٭

"اوہ... شکریہ کہ تم جوڑے لے آئیں ورنہ میں تو پوری رات دعائیں کرتی رہی کہ تم بھول نہ جاؤ۔" سلام دعا کے بعد سب سے پہلے وہ شروع ہو چکی تھی۔

دونوں لفافے میں نے اپنی الماری میں رکھ دیے۔ جلد ہی دفتر میں دوسروں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

"ذرا تم میرے ساتھ گلشن اقبال تک چل سکتی ہو؟" ثوبیہ نے کھانا کھاتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"میں؟ نہیں بھئی گھر میں نہیں بتایا، میری امی پریشان ہو جاتی ہیں" میں نے انکار کر دیا۔

"بس یار، وہ دور کا کام نہیں۔ دراصل ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ انھوں نے کچھ رقم قرض دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ قریبی رشتے دار بھی لگتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے نا آج کل امی کی ادویہ کا خرچہ اور پھر شادی کے اخراجات..." وہ میری منتیں کرنے لگی "ویسے بھی تمہارے راستے ہی میں آئے گا۔ صرف پندرہ منٹ کی بات ہے، کیا فرق پڑے گا۔"

وقفہ طعام تک میری نہ ہاں میں نہیں بدلی۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا کہ میں اپنی کسی دوست کے رشتے دار کے گھر منہ اٹھا کر چلی جاؤں۔ لیکن وہ مسلسل مجھ سے مطالبہ کرتی رہی، وہی جذباتی بلیک میلنگ۔

میں نے کہا "یار اتنے بڑے بڑے گھر ہیں وہاں... پھر سنسان راستہ... کوئی ڈاکو قیمتی ملبوسات و زیورات چھین کے بھی بھاگ سکتا ہے۔" لیکن اس نے یہ خطرہ ہنسی میں اڑا دیا۔ آخر اس نے مجھے قائل کر ہی لیا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے دس پندرہ منٹ دیر ہونا اتنی بڑی بات نہیں۔ اور یہ کہ میں اپنی امی کو واپس جا کر بھی بتا سکتی ہوں۔ کہ آج دیر سے کیوں آئی۔

www.pdfbooksfree.pk

شام 5 بجے جب ہم بنک سے نکلے، تو ایک ایک لفافہ سنبھال لیا۔ کچھ لوگوں نے لفافے حیرت سے دیکھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کسی سے زیادہ "فری" نہیں تھیں لہٰذا کسی نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔

بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے نجانے کیوں کچھ میرے دل میں عجیب وسوسے آنے لگے۔ ویسے تو کسی کی زندگی کا بھروسا نہیں ... اور کراچی میں رہتے ہوئے یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نجانے کس وقت کیا ہو جائے۔ اپنے گھر سلامت پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ اس لیے کم از کم گھر والوں کو پتا ہونا چاہیے کہ میں کہاں ہوں۔ اگر خدانخواستہ وہاں بم پھٹ جائے، تو میرے گھر والے کم از کم ڈھونڈ تو سکیں۔

"لاحول ولا..." میں نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو ڈپٹا "کیا فضول باتیں سوچ رہی ہو؟" اس وقت ثوبیہ بھی خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن خوشی اس کے چہرے سے چھلکتی نظر آ رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو چہرے پڑھنے میں بڑا ماہر سمجھتی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر بہت کچھ پانے کی مسرت دکھائی دی۔

"خیر یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ میں نے اس کی ایک بڑی پریشانی دور کر دی۔ اس لیے یہ خوش ہے۔ اس میں چہرہ پڑھنے کی کیا مہارت ہوئی ...؟" کچھ دیر بعد ہی بس آ گئی۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں گم گلشن چورنگی تک پہنچ گئے۔

"آؤ نور ..." اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔

میرا دل چاہا کہ اترنے سے انکار کر دوں، میرے گھر کا آدھا راستہ ابھی باقی تھا۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ ثوبیہ مجھے وعدہ خلاف سمجھے گی۔ پھر پتا نہیں بیچاری کے ساتھ کیا بیتے، پانچ دس منٹ کی تو بات ہے۔ میں نے قدم بڑھا دیے۔

"شکریہ ... میں تو سوچ رہی تھی، ایسا نہ ہو تم اترنے سے انکار کر دو۔" ثوبیہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اتنی وعدہ خلاف بھی نہیں۔" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر برہمی کا اظہار کیا۔ وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آؤ نور ... یہاں سے رکشا لے لیتے ہیں۔ کافی دور جانا ہے۔"

"کیں!!! کافی دور، تم نے تو کہا تھا کہ یہاں سے قریب ہی ہے" میں نے اسے گھور کے دیکھا۔

"یار رکشے میں جاتے ہوئے قریب ہی ہے" اس نے قریب کھڑے رکشے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا، تو مجھے اس کی تقلید کرنی پڑی۔

جلد ہی رکشے میں بیٹھے ہم ثوبیہ کی بتائی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اندرونی گلیاں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا یہاں بھی ہماری نانی کا گھر ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں یہ علاقہ بہت دیکھا تھا۔ جب نانی کے گھر آتے، تو خالہ کے ساتھ باغ جاتے۔ کبھی نانا اور ماموں کے ساتھ دکان سے چیز لینے نکلتے۔ کچھ دھندلی سی یادیں اس علاقے کے ساتھ اب بھی وابستہ تھیں۔ پھر انھوں نے گھر تبدیل کر لیا۔ اب تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ شاپنگ سینٹر، بڑے بڑے اسکول، بلند و بالا عمارتیں ... مجھے محسوس ہوا، ثوبیہ شاید اپنی منزل کا راستہ بھول چکی۔ کیونکہ اب وہ آگے پیچھے کی مختلف گلیوں میں رکشے والے کو گھما رہی تھی۔

"نور! تم پریشان نہیں ہونا، میں اپنی امی کے ساتھ یہاں آ چکی ہوں۔ مجھے گھر معلوم ہے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ پریشانی میں کتنے دلاسا دینے کے ساتھ خود بھی کھل

www.pdfbooksfree.pk

سے رہی ہے۔ چار پانچ گلیوں بعد ایک بڑے گھر کے آگے رکشا رکوا اس نے ادائیگی کی اور میرا ہاتھ پکڑ اندر داخل ہو گئی۔

اس بڑے سے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں مجھے بیٹھنے کی ہدایت کر کے وہ نجانے کہاں غائب ہو گئی۔ دونوں لفافے بھی اس کے پاس تھے۔

"چلو خیر وہ تو اس کو دینے تھے" میں نے دل کو تسلی دی۔

پانچ ..... چھے ..... سات ..... آٹھ منٹ مجھے یونہی انتظار کرتے گزر گئے۔ "آخر گئی کہاں یہ؟" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

میں اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ ڈرائنگ روم کے آگے لاؤنج اور اس سے آگے کمروں کے دروازے بند نظر آ رہے تھے۔ "کسی کے گھر میں یوں ایسے چلنا پھرنا نہایت نامعقول بات ہے۔" میں نے خود کو ٹوکا۔

جب میں گھر کے صحن میں پہنچی، تو اسی وقت مجھے بالائی منزل سے ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔ وہ اپنی آستینوں کے کف بند کرتا سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ میرے ذہن میں یکایک سائرن سا بجنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے ادھر ادھر دیکھے بغیر باہر والے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ آدمی بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ اپنے بھاری وجود کے ساتھ میرے پیچھے دوڑ پڑا۔ جب تک وہ پیچھا کرتے میرے قریب پہنچا، میں اگلی گلی تک آ چکی تھی جہاں بہت رش تو نہیں تھا لیکن اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

"میرے ساتھ واپس چلو۔" قریب پہنچ کر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور چیخ کر اسے کہا "یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں کہتا ہوں میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہارے پیسے دیے ہیں۔"

ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے لگا، شاید اب میں اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکوں۔ لیکن میں پوری طاقت سے چیخی "اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں چیخ چیخ کے لوگوں کو جمع کر لوں گی۔ میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا لیکن تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

> بیس پچیس منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں میں جان نہیں۔

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ اسی وقت مجھے ایک رکشا آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ دیا۔ رکشے کو آتا دیکھ کر وہ آدمی پیچھے ہٹ گیا۔ قریب آنے پر میں دھڑکتا دل لیے اس میں بیٹھ گئی۔ بیس پچیس منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں میں جان نہیں۔ لیکن پھر اچانک احساس ہوا کہ مجھے گھر میں اس طرح داخل نہیں ہونا چاہیے کہ سب دیکھ کر پریشان ہو جائیں اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے۔ تب مجھے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی گنہگار ٹھہرایا جاتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے پوری کوشش کی کہ بدحواس نہ نظر آؤں۔ لیکن امی کا سامنا ہوتے ہی انھوں نے پہلا سوال یہی کیا "کیا ہوا تمہیں؟"

اس ایک حرفی جملے کے بعد مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ امی یہ دیکھ کر مزید گھبرا

www.pdfbooksfree.pk

گئیں۔ ”ارے کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”امی! آپ کی بیٹی آج بچ گئی“ مجھ سے روتے ہوئے بس یہی کہا گیا۔

”ارے کیا کہہ رہی ہو بیٹا... انسان کی جتنی زندگی ہوتی ہے، اسے پوری ملتی ہے۔ چلو ہاتھ منہ دھولو، فضیلہ بھی آرہی ہوگی بس۔“ انھوں نے بھابی کا ذکر کیا۔ ان کا خیال تھا، شاید میں سڑک پر کوئی حادثہ دیکھ کر ڈر گئی ہوں۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن رات کو میرے پاس بیٹھ کر اطمینان سے سارا واقعہ سنتے ہوئے جتنی بار انھوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مجھے محفوظ و مامون رکھنے پر دعائیں دیں، انھیں سنتے ہوئے اپنے اندر سکون سا اترتا محسوس ہوا۔

دو دن کی چھٹی کے بعد جب دفتر گئی، تو سب سے پہلے حمیدی صاحب کے پاس جا کر ثوبیہ سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ میرا سنجیدہ چہرا دیکھ کر حمیدی صاحب بھی گھبرا گئے۔ ”خیریت نورالہدیٰ! کیا ہوا؟“ انھوں نے استفسار کیا۔

میں نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ ساری بات سن کر وہ اپنا سر پکڑ کے رہ گئے۔ پھر بولے۔ ”اچھا آپ رکیے، میں اس کی معلومات کرواتا ہوں۔“

انٹر کام اٹھاتے ہوئے انھوں نے مجھے تسلی دی ساتھ نائب قاصد کو گھنٹی بجا کر کمرے میں آنے کی ہدایت دی۔

اکثر بیرونی دفتری کام زوہیب کے سپرد تھے۔ حمیدی صاحب نے ایک فارم پر سے ثوبیہ کے گھر کا پتا نکالا اور اسے زوہیب کو دیتے ہوئے ہدایت دی کہ لڑکی کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی جائیں۔

میں واپس اپنی جگہ پر آگئی لیکن کام میں میرا دل نہیں لگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد زوہیب واپس آیا۔ وہ سیدھا حمیدی صاحب کے کمرے ہی میں چلا گیا۔ دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن یوں جانا مناسب نہ لگا۔ کچھ دیر بعد حمیدی صاحب نے مجھے بلوا بھیجا۔

”جی سر آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”جی آیئے نور“ انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی پر براجمان ہوئی، تو وہ بولے۔

”نورالہدیٰ، زوہیب کی رپورٹ کے مطابق ثوبیہ نے جو پتا دیا تھا، وہاں اس نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔ اس کے سارے کاغذات جعلی ہیں۔ میں نے اپنے ایک پولیس افسر کو کہہ دیا ہے کہ وہ اس دھوکے باز لڑکی کا پتا چلائے۔ تم بھی ہوشیار ہو جاؤ اور آئندہ ایسی چال باز لڑکیوں کے جال میں نہ پھنسنا۔“

اس نصیحت کے ساتھ انھوں نے مجھے اپنی نشست پر واپس بھیج دیا۔ اس دن سے میرا دوستی جیسے رشتے سے اعتبار اٹھ گیا۔ آج بھی جب اس قسم کی خبر سنتی ہوں کہ کوئی لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوئی، تو نجانے کیوں شک سا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ بھی ایسی ہی ہو جیسا میرے ساتھ ہوا۔

میں سوچتی ہوں، اگر خدانخواستہ اس دن ثوبیہ کا گروہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہو جاتا، تو میرے پیچھے سارے اچھے جوڑے اور جیولری غائب دیکھ کر سب کا ذہن اسی طرف جاتا کہ یقیناً میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ گئی ہوں۔ ایسی صورت حال میں گھر کی عزت روندنے والی لڑکی کو تو تلاش کیا جاتا لیکن یہ سچ ڈھونڈنے کی سعی بالکل نہیں ہوتی کہ غائب کیسے ہوئی؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

تازہ افسانہ

ایک باپ نے کیا فیصلہ

میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا

پیار و محبت پر جب دولت کی ہوس غالب آ جائے تو طمع پسندوں کو سبق سکھانا پڑتا ہے

سلمیٰ اعوان

ظہیر احمد بڑا خوبصورت اور قد آور نوجوان تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تینوں بھائیوں میں بھی بڑا نامور۔ میٹرک میں وظیفہ لے کر زرعی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ایم ایس سی تک اس نے تعلیمی میدانوں میں ٹرافیاں جیتیں اور امتحانوں میں میڈل لیے۔

اقبال اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ بڑے چھوٹے قد، مردانہ ڈیل ڈول کی مالک۔ ذہانت اور نسوانیت سے عاری۔ اقبال کے گھر والوں کی ایک عرصے سے ظہیر پر نظر تھی۔ بی ایس سی کرنے کے بعد جب اس نے ایم ایس سی میں داخلہ لینا چاہا تو ماں نے روک دیا۔

"پڑھتے پڑھتے کیا بوڑھا ہونے کا ارادہ ہے۔ اس جتنا پڑھ لیا، اب شادی کرو اور گھر بساؤ۔ پڑھائی میں تو وہ مغز کھپائے جسے نوکری کرنی ہو۔ اللہ کے فضل سے اتنی بڑی جائداد کس نے سنبھالنی ہے؟"

ظہیر احمد ویسے پہ تھوڑی تھا جو ماں کی گفتگو کے رموز نہ سمجھتا۔ بے نیازی سے بولا "اماں جی میں پڑھوں گا۔ پڑھتے پڑھتے بوڑھا ہو جاؤں گا، تب ہی شادی کروں گا اور انھی کے درمیان مروں گا۔"

"کیا اول جلول بکتے ہو۔ بیٹے اسی لیے کہتے ہیں کہ پڑھائی دماغ خراب کر دیتی ہے۔"

وہ یہ سوچ کر اٹھ گیا: کون ان جھگڑوں سے سر پھوڑے؟ اس نے اپنی مرضی کی۔ ایم ایس سی سے فارغ ہوا تو اچھی ملازمت حاصل کی۔ پندرہ دن کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ماں نے اقبال سے شادی کی بات شروع کی۔ پہلی بار وہ کچھ لمحے ماں کی صورت دیکھتا رہا۔ "میں

www.pdfbooksfree.pk

اس سے ملنے آئیں تو نظر نہیں آتی تھیں۔ اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر دفعتاً بولا:

"اماں! میں تمھیں کیا بتا سکتا ہوں؟"

"چاند کا ٹکڑا ہوتا۔" ماں کی نگاہیں محبت سے پڑھ رہی تھیں۔

"تم چاند کا ٹکڑا کسی کے پلے باندھنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

اس کا جی چاہا کہ اپنے خون کو سہارا دے، اپنے سگے پیار کو دامن میں لے تو انسان کی ہزاروں ہے اور اعلیٰ ظرفی بھی۔

"اماں خدا کے لیے اس خاندانی عظمتوں کا مجھے سبق نہ دو۔ میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا۔" وہ پیر پٹختا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مگر یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ تقریباً ایک ایک فرد سارے خاندان میں گردش کرتا پھرنے لگا۔ نمکین آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے آخری بات دہرانا نہیں کرے گا کہ اقبال خاندان کی عزت ہے، وہ اتنے برس سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

اس کے دل سے جیسے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ "خود غرض ہو تم لوگ! اپنے اپنے مفاد نظر آتے ہیں تمھیں۔" وہ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ "میرے لیے کوئی نہیں سوچتا کہ مجھے اپنے معیار کی ساتھی چاہیے۔ ذہنی ہم آہنگی کے بغیر زندگی کیسے گزر سکتی ہے؟ جسے آنکھیں دیکھنا گوارا نہیں کرتیں اسے دل کیسے قبول کرے؟"

مگر اس شوریدہ سر خاندان کے سامنے اس کا دل یہ اہمیت رکھتا تھا کہ ایک زبردست تھی۔ اس کا ذہن ماؤف اور اعصاب جواب دے گئے۔ سارے خواب چکنا چور ہو گئے اور زندگی کی بساط پر بازی الٹ گئی۔ جب پہنچتے تھیں۔ اس کے جانے کی دعوت کا دل والوں کو خبر نہ دی، تو وہ موقع پا کر بھاگ نکلا۔

وہ گاؤں کی تھیں اس شہر سے بھی بھاگ گیا جس کی ایک ایک اینٹ سے اسے پیار تھا۔ اس ملک کو بھی چھوڑ گیا جس کے اس پر بہت سے احسان تھے۔ ان سے دور، رشتوں کے درمیان، دونوں قبیلوں سے دور، ان دیکھی اور ان جانی سرزمین پر اسے سکون کا احساس ہوا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنا بیت کا تمغہ خود دے رہا تھا۔

ایک، دو سال، تین اور پھر پانچ سال گزر گئے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو نہیں خون بہتا تھا۔ تلاش میں کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی۔ ایک دوست کی معرفت اطلاعات کی تو پتا چلا کہ وہ افریقہ چلا گیا ہے، وہاں کون جاتا؟

ماں نے مصلیٰ بچھا لیا۔ رات جب گہری ہوتی، آسمان پر ستاروں کی محفل سج جاتی، تو وہ جیسے اپنے دل کی سے باتیں شروع کر دیتیں۔

"میرے اللہ! میں نے کیا کیا؟ ایک ماں باپ کی بچی کو کہاں دھکیل دیا؟ تو نے اسے بنایا، تو نصیب اچھا نہیں بنا پایا؟ اچھا چلا گیا۔ میں نے اسے جہنم میں جھونک دیا؟ وہ مجھے دوزخ میں دھکیل دے گا۔ اس کا فیصلہ تو کرنے والا ہے۔ میرے گناہ اور خطائیں معاف کر اور بیٹے کی شکل مجھے دکھا۔"

آہ و زاریاں کب تک رنگ نہ لاتیں! پیدا کرنے والے نے اپنے بندے کے قصوروں کو معاف کر دیا۔ پورے آٹھ سال بعد وہ لوٹا۔ ماں نے بیٹے سے لگایا، بہنوں بھائیوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ وہ اچھی خاصی رقم کما لایا تھا۔ گاؤں میں تعمیر کے ارادے تھے اور شہر میں ایک پلاٹ لیا۔ اقبال کو وہ اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ تین سونا اچھلنے لگی اور بیٹا نے پیچھے

www.pdfbooksfree.pk

کی پرورش کرنی۔

پہلے سال بیٹی ہوئی اور دوسرے سال بھی۔ دونوں بیٹیاں صحت مند اور خوبصورت تھیں۔ بیوی وفا شعار تھی۔

نک سک سے آراستہ پیراستہ رہتے، پر بیٹیوں پہ بیٹے کی حالتیں چھائی ہوئی تھیں کہ تعلیم و تربیت کی ہری جہاں کے بغیر بات نہ بنی۔ الجھن اٹھتے پڑتے رہتے کہ ظہیر کی نظروں کے سامنے آتے تو ہوک سی دل میں اٹھتی۔

اس کی کاروباری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھیں۔

ایک شام وہ کسی دوسرے شہر سے واپس تھکا ہوا تھا۔ کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اقبال کو اس کی آمد کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ ساتھ کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ آوازیں اونچی اور صاف تھیں۔ دوسری آواز بیگم قاسم کی تھی جس کے خاندان سے ان لوگوں کے اچھے مراسم تھے۔ اس نے سنا، بیگم قاسم کہہ رہی تھیں:

"ابھی بھی آپ ڈاکٹر کو دکھائیں۔ چھوٹی تہمینہ بھی اب بڑی ہوگئی ہے۔"

"کہتے ہیں دولت عورت کا مقدر ہوتی ہے اور اولاد مرد کا۔ میرے بخت کا جہاں تک تعلق ہے وہ عروج پر ہے۔ مگر اولاد کے لیے اگر ظہیر کی قسمت یہی ہے، تو اس میں میرا کیا دوش؟ دو بیٹیوں میں سے ایک بیٹا بھی تو ہو سکتا تھا۔"

ظہیر جیسے دم بخود رہ گیا۔ اقبال کے لب و لہجے اور انداز میں کتنا تکبر اور نخوت تھی؟

"تو یہ چپ کھڑی ہے اس سب کو اپنا بخت سمجھتی ہے۔ میری محنت، دن رات کے خون پسینے سے کمایا ہوا سرمایہ، میری دلچسپی، لگن، کاروباری ذہانت و فراست اور خدا کی عنایت، اس کی نظر میں کسی حساب میں نہیں۔ بیٹا نہیں ہے، تو قصوروار میں ہوگیا۔ خوب! میں تو

مصنفہ سے ملیے

وطن عزیز کی ممتاز قلم کار، سلمیٰ اعوان سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر افسانوی رنگ میں لکھتی اور سوچ کے نئے در وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کے پانچ افسانوی مجموعے، سات ناول اور چھے سفرنامے شائع ہو چکے۔ تین سفرنامے زیرِ طبع ہیں۔ نت نئی تخلیقات رقم کرنے کا سفر پوری آب و تاب سے جاری ہے۔

"اس پر سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔" یہ سوچ کر بڑی زہرخند ہنسی اس کے ہونٹوں پر ابھری۔

انہی دنوں ایک کیمیکل فیکٹری کی خریداری میں تین چار دن تک وہ بہت الجھا رہا۔ ذرا فارغ ہوا تو وہ ہسپتال چلا گیا جہاں اس کا جگری دوست ڈاکٹر منظور تعینات تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیوں پر ہی تھا کہ وہ بیگ ہاتھ میں پکڑے وہ اسے نظر آیا۔ ظہیر رک گیا۔

"کہیں جا رہے ہو؟" ظہیر نے پوچھا۔

"یار ایک مریضہ کو دیکھنے جانا ہے۔ تم بھی چلو، وہیں باتیں کریں گے۔"

تنگ سی ایک گلی کے قریب ڈاکٹر منظور نے گاڑی رکوائی۔ ظہیر نے اسے تالا لگایا۔ دوست نے دواؤں کا بیگ ہاتھ میں پکڑ اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد تیسری گلی میں پہلے دروازے پر ڈاکٹر منظور نے دستک دی۔ غالباً کوئی انتظار میں تھا۔ بھاگ کر دروازہ کھولا گیا۔ ظہیر نے دیکھا، سامنے ایک لڑکی گھبرائی کھڑی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اماں جی کی؟" منظور نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

"بہت سخت دورہ پڑا ہے۔"

وہ چھوٹے سے صحن اور کمرے والا گھر تھا مگر معلوم نہیں کشادہ اور نکھرا نکھرا کیوں محسوس ہوا۔ ظہیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر منظور مریضہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ گھر میں سلیقہ اور صفائی تھی۔ نہایت معمولی سامان اس طریقے سے رکھا گیا تھا کہ نہ تو جگہ کی تنگی کا احساس ہوتا تھا اور نہ وہ نظروں کو برا لگتا۔ لڑکی لمبے قد اور دبلے پتلے جسم کی تھی۔ شکل اچھی تھی۔ گھر میں خوشحالی ہوتی، تو یقیناً بہت خوبصورت ہوتی۔ آنکھیں سیاہ چمکدار اور موٹی موٹی تھیں۔

ڈاکٹر منظور ٹیکا اور دوائی دے کر ظہیر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار محسوس کرتے ہوئے وہ بولا:

"دمے کی مریضہ ہے۔ موسم کا ذرا سا الٹ پھیر اس بیماری میں عذاب بن جاتا ہے۔ آج کل موسم بہت گرم ہے۔ کمرے کی نیچی چھت بہت جلد تپنے لگے، تو مریضہ کی بیماری بڑھ جاتی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک شادی شدہ ہے جس کے ڈھیر سارے بچے ہیں۔ دوسری یہ عذرا ہے۔ میٹرک بھی تو کر کے پاس کیا۔ ماں مشین چلاتی اور یہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ مسلسل محنت اور پریشانیوں نے اسے چارپائی پر ڈال دیا۔ عذرا ہمت والی لڑکی ہے۔ ایم اے تک پڑھ چکی ہے۔ اب میرے بیٹے، احمد کی کلاس ٹیچر ہے۔ والدین کی میٹنگ میں بیگم سے ملاقات ہوئی۔ یوں تعلقات بن گئے، تو ہم نے بھی تھوڑا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اصل میں اس کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگنا چاہیے۔ اس کے بغیر مریضہ کی حالت سدھرنی بہت مشکل ہے۔"

"یار تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا ورنہ یہ کون سا مسئلہ ہے! کل ہی لگ جائے گا۔" ظہیر بولا۔

اسی دوران عذرا شربت کا جگ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کے آگے تپائی رکھی۔ شربت کی ٹرے اور گلاس رکھے۔ بہت لذیذ شربت تھا۔ ظہیر نے پوچھا، تو ڈاکٹر منظور نے کہا "کیوں عذرا، شربت بازار کا ہے یا گھر میں بنایا؟"

"میں نے خود تیار کیا ہے۔"

جب وہ واپس آ رہے تھے، تو ڈاکٹر منظور نے کہا "شریف لوگ ہیں۔ اور ہاں یار، اس لڑکی عذرا کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی معقول برسر روزگار لڑکا ہو تو بتانا۔ ماں کی جان اس لڑکی کی شادی میں بھی اٹکی ہوئی ہے۔ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔"

ظہیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا رہا۔ جب اسپتال کے کمپاؤنڈ میں گاڑی رکی اور ڈاکٹر منظور نے ظہیر سے باہر آنے کا کہا، تو وہ بولا "نہیں۔ اب چلتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔"

جب وہ جا رہا تھا منظور نے آگے بڑھ کر کہا "بھئی وہ اے سی لگوانا مت بھول جانا۔"

اگلے دن شام پانچ بجے اس نے ڈاکٹر منظور کو فون کر کے بتایا کہ اس کے آدمی اے سی لگا آئے ہیں۔ مگر ایک نظر وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے پاس آ جائے تاکہ اکٹھے چلیں۔ مگر ڈاکٹر منظور نے جانے سے معذرت کی کہ وہ اس وقت فارغ نہیں اور کہا "یار تم ہی ذرا ہمت کرو اور چکر لگا آؤ۔"

اس نے امید بھرے لہجے میں کہا "خدا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ تم جیسے دریا دل لوگوں کو بہت دے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

شام ڈھل گئی تھی۔ چراغ بس تھوڑی دیر میں جلا چاہتے تھے جب وہ عذرا کے گھر داخل ہوا۔ چارپائی پر نیم دراز ماں کی حالت بہتر تھی۔ اس نے سلام کیا۔ معمر عورت نے اسے قریب بٹھایا۔ شانوں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ عذرا بہت پریشان ہے۔ خاتون نے اس سے گھر داری کے بارے میں سوالات کیے اور یہ جان کر کہ اس کے ہاں اولاد نرینہ نہیں، اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ ''خدا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ تم جیسے دریا دل لوگوں کو بہت دے گا۔''

اس نے شربت پیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اٹھنے سے پہلے اس نے ایک لفافہ تکیے کے نیچے رکھنا چاہا، مگر عذرا نے بڑھ کر اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جس سرعت سے وہ گھر سے نکلنے لگا، اسی سرعت سے وہ اس کے پیچھے لپکی۔ برآمدے میں وہ رک گیا۔ عذرا اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں گہرا اضطراب تھا۔ وہ بڑی مدھم اور شکستہ سی آواز میں بولی

''میری عدم موجودگی میں آپ نے آکر اسے دی تو رکھ لیے گئے ورنہ میں لینے نہ دیتی۔ آپ میری بات کا برا نہ مانیں۔ ہم جیسے لوگوں کے پاس عزت نفس کے سوا اور ہے ہی کیا؟''

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ساٹھ کلو واٹ کے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زرد لگ رہا تھا۔ چمکتی خوبصورت آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی موجزن تھی۔ ایک پل ظہیر اسے دیکھتا رہا، پھر ٹھہری سی آواز میں بولا ''میرے پاس دولت خدا کی امانت ہے جسے کسی بھی غرض مند انسان پر صرف کرنا گویا اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا ذرا سا دکھ بانٹ کر مجھے جو خوشی اور سکون ملتا ہے، کیا آپ مجھے اس سے محروم کرنا چاہتی ہیں؟''

وہ گم صم کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے...تو وہ جیسے چونکی اور بولی ''مگر اس کی تو قطعی ضرورت نہیں۔ میری تنخواہ ہمارے لیے کافی ہے۔'' اس نے لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' ظہیر نے نرمی اور شفقت سے کہا۔ پھر غیر ارادی طور پر اس نے عذرا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر لفافہ ان میں بند کرتے ہوئے کہا:

''میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ تمھیں اس کی ضرورت ہے یا نہیں!''

وہ بوکھلا سی گئی۔ چپ چاپ لفافہ پکڑ لیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور بولا ''اگر میں تھوڑا سا شربت اپنے لیے بنوانے کی فرمائش کروں تو...''

''ارے...'' وہ جیسے کھل اٹھی۔ ''آپ کو اتنا پسند آیا ہے، میں ضرور بنا دوں گی۔'' ظہیر رخصت ہوا، تو وہ دروازے کی چوکھٹ ہاتھوں میں پکڑے دیر تک کھڑی یہ سوچتی رہی کہ کیا کچھ لوگوں میں دولت کے باوجود دل زندہ رہتا ہے؟

اگلے دن وہ اپنی نئی فیکٹری کے دفتر میں مصروف تھا۔ پروجیکٹ منیجر نے فون پر اطلاع دی کہ یوریا پلانٹ کی گیس لیک کر گئی ہے اور وہ بند ہو چکا۔ وہ سارے معاملات چھوڑ کر ساہیوال چلا گیا۔ پلانٹ دوبارہ چالو کرنے میں کافی دن لگے۔ فارغ ہو کر آیا، کچھ ضروری کام نپٹائے۔ شام کو وہ ڈاکٹر منظور سے ملنے اس کے گھر گیا۔ عذرا اور باداموں کا شربت اسے کئی بار یاد آیا تھا۔

ڈاکٹر منظور اور اس کے بیوی بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے ہاں پہنچا، تو طاہرہ اور بچوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ طاہرہ پھر چائے بنانے چلی گئی

www.pdfbooksfree.pk

اور بچے نانیوں کھانے میں جت گئے، تب ظہیر، ڈاکٹر منظور سے مخاطب ہوا: "یار تم نے عذرا کے بارے میں رشتے کا کہا تھا۔"

"ہاں!" ڈاکٹر منظور اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"لڑکا نہیں ایک مرد ہے میری نظر میں۔"

"وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کام وام کیا کرتا ہے؟ تعلیم کتنی ہے؟" اس نے ڈھیر سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

ظہیر نے سکون سے سگریٹ سلگایا۔ تیلی ایش ٹرے میں جھٹکی۔ نشست سیدھی کی۔ لمبا کش لیا اور بولا۔ "جیسی وہ میں ہوں۔"

"ارے یار۔" منظور نے زور سے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "داد دیتا ہوں تیرے فیصلے کی۔ ابھی تو یوں بھی پچاس سے اوپر کی ہو چکی ہیں۔"

"میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کرسکوں، تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔ مگر...... "وہ چپ ہوگئی۔

"منظور! یہ عمر والی بات نہیں، زندگی کا خوبصورت ترین حصہ اس کے ساتھ نتھی ہو کر جلتے اور اپنا خون پیتے میں گزار دیا۔ اب تو بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔ ہاں ایک کسک اور محرومی سی ہے جو اکثر پریشان رکھتی ہے۔ سوچتا ہوں، غریبانہ مزاج کی یہ لڑکی شاید میرے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔"

"میں عذرا کی ماں سے بات کرتا ہوں۔ یوں بھی ظہیر، تمھیں اپنی لمبی چوڑی جائداد کے لیے ایک بیٹے کی ضرورت تو ہے۔"

"چھوڑو بھائی، اس موضوع پر میں نہیں سوچتا۔"

چند دن بعد ایک شام منظور کا فون آیا۔ اس نے کہا: "تم آج شام ذرا عذرا کے ہاں جانا۔"

ظہیر پوچھنا چاہتا تھا کہ بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا، مگر فون منقطع ہو گیا۔ اس نے چند بار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ "بہر حال شام کو دیکھا جائے گا۔" کہتے ہوئے وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

چلنے لگا، تو بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر انتظار میں بیٹھا کہ بارش تھم جائے، تو چلے مگر وہ اور تیز ہو گئی۔ برساتی پہن کر اس کے گھر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ذرا سا دھکا دیا، تو کھل گیا۔ ٹین کی چھت والا برآمدہ بارش کی بوندوں سے بے ہنگم شور مچا رہا تھا۔

باورچی خانے میں عذرا چولھے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ سیاہ کھلے بال یوں تھے جیسے شیش ناگ کی طرح زمین پر کنڈلیاں مارے بیٹھے ہوں۔ یہ حیرت انگیز منظر تھا۔ اتنے لمبے بال اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دال ابل کر ہنڈیا سے باہر گر رہی تھی۔ لکڑیاں شوں شوں کرتی بجھتے ہوئے سیلا دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بڑھا اور باورچی خانے میں دھرے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ عذرا نے چونک کر دیکھا اور سٹپٹاتے ہوئی بولی

"ارے آپ کب آئے؟ اور یہاں کس لیے بیٹھ گئے۔ اندر بیٹھیے نا، یہاں حبس ہے۔"

"تم بھی تو حبس میں بیٹھی ہو۔" وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تو عادی ہوں۔" عذرا نے لکڑیوں کو چولھے کی دیواروں سے پٹختے ہوئے کہا۔ سلگتے ہوئے ٹکڑے بکھر گئے اور آنچ تیز ہو گئی۔ ہنڈیا اس نے اتار لی۔

www.pdfbooksfree.pk

"میں بھی منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ چھوٹے سے باورچی خانے میں ظہیر کے پاس پڑے عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی تھی۔ باہر بارش ہو رہی اور بادل گرج رہے تھے۔

"ڈاکٹر منظور نے فون کیا تھا کہ عذرا کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ بولو۔"

"میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کر سکوں، تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر......" وہ چپ ہو گئی۔

"مگر کیا؟" ظہیر نے بات کاٹ دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عذرا کے چہرے پر جذبات کی کشمکش تھی۔ آنکھوں میں دکھ تھا۔ اس کے ہونٹ لرزے اور سر جھک گیا۔ وہ بہت دھیرے سے بولی۔ "میں اگر آپ کو بیٹا نہ دے سکی تو؟"

ظہیر کے جسم میں خفیف ارتعاش ہوا۔ چہرے کا رنگ بدلا۔ اگلے ہی لمحے وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے پاس کون سا تخت طاؤس ہے جس کے لیے وارث کا ہونا لازم ہے؟ اصل میں، ہمارے معاشرے کا ڈھانچہ ہی اس ڈھب کا بن گیا ہے کہ اس میں بیٹے کو اولیت دی گئی۔ یوں بھی انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کی محرومی ہو، اس کی کسک زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں تو کئی محرومیاں رکھتا ہوں۔ ایک اچھی، پیاری اور مخلص بیوی کی بھی شدید تمنا ہے۔"

☆☆☆

وہ شادی کی خبر چھپانے کا قائل نہ تھا، مگر ظاہرہ اور ڈاکٹر منظور کے اصرار پر خاموش ہو گیا۔

"چپ رہو۔ شور شرابے سے جب تک بچ سکتے ہو بچو۔ تمہارا خاندان ویسے بھی اول نمبر کا سازشی ہے۔"

عذرا اپنی ماں سمیت ایک خوبصورت گھر میں رہنے لگی۔ زندگی کی آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ اچھی خوراک ملی، تو جلدی چہرے کی زردیاں سرخیوں میں بدل گئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ دس ماہ بعد ایک خوبصورت بیٹا بھی آ گیا۔ ظہیر ساہیوال گیا ہوا تھا۔ واپس آیا، تو بیٹے کی پیدائش کا پتا چلا۔ عذرا سروسز اسپتال میں تھی۔ یہ ایک پُرمسرت موقع تھا کہ ڈاکٹر منظور سے گلے ملتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

زندگی کی ہر خواہش پوری ہوئی، تو ظہیر کی صحت قابل رشک ہو گئی۔ ایسی دل آویز شخصیت تھی کہ ملنے جلنے والے کہتے: "ظہیر تو روز بروز جوانی کی طرف قدم اٹھا رہا ہے۔ تجھے تو پیچھا کیا لگ گیا ہے۔"

تین سال میں تین بیٹے ہو گئے۔ عذرا ہر بیٹے پر پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور دلکش ہو جاتی۔ وہ ساہیوال اور لاہور میں اپنے دن بانٹ کر رہتا۔ جب بھی ساہیوال سے آتا، عذرا کھلے دل اور ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ سے خوش آمدید کہتی۔ کبھی کبھی وہ بڑی جذباتی آواز میں کہتا "میرا جی چاہتا ہے عذرا کہ تمہارے ساتھ ہی بس جاؤں۔ لیکن بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ انھیں مناسب نگرانی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے مجھے ساہیوال بھاگنا پڑتا ہے۔"

بڑی بچی پندرہ سال کی ہو رہی تھی اور چھوٹی چودہ کی۔ چھوٹی کا رشتہ بڑی بہن اپنے بڑے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ فضائیہ کی جی۔ ڈی پائلٹ برانچ کے لیے منتخب ہو گیا تھا۔ ادھر دوسری بہن آسیہ انجینئرنگ میں پڑھتے بیٹے کے لیے کئی بار رشتہ مانگ چکی تھی۔

اس بار ظہیر ساہیوال آیا، تو بڑی بہن اور بہنوئی دونوں نے فون پر بتایا کہ وہ آ رہے ہیں۔ بہن منگنی کی رسم

www.pdfbooksfree.pk

اور شرمندہ بھی تھی۔ اگلے دن دونوں میں بیوی منگنی کی تفصیلات طے کرنے آ دھمکے۔ ظہیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ظہیر کی بات ہے، پہلے انھیں پتہ تو دینے دیجیے۔"

"ابھی میرا لڑکا جیتا ہے۔ مجھے بہت سے ارمان نکالنے ہیں۔ ہاں آپ کو جب دیں گے کہ وہ میرے مقابلے پر آنے کی کوشش نہ کرے۔"

"آپ جانیں اگر وہ بھی جہیز وغیرہ سے منگنی کرنا چاہتی ہیں تو بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

"ظہیر دیکھو، ان لوگوں نے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

"کیسی مصیبت؟" ظہیر نے حیرت سے پوچھا۔

ابھی ظہیر کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ آپا اور ان کا شوہر بھی آ دھمکے۔ وہ کھلکھلاتے ہوئے اٹھی اور بولی۔

"لو وہ بڑے موقع پر آئے ہیں۔ ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

"یہ اتفاق تو اچھا ہو گیا ہوں گے۔ پھر … نکلنے کی تو انھیں … سے … ہے۔ دیکھو ظہیر، میری بہن کا شوہر … میرا بھائی ہے۔ مگر … اول نمبر کا حاسد اور لالچی۔"

محفل جمنے بیٹھنے میں پل نہیں لگا اور … باری شروع ہوئی۔

"ظہیر! تمہارے لیے بہتر ہے کہ جائیداد کا بٹوارہ کر دو۔ … ان کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔" بڑے بہنوئی نے کہا۔

"وہ لگ بیٹھ رہے تھے … چل اسے بچی کے جہیز تک رہے تھے۔ ان کی اندرونی باتوں سے … واقف تو تھی مگر وہ یوں کھل کر سامنے آجائیں گے اسے اندازہ نہیں تھا۔

اب ایک اور منظر بھی کہیں پیچھے سے ابھر کر نمایاں ہوا۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس کے تینوں بیٹے اور دونوں بیٹیاں

اخلاص اور اطاعت

☆ جو لوگ دل میں خلوص رکھتے ہیں، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری پر بلند مرتبہ پائیں گے۔

☆ دنیا میں جو لوگ دوسروں کے لیے خلوص رکھیں، وہ ان کی نگاہ میں عزیز ہو جاتے ہیں۔

☆ خلوص سے کی گئی عبادت اور خدمت کبھی رائگاں نہیں جائے گی۔

☆ بے ادب بے نصیب اور باادب بانصیب۔

☆ کسی کا جائز حکم نہ ماننا دراصل بدنصیبی کی علامت ہے۔

☆ راہِ راست پر گامزن اور مخلص لوگوں کی پیشانی ہمیشہ اطاعت و خدمت پر جھکی رہتی ہے۔

☆ دنیاوی رزق و عزت میں کمی بیشی مشیت ایزدی سے ہوتی ہے نہ کہ محنت و عقل پر۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ انتخاب: اطیب جان، واہ کینٹ)

ایک دوسرے کے مقابلے پر صف آرا ہیں۔ اس نے منظر سے … ہٹا کر رکھ دیا۔ بہرحال ظہیر نے بڑے تدبر اور بردباری سے صورتِ حال سنبھالی اور سب کو وہاں سے … کر رخصت کیا۔

اگلے دن وہ اپنے وکیل کے پاس بیٹھا اپنی جائیداد کا ۷۵ فیصد حصہ … بیوی بچوں کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا

"میرے بہنوئیوں میاں محمد بشیر اور میاں محمد نذیر کو جائیداد کے تصفیے سے مطلع کر دو۔ انھیں بتا دینا کہ مجھے اپنے بچوں کو … سے محروم کرنا اور انھیں دنیا کے صحرا میں دھکیل دینے … نہیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

کرۂ ارض کے طاقتور حکمران کا

اُڑنے والا محل

دنیا بھر کی آسائشات و سہولیات
رکھنے والے اڑن کھٹولے کا قصہ عجب

فقیہ اللہ خان

ایک عظیم الجثہ بحری جہاز ساحلِ سمندر پر دیکھیں تو اس قدر حیرانی نہیں ہوتی جتنی چھ منزلہ عمارت کو فضا میں اڑتا دیکھ کر ہوگی۔ جی ہاں، ایسی ہی حیرت انگیز خصوصیات والے اڑن کھٹولے یعنی صدرِ امریکہ کے اس طیارے کی بات ہو رہی ہے جو واقعی چھ منزلہ عمارت کی اونچائی کے برابر ہے۔ اس میں ایک سو آدمی بآسانی سفر کر سکتے ہیں۔ دو ہزار آدمیوں کا کھانا ہر وقت تیار اور محفوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا طیارہ ہے کہ اس کے آگے پیچھے کام کرنے والے چلتے پھرتے تو بڑے معلوم ہوتے ہیں اور آپ جہاز میں تنہا سے جہاز شہزادے سے منسوب ہوئے۔

اس وقت ایسی ہی خصوصیت رکھنے والے دو طیارے بوئنگ وی سی-۲۵ امریکی صدر کے زیر استعمال ہیں۔ بوئنگ کمپنی نے اپنے صدر کے لیے یہ دونوں طیارے خصوصی طور پر تیار کیے۔ یہ ۱۹۹۰ء سے امریکی صدور کے زیر استعمال ہیں۔

صدر امریکہ کے اس فضائی محل میں وہ تمام ضروری سہولیات میسر ہیں جو واشنگٹن ڈی سی والے وائٹ ہاؤس میں دستیاب ہیں۔ اسی لیے طیارے والوں سے متعلقہ محکمے اور افراد اسے "فلائنگ اوول آفس" اور "فلائنگ وائٹ ہاؤس" کہتے ہیں۔ طیارے کی بلندی ۶۳ فٹ ۵ انچ ہے۔ یہ بلندی ایک چھ منزلہ عمارت کے برابر ہے۔ طیارے کی تین منزلیں ہیں۔ نچلی اور چوتھی منزل میں سامان اور خوراک رکھی جاتی ہے۔ دوسری منزل میں صدر اور اس کا عملہ بیٹھتے اور کام کرتے ہیں۔ اسی منزل پر صدر کا کانفرنس روم، خواب گاہ، نجی کمرے اور غسل خانے واقع ہیں۔ یہ سب جہاز کے اگلے حصے میں ہیں۔

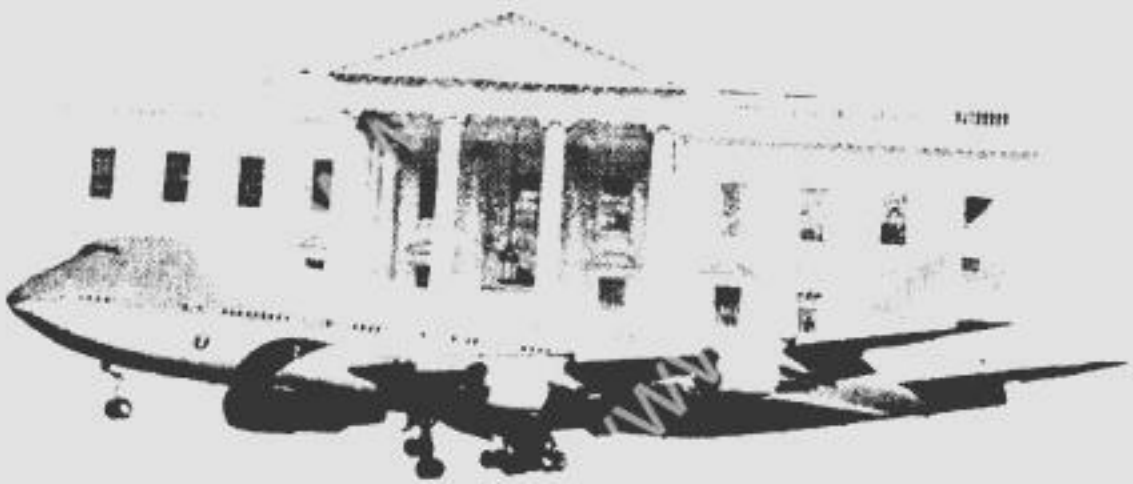

www.pdfbooksfree.pk

سب سے اوپر والی منزل میں جہاز کا عملہ جو تین ہوابازوں اور ۲۳ ہینگ کریو پر مشتمل ہے، قیام کرتا ہے۔ اس جہاز میں کل ۱۰۲ نشستیں ہیں۔ ۷۶ صدر اور ان کے ہمراہیوں اور اوپر ۲۶ عملہ جہاز کے لیے۔ اس جہاز میں ۴۰۰۰ فٹ پہ پھیلا فرش جو صدر امریکا اور دوسرے مسافروں کے زیر استعمال رہتا ہے۔ جہاز کا کمیونیکیشن روم بھی اسی فرش پر ہے۔

یہ کوئی عام طیارہ نہیں۔ اس میں ایسی شاندار سہولیات میسر اور انتہائی حساس مواصلاتی آلات نصب ہیں جو کسی دوسرے طیارے میں موجود نہیں۔ بچاسی نشستوں پر ٹیلی فون سیٹ نصب ہیں۔ انیس ٹی وی سیٹ بھی مختلف جگہوں پر لگے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو، فیکس مشینوں اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) کی سہولت بھی موجود ہے۔ گویا صدر امریکا یا اس کا عملہ کسی بھی وقت دنیا کے کسی بھی خطے سے ریڈیائی رابطہ کر سکتا ہے۔ بوقت ضرورت صدر اپنی قوم سے براہ راست خطاب بھی کر لیتے ہیں۔

اس خصوصی جہاز میں تجربہ کار ڈاکٹر اور نرسیں صدر کے ہمراہ سفر کرتی ہیں۔ ادویہ کے ایک اسٹور کے علاوہ ایک آپریشن روم بھی ہر طرح کے جدید آلات جراحی سے لیس ہے۔ جہاز میں ایسے آلات نصب ہیں جو بوقت ضرورت دشمن کا ریڈار سسٹم جام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جہاز میں جنرل الیکٹرک کمپنی (GEC) کے تیار کردہ چار طاقتور انجن نصب ہیں۔ یہ طیارہ اڑتے اڑتے فضا میں کسی دوسرے جیٹ جہاز سے تیل حاصل کر سکتا ہے۔ یوں اس قابل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اڑان میں بغیر رکے ساری دنیا کے گرد چکر لگا سکے۔ گویا ساری دنیا اس طیارے کی دسترس میں ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، یہ جہاز امریکی طیارہ ساز ادارے "بوئنگ کمپنی" (Boeing) کا تیار کردہ ہے۔ یہ

ائیر فورس ون...........ایک نظر میں

ماڈل	بوئنگ ۷۴۷	[illegible]	۱۹۵ فٹ ۸ انچ
[illegible]	۱۹۹۰	اونچائی	۶۳ فٹ ۵ انچ
قیمت	۳۲۵ ملین ڈالر	[illegible]	۲۳۱ فٹ ۱۰ انچ
انجن کی قسم	چار (GE)	رفتار کی حد	۷۰۰ میل (۱۰۰۰ کلومیٹر)
نشستوں کی تعداد	۷۰	[illegible]	۴۵۱۰۰ فٹ ۴۵۰۰۰ [illegible]
عملہ	۲۶ افراد	[illegible]	[illegible]

کمپنی دنیا بھر میں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ یہی کمپنی بوئنگ سیریز کے بوئنگ ۷۰۷، ۷۲۰، ۷۳۷، ۷۴۷، ۷۵۷ اور جدید ترین طیارہ ۷۷۷ (ٹرپل سیون) تیار کرتی ہے۔ صدر امریکا کا طیارہ بوئنگ ۷۴۷ سیریز کا حصہ ہے۔ اس کمپنی کا کارخانہ امریکا کی شمال مغربی ریاست واشنگٹن کے شہر سیٹل (Seattle) میں واقع ہے۔

جب امریکی صدر کے لیے دو طیارے ۱۹۸۰ء میں خریدے گئے، تو قیمت ۳۲۵ ملین ڈالر تھی۔ تبھی ان کی عمر کا تعین بھی کر دیا گیا جو تیس سال تھی۔ اب یہ دونوں طیارے ۲۰۱۷ء میں اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر ختم ہو جائیں گے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا طیارہ لے گا۔ ظاہر ہے، اس وقت تک امریکا کا نیا صدر بھی منتخب ہو چکا ہو گا۔ موجودہ صدر اوباما اپنی دونوں مدتیں مکمل کر کے فارغ ہو چکے ہوں گے۔

صدر امریکا کا طیارہ فضا میں ۴۵۱۰۰ فٹ بلندی تک پرواز کر سکتا ہے۔ اس کی حد رفتار ۷۰۰ میل (۱۱۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ ہے۔ یاد رہے، فضا میں عام مسافر طیارہ ۳۰/۳۲ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کرتا ہے۔ اس طیارے میں ۵۳۰۰۰ گیلن (۲۰۳۰۰۰) لیٹر تیل بھرا جا سکتا ہے۔ گویا یہ

www.pdfbooksfree.pk

آدھی دنیا تک بغیر رکے پرواز کرنے کے قابل ہے۔

جہاز میں کھانا تیار کر کے اسے منجمد حالت میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسے وقت ضرورت الیکٹرک اوون میں گرم کرنا ممکن ہے۔ جہاز میں ۲۰۰۰ کھانے محفوظ رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ کھانا تیار کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

جہاز کے دروازے کے ساتھ ہی سوار ہونے اور اترنے کے لیے فولڈنگ (سکڑنے) والی سیڑھی نصب ہے۔ وہ جہاز ہی کا حصہ ہے۔ جہاز کے کمیونیکیشن نظام میں ۲۳۸ میل لمبے تار آلات مواصلات میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اسی سائز کے عام مسافر طیاروں میں استعمال ہونے والے تار سے دوگنا لمبے ہیں۔

صدر کے ہمراہ سفر کرنے والوں میں مشیر (Advisors)، سیکرٹ سروس کے نمائندے، پرسنل سیکرٹری، افراد و ذرائع ابلاغ اور دوسرے خاص مہمان شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ صدر امریکا کا پالتو کتا (پپی) بھی اس فضائی محل میں اچھلتا کودتا ہے۔ چند برس قبل جب صدر امریکا مسٹر اوباما بھارت کے سرکاری دورے پر آئے، تو ان کا کتا بھی میڈیا میں موضوع سخن بنا رہا۔ امریکا کے سابق صدر جارج ڈبلیو بش کا کتا بھی ان کے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں بڑے لوگوں کی نرالی باتیں۔

جب کوئی جہاز کسی دوسرے ملک کی فضائی حدود میں محو پرواز ہو، تو وہاں کے محکمہ شہری ہوابازی کو اپنی شناخت بتاتا ہے۔ یہ عمل ہوابازی کی اصطلاح میں کال سائن (Call Sign) کہلاتا ہے۔ صدر امریکا کے طیارے کا کال سائن "ایئر فورس ون" (Air Force One) ہے۔ یہ صرف صدر امریکا کے طیارے کے لیے مخصوص ہے۔

یہ کال سائن امریکی افواج اور دنیا کے کئی شہری ہوابازی کے نظاموں میں عام فہم ہے۔ یہ امریکی صدر کے طیارے کو کسی بھی قسم کے سول اور فوجی طیاروں سے ممیز کرتا ہے۔ اگر صدر کسی فوجی جہاز میں سفر کرے، تو اس کا کال سائن "آرمی ون" ہوگا۔ ہیلی کاپٹر میں سفر کرے، تو اس کا کال سائن "میرین ون" بن جاتا ہے۔

صدر امریکا کا خاص جہاز امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے ساتھ ملحق ریاست میری لینڈ میں ہوائی اڈے، اینڈریو ایئر فورس بیس (Andrew Air Force Base) پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ واشنگٹن ڈی سی سے ۱۱ کلومیٹر اور وہائٹ ہاؤس سے ۳۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہائٹ ہاؤس سے آنے جانے کے لیے صدر امریکا ہیلی کاپٹر استعمال کرتا ہے۔ وہائٹ ہاؤس کا فوجی رابطہ کار براہ راست اس طیارے کی نگرانی کا ذمے دار ہے۔

اینڈریو ایئر بیس امریکی فضائیہ کا ہوائی اڈا ہے۔ یہ ریاست میری لینڈ کی پرنس جارج (PG) کاؤنٹی میں واقع ہے۔ یہ ہوائی اڈا اس قدر محفوظ ہے کہ غیر متعلقہ بندہ تو کیا وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں۔ راقم کو قیام امریکا کے دوران اس ہوائی اڈے کی ہمسائیگی کا شرف حاصل رہا۔ رات کو جب اترتے چڑھتے طیاروں کی گھن گرج سونے نہ دیتی، تو دل میں اس شخص کو کوستا جس نے مجھے یہ مکان کرائے پر دلوایا تھا۔

گزشتہ سال جب وزیراعظم میاں نواز شریف امریکا کے سرکاری دورے پر واشنگٹن آئے، تو ان کا خصوصی طیارہ بھی اسی ایئر بیس پر اترا تھا۔ وہاں سے انھیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہائٹ ہاؤس لے جایا گیا۔

اس ہوائی اڈے کے دو رن وے ہیں۔ ایسٹرن رن وے (۱۱۷۰۰) فٹ اور ویسٹرن رن وے (۱۱۳۰۰) فٹ طویل ہے۔ اس ہوائی اڈے کا کل رقبہ ۱۸ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کو چاروں اطراف سے کنکریٹ کی مضبوط دیوار سے محفوظ کیا گیا ہے۔

ایک شکر گزار بیٹے نے کہا

مجھے اپنے باپ پر فخر ہے

ریلوے سے تازیست وابستہ رہنے والی نیک روح کا ماجرا، اس نے ساری عمر حلال روزی کمائی اور اولاد کو بھی قناعت و سادگی کا درس دیا

محمد اسلم لودھی

لاہور سے ریل پر سفر کا آغاز کیا جائے، تو تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد رادھارام کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی اب حبیب آباد کہلاتی ہے۔ کئی برس قبل میرے والد محمد دلشاد خان لودھی کیبن مین کی حیثیت سے اس اسٹیشن پر تعینات تھے۔ جب پاکستان ریلوے کے اے ٹی او (اسسٹنٹ ٹریفک آفیسر) کسی ریل میں بیٹھ کر وہاں سے گزرتے، تو وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ سخت ترین گرمیوں میں انھیں نیکر پر بھاری بھرکم پاجاما اور بنیان پر موٹی قمیص پہننی پڑتی۔

اس وقت وہ نہایت بیزاری کے عالم میں کہتے "یہ جب تک اے ٹی او صاحب کی گاڑی نہیں گزر جاتی، مجھے سکون نہیں مل سکتا۔" نجانے اے ٹی او کو کون سی مصیبت پڑی تھی جو ادھر آنکلے اور ہمیں پریشان کر کے رکھ دیا۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ دس سال ہوگی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ اے ٹی او کس بلا کا نام ہے اور یہ کہاں رہتی ہے۔ اگر آسمان پر رہتی ہے، تو پھر زمین

www.pdfbooksfree.pk

پر کیوں اتر آئی ہے۔

میں اپنے والد سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا۔ مجھے وہ کبھی سے زیادہ طاقت ور اور ذہین دکھائی دیتے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میں انھیں دیوارِ چین سے زیادہ بلند اور مضبوط تصور کرتا۔ یہ تصور اس لیے میرے ذہن میں محفوظ تھا کہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں جب بھی کوئی مصیبت' بیماری یا پریشانی مجھے لاحق ہوتی، والد اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری حفاظت کرتے۔ انھیں اسی وقت سکون ملتا جب میں نارمل حالت میں واپس لوٹ آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میری آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ والد صاحب کی ڈیوٹی اس دن صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک تھی۔ سخت ترین سردیوں میں جب ماں ہمیں دو دو پاجامے، تین تین قمیصیں اور پلنڈر وغیرہ پہنا کر سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کرتی، تو اس سمے میں اپنے والد کو وردی کے اوپر صرف ایک برانڈی (اوور کوٹ نما) پہنے سخت ترین سردی میں انجن پر سرد ہوا کے تھپیڑوں سے دست بدست جنگ کرتا ہوا دیکھتا۔

اس دن وہ تھکے ہارے شام ڈھلے گھر واپس پہنچے، تو اپنے لاڈلے بیٹے کی سوجی آنکھیں دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ انھوں نے اپنا آرام بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف میرے لیے سردیوں کی شام چھے بجے لاہور سے ساہیوال جانے والی ریل پر رینالہ خورد جانے کا پروگرام نہ صرف بنایا بلکہ آدھا گھنٹا پہلے ہی مجھے اپنی آغوش میں لیے واں رادھا رام ریلوے اسٹیشن کے ٹھنڈے بینچ پر آ بیٹھے۔ جب بذریعہ ریل ہم رینالہ خورد پہنچے، تو نہ صرف سردی میں حد درجہ اضافہ ہوا بلکہ بازار کی دکانیں بھی اکثر بند ہو چکی تھیں۔ نیم حکیم قسم کا ایک ڈاکٹر اپنی دکان ابھی بند کر ہی رہا تھا۔

والد صاحب نے اس سے درخواست کی کہ میرے لختِ جگر کی آنکھیں خراب ہوئی ہیں، از راہ کرم کوئی ایسی دوائی دیں جس سے یہ جلد ٹھیک ہو جائے۔ اس نے میری آنکھیں غور سے دیکھیں پھر دوائی دے کر یہ کہتے ہوئے ہمیں فارغ کر دیا کہ اللہ نے چاہا تو یہ بچہ دوائی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ کے کرم سے میں ٹھیک بھی ہو گیا لیکن اس شام اور رات کی سخت ترین سردی میں اپنے والد کا ایثار اور شفقت مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ میرے والد واقعی ایک عظیم محافظ اور شفیق باپ تھے۔ ان کی قربانیوں کا صلہ زندگی بھر ان کی خدمت کرنے کے باوجود میں ادا نہیں کر سکا۔

بہرکیف اے پی او کی آمد کا تصور کر کے جب میرے والد پریشان ہوتے، تو ان سے زیادہ میں فکرمند ہو جاتا۔ اور سوچتا کہ یہ صاحب ہیں کون؟ انھیں کبھی واں رادھا رام جیسے چھوٹے اسٹیشن پر اترنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ بلا اگر واقعی واں رادھا رام اسٹیشن پر اتر جاتی، تو پتا نہیں وہاں کیا طوفان برپا کرتی۔ یہ تو اس بلا کی مہربانی تھی کہ لاہور سے بذریعہ ریل ساہی وال چلی جاتی تھی۔ اے پی او اپنے ایئرکنڈیشنڈ ڈبے کے شیشے اتارنا بھی گناہ تصور کرتے، لیکن ان کا ڈر لاہور سے ساہی وال تک ہر ریلوے اسٹیشن پر تعینات خاکروب سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک کو ہوتا۔ اے پی او کی ریل جس جس اسٹیشن سے بخیریت گزر جاتی، وہاں کے ریلوے ملازمین کی جان میں جان آتی۔ مشکل کے اس لمحے کئی ملازمین کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔"

حالات نے کروٹ لی اور ۱۹۶۳ء کے سال میں چوتھی جماعت میں پہنچا۔ میرے دونوں بڑے بھائی محمد رمضان خان لودھی اور محمد اکرم خان لودھی بالترتیب میٹرک اور

www.pdfbooksfree.pk

آٹھویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ انھیں پڑھنے کے لیے پتوکی جانا پڑتا۔ والد صاحب کی شفقت نے ایک بار پھر جوش مارا۔ انھوں نے اپنی ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ میں سے جو ۱۰ روپے بچا رکھے تھے، وہ ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت میں دے کر اپنی تعیناتی بطور شنٹنگ پورٹر لاہور کینٹ کروالی۔

شنٹنگ پورٹر کا کام بہت خطرناک اور کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اپنے بچوں کو معیاری تعلیم دلوانے کی خاطر زندگی کا خطرناک ترین کام کرنا بھی گوارا کرلیا۔ میں نے کئی شنٹنگ پورٹرز کو معمولی سستی کرنے پر ریل کے نیچے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔ اسے پاکستان ریلوے کی سب سے خطرناک ترین ڈیوٹی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ریلوے افسروں کے نزدیک شنٹنگ پورٹر کے فرائض انجام دینے والوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ انھیں بھی دیگر ملازمین کی طرح جانور کے مانند ہانکتے ریٹائرمنٹ کی دہلیز پر لے جاتے ہیں۔

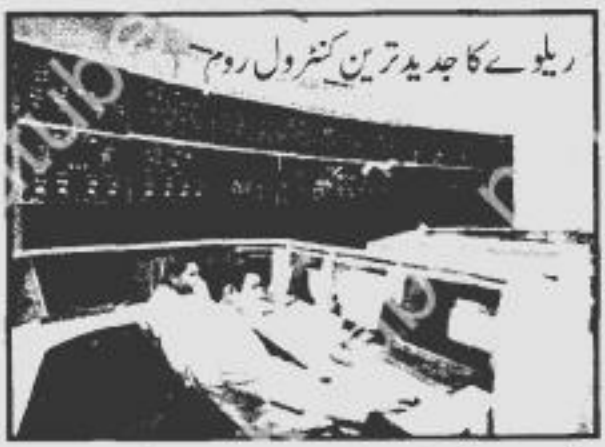
ریلوے کا جدید ترین کنٹرول روم

بہرکیف لاہور آنے کے بعد والد صاحب بڑے شہر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اپنی ڈیوٹی کے علاوہ چھانگا مانگا اور چیچہ وطنی کے جنگل سے لاہور آنے والی لکڑیوں سے بھرے ڈبے بھی خالی کرنے لگے۔ مجھے یاد ہے، ہم تینوں بھائی اسکول سے فراغت کے بعد والد صاحب کے ساتھ مل کر رات آٹھ بجے تک صرف ایک ڈبا بمشکل خالی کرتے۔ اس کے عوض روزی خان ٹھیکیدار ہمیں صرف تین روپے مزدوری دیا کرتا۔ یہ تین روپے ہی ہمارے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

میرے بھائی، تو میٹرک پاس کرنے کے بعد کہیں نہ کہیں ملازم ہوگئے، میں نے بطور پرائیویٹ امیدوار ایف اے اور بی اے بھی کرلیا۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر بھرتی ہوکر "بابو" بن جاؤں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت بھی دی۔ کلرک کے کہنے پر میں ہیڈ کوارٹر میں ریلوے بورڈ کے ایک اہم ترین رکن کی کوٹھی پانچ کلو بغیر کانٹے والی مچھلی دے کر آیا۔ لیکن رشوت کی رقم اور مچھلی، دونوں کام نہ آئی۔ جب اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے بھرتی ہونے والوں کی فہرست آئی، تو اس میں میرا نام شامل نہیں تھا۔ نہ صرف مجھے افسوس ہوا بلکہ میرے والد کو بھی بہت صدمہ پہنچا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا خوبصورت سفید رنگ کی وردی پہنے سر پر سیاہ پی کیپ پہن اے ایس ایم کی کرسی پر بیٹھے اور لاہور میں گاڑیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے والے کنٹرولر سے فخر سے بات کرے۔ گاڑیاں لاہور سے ہارن بجاتی ساہیوال جائیں اور ان کا بیٹا ہر آنے جانے والی گاڑی کو خوبصورت وردی پہن کر سبز جھنڈی دکھائے۔ اس وقت سیون اپ "ون داؤن" کا نام بہت مشہور تھا۔ تیز گام، تیز رو، خیبر میل، کوئٹہ ایکسپریس بہت "پھنے خاں" ٹرینیں تصور کی جاتی تھیں۔ لاہور میں بیٹھ کنٹرولر ان ریلوں کی نقل و حرکت بہت باریک بینی سے دیکھا کرتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے یاد ہے ۱۹۶۲ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں جماعت اسلامی نے ریل کے ذریعے خانہ کعبہ کا غلاف پہلے کراچی بھجوایا۔ پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے اسے سعودی عرب بھیجا جانا تھا۔ یہ غلاف غالباً کسی ایکسپریس ریل پر موجود تھا۔ وان رادھا رام پتوکی سے دوسرا اور چھوٹا سا اسٹیشن ہے، اس لیے وہاں کوئی ایکسپریس گاڑی نہیں رکتی تھی۔ پسنجر ٹرینوں کے ذریعے ہی وہاں کے لوگ سفر کیا کرتے۔

اس زمانے میں ''گولہ سسٹم'' ریلوے میں رائج تھا۔ بغیر رکے جانے والی ایکسپریس ٹرین کو ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن سے چمڑے کے خول میں بند ایک گولہ پکڑنا ہوتا تھا۔ لوہے کی تار سے بنے گول چھلے میں یہ گولہ ڈالا جاتا۔ بغیر رکے جانے والی گاڑی جس لائن سے گزرتی، وہاں لوہے کا ایک فریم نصب ہوا رہتا تھا۔ اسٹیشن پر ڈیوٹی انجام دینے والا کانٹے والا وہ گولہ لوہے کے فریم میں نصب کر کے گاڑی کا منتظر رہتا۔ انجن کے دائیں جانب بیٹھا فائرمین ایک ہک کے ذریعے اس گولے کو تیز رفتاری سے اٹھاتا۔ اگر گولہ اٹھانے میں ناکام رہتا تو اس گاڑی کو اسٹیشن پر رکنا پڑتا۔

خانہ کعبہ کا غلاف لے کر جانے والی ٹرین کے بارے میں کنٹرولر کا حکم تھا کہ وہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر نہ رکے بلکہ اُسے زیادہ احتیاط اور کم رفتاری سے گزارا جائے۔ ایک جانب کنٹرولر کا سخت حکم، تو دوسری جانب وان رادھا رام شہر کے لوگ ریلوے لائن پر آ کے بیٹھ گئے کہ ہم نے خانہ کعبہ کے غلاف کی ہر حال میں زیارت کرنی ہے۔ اس صورت حال میں معمولی سی غلطی پر والد نوکری سے برطرف ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ریل روکنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

اسٹیشن ماسٹر، اے ایس ایم اور ریلوے کا تمام عملہ پلیٹ فارم پر بہت چوکنا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ریل کا نام کیا تھا لیکن جب وہ آؤٹر سگنل عبور کر کے وان رادھا رام کی حدود میں داخل ہوئی، تو انجن میں بیٹھا فائرمین ہک کے ذریعے گولہ اٹھانے لگا۔ اسی لمحے والد صاحب نے فریم کو جھٹکا دے کر گولہ زمین پر گرا دیا۔ گولہ نہ ملنے پر ریل کو رکنا پڑا۔ جونہی ریل رکی، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس میں رکھے غلاف کعبہ کو چومنے لگے۔ جن کی پہنچ سے غلاف کعبہ دور تھا، وہ ریلوے انجن ہی کو چوم کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔

ایک جانب شہر والوں کا جوش و خروش عروج پر تھا، تو دوسری جانب اسٹیشن ماسٹر سمیت ریلوے کے تمام عملے کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ کنٹرولر بہت غصے میں دھاڑ رہا تھا کہ کس نے یہ ریل روکی اور کیوں؟ کسی سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ جب والد صاحب سے بازپرس ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ میں تو فریم میں گولہ لگا کر کھڑا تھا۔ اب گولہ پکڑنا فائرمین کا کام تھا میرا نہیں۔ بہرحال بہت مشکل سے بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات پیوست ہو گئی کہ جس کنٹرولر سے ریلوے کا تمام عملہ خائف رہتا ہے، آخر وہ بیٹھتا کہاں ہے؟ اور اس کو کس طرح خبر ہو جاتی ہے کہ ریل پتوکی پہنچ گئی، اب وان رادھا رام کے پلیٹ فارم پر رکی، اب اسے ساہیوال کی جانب روانہ ہونا ہے اور ساہیوال سے لاہور جانے والی چھوٹی گاڑیاں روک کر ایکسپریس ریل کو کیسے گزارنا ہے؟

اس انجانی اور ان دیکھی دنیا کا تصور میرے دماغ میں محفوظ تھا۔ میں اے ٹی او کے بعد کنٹرولر کے بارے میں بھی جاننے کی جستجو رکھتا تھا۔ کانٹے والے، شنٹنگ پورٹرز

www.pdfbooksfree.pk

کیبن میں اور اے ایس ایم سمیت ہر شخص کی زبان پر کنٹرولر کا لفظ بہت سننے کو ملتا۔

میں گزشتہ پچیس سال سے مختلف اخبارات میں باقاعدگی سے کام پہنچ مضامین لکھتا چلا آ رہا ہوں لیکن کبھی یہ "بلائیں" دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ڈی ایس آفس بھی دو چار مرتبہ جانا ہوا، لیکن اس دفتر میں داخل ہونے کی مجھ میں جرات کہاں تھی؟ سنا کرتے تھے کہ اس دفتر میں اے ٹی او صاحب کے دادا جی بیٹھتے ہیں۔ پھر یہ خیال ذہن میں ابھرتا کہ اگر اے ٹی او کا اتنا دبدبہ و جلال ہے، تو ڈی ایس صاحب (ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ) کے رعب و دبدبے کا عالم کیا ہوگا۔

ایک گارڈ جھنڈی لہراتے ہوئے

قدرت نے مہربانی کی۔ میں نے ریلوے ورکرز کو مخاطب کرتے ایک کالم لکھا جو روزنامہ نوائے وقت میں ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس کالم میں کیبن مین اور شنٹنگ پورٹر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ازالے کی تجاویز دیں۔ کالم شائع ہوتے ہی ایک کال آئی۔ معلوم ہوا ڈی ایس لاہور جناب عبدالحمید رازی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ڈی ایس لاہور کا لفظ سننا تھا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں پچاس سال پہلے کے دور میں پہنچ گیا جب اے ٹی او صاحب کے گزرنے پر میرے والد خوفزدہ ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے سوچا، اگر ڈی ایس صاحب سے میری ملاقات ہوئی، تو میں دنیا کے خوفناک ترین انسان، اے ٹی او صاحب کو ضرور دیکھوں گا کہ وہ ہوتا کیسا ہے؟

میں نے اپنے داماد، حافظ تاج محمود سے رابطہ کیا اور رازی صاحب کے متعلق پوچھا۔ حافظ تاج پاکستان ریلوے میں سگنل انجینئر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ریلوے کے بارے میں بہت معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف پورے ڈویژن کے مالک بلکہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ صاحب کتاب ہیں اور انھوں نے ہفتے میں دو دن عام ملازمین سے ملاقات کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ اب عبدالحمید رازی سے بالمشافہ ملاقات کی آرزو دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان سے گزارش کی کہ مجھے والٹن ٹریننگ اسکول / اکیڈمی کا دورہ بھی کرنا ہے۔ میں ایک جانب ریلوے کی انوکھی دنیا کو عملی روپ دھارتے، تو دوسری جانب میں اس ادارے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جہاں کسی زمانے میں میرے والد زیرتربیت رہے تھے۔

میں سمجھتا ہوں یہ محبت کی انتہا ہے کہ مجھے ہر وہ شہر اور مقام، مقدس دکھائی دیتے، جہاں میرے والد کسی نہ کسی حوالے سے مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بطور خاص بہاولنگر ریلوے اسٹیشن بھی دیکھنے گیا جہاں پاکستان بننے سے پہلے میرے والد بحیثیت فائرمین اسٹیم انجن پر ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد انھیں اسی دن ریلوے میں بطور کانٹے والا ملازمت ملی جب میری ولادت ہوئی۔ اس لیے دنیا میں میری آمد خاندان کے لیے خوش بختی تصور کیا گیا۔

آخر منگل ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء کو میں صاحب کرامت اور نیک سیرت قاری محمد اقبال عارف قادری

www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ ڈی ایس آفس پہنچے۔ سرد ہوا کے جھونکے جسم میں تھرتھلی مچا رہے تھے، لیکن ہم ریلوے کی حیرت پراسرار اور حیرت انگیز دنیا دیکھنے جا رہے تھے، اس کی خوشی دیدنی تھی۔ دہشت گردی کے اس دور میں ہر سرکاری دفتر میں رکاوٹیں کھڑی کر کے آنے والوں کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں، لیکن ڈی ایس آفس میں داخل ہوتے ہوئے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر نہ صرف میں حیران ہوا بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ ڈی ایس آفس نہیں جہاں اے ڈی او صاحب کے دادا جی بیٹھتے ہیں، بلکہ یہ تو درویشوں کا ڈیرہ ہے جہاں جو چاہے آ جا سکتا ہے۔

جناب عبدالحمید رازی نے اپنی نشست سے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ بیٹھ کر ہم کمرے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ کمرے میں ایک طرف لاہور ڈویژن کا نقشہ آویزاں تھا۔ دوسری جانب بہت تاریخی اہمیت کا حامل گھڑیال (وال کلاک) دیوار پر نصب دکھائی دیا۔ ذرا غور سے دیکھا، تو اس پر ۱۶۹۶ء سن لکھا تھا۔ سوا چار سو سال پرانا یہ گھڑیال انگلینڈ کی کسی معروف کمپنی نے بنایا تھا۔ حیرت کی بات یہ کہ سوا چار سو سال گزرنے کے باوجود اس گھڑیال میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ حرکت کرتی سوئیاں وقت گزرنے کا بخوبی احساس دلا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد عبدالحمید رازی صاحب فارغ ہو کر ہم سے مخاطب ہوئے۔ وہ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ جیسے اہم عہدے پر فائز ہیں، لیکن ان کی شخصیت بہت کھلی ڈھلی دکھائی دی، نہ کوئی رعب اور نہ کوئی دبدبہ! میں حیران تھا کہ میرے والد سمیت ہزاروں ریلوے ملازمین جس کے خوف سے تھرتھر کانپتے تھے، یہ ان سے کئی درجے بڑے افسر ہیں لیکن پھر بھی نہایت خوش اخلاق نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ پاکستان ریلوے کے بہترین سفیر ہیں۔ جو اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے دوسروں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک کیبن مین کا بیٹا ہوں، میری عزت افزائی کی اور ریلوے کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کیں۔ دوران گفتگو ایک صاحب اندر تشریف لائے۔ رازی صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ ڈی پی او ہیں۔ ان کا نام نعمان نذیر ہے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ابھی اس شخص کو دیکھنے کی آرزو دل میں مچل رہی تھی جس کی آمد کا سن کر میرے والد پریشان ہو جایا کرتے تھے یعنی اے ڈی او.....

رازی صاحب نے بتایا کہ آپ جس اے ڈی او صاحب سے خوفزدہ ہیں، یہ ان سے زیادہ بڑے افسر ہیں۔ میں نے مسکرا کے جواب دیا، یہ تو بہت سادہ اور شریف النفس افسر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے تو مجھے کوئی خوف نہیں آ رہا۔ رازی صاحب نے قہقہہ لگایا اور فون اٹھا کر اے ڈی او صاحب کو بھی بلا لیا۔ اب میری نگاہیں دروازے پر جم گئیں۔ دروازہ کھولا، تو ایک سانولا سلونا درمیانی عمر کا شخص ادب سے نگاہیں نیچی کیے کمرے میں داخل ہوا۔ رازی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''لو جی صاحب، یہ ہیں وہ اے ڈی او صاحب۔ جنھیں دیکھنے کی فرمائش آپ بار بار کر رہے تھے۔''

میرے جسم میں خوشی کے پھوارے پھوٹ رہے تھے۔ میں تصور ہی میں اپنے والد سے بولا ''ابا جان کاش آج آپ زندہ ہوتے، تو اس کمرے میں پاکستان ریلوے کے سینئر ترین افسروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کس

www.pdfbooksfree.pk

قدر خوش ہوتے۔ ان افسروں میں وہ اے ٹی او بھی ہیں جن کے ریل گزرنے سے آپ خوفزدہ ہوجایا کرتے تھے۔"

میں نے رازی صاحب کو بتایا کہ میرے والد ریلوے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ ریلوے ہی ان کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھا۔ انھیں اپنی وردی سے بہت پیار تھا۔ جب ترقی پاکر وہ یارڈ فورمین بنے، تو سیاہ رنگ کی گرم وردی ریلوے کی جانب سے ملی۔ جب گھر پر ہوتے، تو براس پالش سے اپنی وردی کے بٹن چمکانے میں مصروف رہتے۔ ہم ان کے سیاہ جوتے بھی پالش سے اس طرح چمکا دیتے کہ چہرہ نظر آجائے۔ وہ جب وردی پہن کر لاہور کینٹ اسٹیشن پلیٹ فارم پر چلتے، تو ان کے کندھے پر لگے بیج سورج کی روشنی میں جگمگانے لگتے۔

ایک ریل منزل کی طرف رواں دواں ہے

دوران ڈیوٹی کبھی کبھار انھیں مال گاڑی میں بہ حیثیت گارڈ سے ساہیوال جانا پڑتا، تو وہ مال گاڑی کے ۷۲ ڈبوں کے بعد ایک ویران کیبن میں بہترین وردی پہن اس طرح بیٹھ جاتے جیسے شادی گھروں کی اسٹیج پر دولھے بیٹھتے ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ مال گاڑی ہے جس کی نہ روانگی کا کوئی وقت تھا اور نہ ہی منزل مقصود پر پہنچنے کا کوئی حتمی پروگرام۔ بعض اوقات تو کسی چھوٹے اسٹیشن کے جنگل میں مال گاڑی کو کھڑا کرکے کنٹرولر بھول جایا کرتا۔ جبکہ والد صاحب کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا تھا۔ ساہیوال پہنچ کر وہ ریسٹ ہاؤس میں کچھ دیر آرام کرتے پھر کسی اور گاڑی کو لیے لاہور آجاتے۔

وہ کانٹے والے تھے، کیبن مین، یا رڈ فورمین یا مال گاڑی کے گارڈ، پاکستان ریلوے میں ان کی ساری زندگی سرخ اور سبز جھنڈی دکھاتے ہی گزری۔ رات کو ان کے پاس ایک ہاتھ سے پکڑنے والی بتی ہوا کرتی۔ اس میں گودام سے مٹی کا تیل بھروا کر ایک چراغ سا رکھا ہوتا۔ بتی میں تین گھومنے والے شیشے تھے ایک سفید ایک سبز اور ایک سرخ رنگ کا۔ رات کے وقت جب کسی ریل کو روانگی کا سگنل دکھانا ہوتا، تو وہ گھما کر چراغ کی روشنی کے سامنے سبز شیشہ کردیتے۔ جب کسی ریل کو روکنا مقصود ہوتا، تو سرخ شیشہ استعمال کرتے۔ عام حالت میں سفید شیشہ ہی چراغ کے سامنے روشنی فراہم کرنے کے لیے نصب رہتا۔

انھوں نے پاکستان ریلوے میں ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کو بطور کانٹے والا ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۸ء میں لاہور اسٹیشن سے (فالج کے باعث) ریٹائرمنٹ لے لی۔ لیکن اس دوران کوئی ایک تنخواہ بھی انھیں پوری نہیں ملی۔ ریلوے کیشئر ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ نہ کچھ رقم خود ہی کاٹ لیا کرتا۔ والد صاحب سمیت ریلوے کے سبھی چھوٹے ملازم صبر شکر کرکے خاموش ہوجاتے۔

سال میں ایک بار وہ آنکھوں کا طبی معائنہ کرانے لاہور جاتے۔ جتنی راتیں انھیں لاہور میں رکنا پڑتا، میں رات کو خود سوتا اور نہ ہی کسی اور کو سونے دیتا۔ مجھے والد کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ لاہور سے آنے والی ہر ریل دیکھنے کے لیے دوڑتا ہوا یہ تصور کرا سٹیشن پہنچ جاتا کہ

www.pdfbooksfree.pk

شاید وہ واپس آ گئے۔ لیکن جب گاڑی گزر جاتی تو منہ بسورتا گھر چلا آتا۔

والد سے والہانہ محبت کا اظہار دوران تعلیمی دور بھی عروج پر رہا۔ جب پکی پہلی اور دوسری جماعت کا جب امتحان ہوا، تو والد اسکول کی چھوٹی دیوار کے اس پار اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک سر مجھ سے سوال پوچھتا۔ میں سوال سن کے والد کے چہرے کو پیار بھری نگاہ سے دیکھتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے بالکل صحیح جواب میری زبان پر آ جاتا۔ اس طرح میں ابتدائی تین مرحلے تو عبور کر گیا لیکن تیسری جماعت کے امتحان کا دن آیا، تو والد صاحب ڈیوٹی کی وجہ سے میرے ساتھ اسکول نہ جا سکے۔ نتیجہ میں فیل ہو گیا۔ نتیجہ سننے کے بعد جب میں منہ لٹکائے گھر پہنچا، تو والد نے پوچھا ''میرا شہزادہ پاس ہو گیا ہے نا؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ''ابا جی میں فیل ہو گیا ہوں۔''

یہ سنتے ہی والد صاحب کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ غصے میں دھاڑنے لگے۔ انھیں غصے میں بولتے سن کر ماں بھی کچن سے دوڑی چلی آئی کہ کیا آفت آ گئی۔ پہلے تو والد صاحب نے مجھے ایک طمانچہ مارا، پھر بازو سے پکڑ کر اسکول پہنچ گئے اور ہیڈ ماسٹر ابراہیم صاحب سے کہا ''میرا بیٹا فیل نہیں ہو سکتا، اس کا دوبارہ امتحان لیا جائے۔''

کلاس ٹیچر ہیڈ ماسٹر کی ہدایت پر سب کے سامنے مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میں سوال سن کر اپنے والد کا چہرہ دیکھتا پھر جواب دے دیتا۔ ماسٹر صاحب نے جتنے سوال پوچھے، میں نے ان کے بالکل صحیح جواب دیے۔ یوں میں تیسری جماعت کا امتحان پاس کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس لمحے ہیڈ ماسٹر کی بات اب تک یاد ہے ''میں اس بچے کی نفسیات نہیں سمجھ سکا۔ یہ اپنے والد سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اس کے بغیر اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ جب والد سامنے ہوں، تو سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔ یہ والد کے بغیر زندگی کیسے گزارے گا؟''

آج جب والد صاحب کو فوت ہوئے بیس سال بیت چکے، شاید ہی کوئی رات ایسی ہو، خواب کی حالت میں وہ مجھے نہ ملتے ہوں۔ میں آنکھیں بند کروں، تو اس دنیا پہنچ جاتا ہوں جہاں میرے والدین موجود ہیں۔ بیدار ہوں، تو اس دنیا میں واپس آ جاتا ہوں جہاں بیوی بچے بستے ہیں۔ مجھے خواب میں بھی وہ ریلوے اسٹیشن کے ارد گرد اور ریل پر ڈیوٹی انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی ٹرین کو شنٹنگ کر رہے ہیں، کبھی انجن پر لیور کھینچ کر تیز گام کو سگنل ڈاؤن کر رہے ہیں، تو کبھی پلیٹ فارم پر سیاہ رنگ کی وردی پہن کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے لیکن ان کی روح ریلوے اسٹیشن کے ارد گرد ہی گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان کی ریلوے سے والہانہ محبت کا کھلا اظہار ہے۔

اس لمحے مجھے ایف اے انگلش کی کتاب میں شامل ایک کہانی یاد آ گئی جو ایک انگریز اسٹیم انجن ڈرائیور کے گرد گھومتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ ریلوے کا ایک ڈرائیور ریٹائر ہوا۔ حسن اتفاق سے اس کے انجن کو بھی ناقابل استعمال قرار دے کر عجائب گھر کھڑا کر دیا گیا۔ ریٹائر ہونے کے باوجود اس ڈرائیور کا یہ معمول تھا کہ ہر صبح وردی پہن کر عجائب گھر پہنچتا اور وہاں آنے والے لوگوں کو انجن کے بارے میں بتاتا۔ جب یہ کام کرتے تھک جاتا، تو گھر واپس آ جاتا۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ پہلے کی طرح جوان اپنے انجن پر سوار گاڑی کو بے حیثیت کھیتوں کے درمیان سے تیزی سے گزار رہا ہے۔ وہ اس لمحے بہت

خوش تھا۔ جب بیدار ہوا، تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوش و خرم اور چاق چوبند تھا۔ بیٹی کے ہاتھ کا بنایا ناشتا کر کے وہ عجائب گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیٹی نے اتنی جلد جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا "آج رات میں نے ایک خواب دیکھا جس میں پہلے کی طرح اپنا انجن چلاتے گاڑی کو بھگائے جا رہا ہوں۔ میرا انجن بھی جوان ہے اور میں بھی۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے اپنے انجن کی یاد بہت ستا رہی ہے اور میں عجائب گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔

وہ انتہائی جذباتی انداز میں اپنی منزل پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں بہت سارے لوگ اردگرد کھڑے تجسس کی نگاہ سے انجن کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ قہقہے مارتا انجن پر سوار ہوتا اور لوگوں کو اس کے متعلق قصے سنانے لگتا ہے۔ اسی اثنا میں عجائب گھر کا نیا گارڈ وہاں پہنچ کر اسے انجن سے نیچے اترنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ گارڈ کو بتاتا ہے کہ میں ہی اس انجن کا ڈرائیور رہا ہوں۔ میں نے ساری زندگی اس انجن کے ساتھ گزاری ہے۔ براہ کرم مجھے نیچے نہ اتارا جائے۔ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میری اور میں اس کی زندگی ہوں۔

لاہور اسٹیشن کی قدیم تصویر

ڈرائیور کی باتوں کا نئے گارڈ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ بازو سے پکڑ کر ڈرائیور کو نیچے اتار دیتا ہے۔ ایک تو انجن سے جدائی اور دوسرا لوگوں کے سامنے بے عزتی کا غم اسے گھیر لیتا ہے۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اپنے گھر پہنچتا ہے۔ بیٹی جلد واپسی پر استفسار کرتی ہے۔ لیکن وہ بیٹی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوپہر کو جب کھانے کے لیے اسے بیدار کرنے بیٹی کمرے میں پہنچی، تو وہ اسے مردہ حالت میں ملا۔

آخر میں لکھاری لکھتا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرے، اس سے جدائی برداشت نہیں کرتا۔ جدائی موت کا دوسرا نام ہے۔ کچھ یہی عالم میرے والد کا بھی ہے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود وہ مجھے ریلوے اسٹیشن کے اردگرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی ریلوے سے محبت کا انوکھا اور انمٹ نقش ہے۔

اسی طرح ایک ڈراما پاکستان ٹیلی ویژن پر کچھ عرصہ پہلے دکھایا۔ ایک گارڈ ریٹائر ہونے کے باوجود اپنی وردی پہن ریلوے لائن کے قریب سبز اور سرخ جھنڈی لیے صبح سے بیٹھ جاتا۔ شام تک جتنی بھی گاڑیاں وہاں سے گزرتی، وہ ان کو پورے پروٹوکول کے ساتھ سبز جھنڈی دکھا کر اپنے قلبی سکون کا اظہار کرتا۔ جب تھک جاتا تو گھر واپس آ کر اپنی جوانی کے قصے لوگوں کو سناتا جو دوران ملازمت پیش آتے رہے۔

بات کچھ لمبی ہو گئی۔ میرے والد ہی نہیں ان کی اولاد کے خون میں بھی ریلوے کی محبت رچی بسی ہے۔ ہمارے خاندان کے جتنے بھی گھرانے ہیں، وہ ریلوے لائن کے نزدیک ہی آباد ہیں تاکہ چلتی گاڑی کی مدھر آواز اور انجن کی سیٹی کانوں میں رس گھول سکے۔ ہمیں دنیا جہان کے کانوں سے زیادہ اچھی آواز چلتی گاڑی اور انجن کی لگتی ہے۔ چلتی گاڑی جب کانٹے بدلے، تو اس وقت جو دھم

www.pdfbooksfree.pk

پیدا ہو، وہی ہماری محبوب ترین آواز کہلاتی ہے۔

بہرکیف اے ٹی او، ملک قمر الحق کو سامنے پا کر طبیعت خوش ہوگئی۔ یقیناً میرے والد کی روح بھی پُرمسرت ہوگی۔ ریلوے کا وہ افسر جس کے صرف گزرنے سے ریلوے ملازمین کے سانس رک جاتے تھے، وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہمارے درمیان اس لیے موجود تھا کہ میں اس سے بڑے افسر کا مہمان تھا۔ آج اس کا جاہ وجلال ختم ہو چکا تھا اور وہ ایک عام انسان کی طرح ہم سے بات بھی کر رہا تھا۔ قدرت کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان تھا۔

عبدالحمید رازی افسر کے بجائے ہر دلعزیز انسان دکھائی دیے۔ ان کی شخصیت اور تربیت کے پیچھے عظیم ماں اور باپ کا ہاتھ ہے۔ بے شک اچھے اور با اخلاق انسان ایسے پھول کی طرح ہوتے ہیں جس کی خوشبو کسی دائرے کی محتاج نہیں ہوتی۔ مجھے زندگی میں چار شخصیات عظیم نظر آئیں ایڈ۔ ڈاکٹر محمد عارف جو سیکرٹری خزانہ حکومت پنجاب رہے۔ دوسرے جاوید احمد قریشی (سابق چیف سیکرٹری پنجاب)، تیسرے جاوید محمود (سابق چیف سیکرٹری پنجاب) اور موجودہ صوبائی منتسب اعلیٰ) اور اب رازی صاحب کو بھی ایسے عظیم لوگوں میں شمار کرتا ہوں جن سے ملنے والا کوئی شخص ان کی شخصیت کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اسی اثنا میں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک افسر ڈی ایس آفس میں داخل ہوا اور رازی صاحب کو سیلوٹ مار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ غالباً ریلوے پولیس کا کوئی افسر تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ریلوے پولیس کے تمام کارنامے یاد آگئے جو وہ اکثر و بیشتر انجام دیتی ہے۔ وہ ریلوے کا تحفظ کم، چوری کی افزائش زیادہ کرتی ہے۔ کراچی سے پشاور تک ریلوے کی زمین پر جتنی بھی کچی آبادیاں قائم ہیں، وہ ریلوے پولیس کی "مہربانی" کا نتیجہ ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کر کے جہاں چاہو قبضہ پالو۔ بلکہ ریلوے پھاٹک اور اسٹیشن کے اردگرد جتنے بھی خوانچہ فروش موجود ہیں، وہ روزانہ ریلوے پولیس کو بھتا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اہلکار پیسے لے کر بغیر ٹکٹ مسافروں کو اپنے ڈبے میں بٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔

جب گاڑی چلے، تو کچھ مسافروں کی ٹکٹوں کے پیسے گارڈ جیب میں ڈال لیتا ہے، تو کچھ ایس ٹی اپنی جیب میں۔ پھر پولیس والے کہاں پیچھے رہنے والے ہیں؟ گویا پاکستان میں ریلوے کا نظام تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا، تو اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ریلوے پولیس کا ہے۔ عرف عام میں ریلوے پولیس کو چوروں کی نانی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ چیز جو کسی اور جگہ میسر نہ ہو، وہ ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھروں میں بآسانی مل جاتی ہے۔ ریل کے ذریعے آنے والی لکڑی، مٹی کا تیل، مچھلی، دودھ، چینی یا ڈیزل، وہ پہلے ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھر پہنچتا ہے، پھر بچا کھچا منزل مقصود پر۔ جنھیں رکھوالی کے لیے ملازم رکھا جائے جب وہی چوری کرنے لگیں، تو وہ کون سا ادارہ ہے جو اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟ ریلوے کا محکمہ اس لوٹ مار کی بہترین مثال ہے۔

دوران گفتگو میں نے رازی صاحب سے درخواست کی کہ بے شک آپ بہت اچھے افسر اور اعلیٰ انسان ہیں۔ اپنے ملازمین کے لیے اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن انجنوں اور ڈبوں کی بوسیدگی، ماتحت ملازمین کے مسائل اور کارکردگی جاننے کے لیے آپ کو بغیر کسی پروٹوکول کے ہر چھوٹے بڑے ریلوے اسٹیشن کا اچانک دورہ ضرور کرنا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ مسائل کا ازالہ ہو سکے۔ کسی نہ کسی شکل میں ریل گاڑیاں چل تو رہی ہیں لیکن انھیں چلانے والوں کے حالات اور مسائل سے آگاہی آپ کے کارناموں میں مزید نکھار پیدا کر سکتی ہے۔ پھر یہ عمل رب

www.pdfbooksfree.pk

کائنات کی نظر میں بھی نیکیوں میں اضافے کا باعث بنے گا۔ انھوں نے میری بات توجہ سے سننے کے بعد فرمایا ''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا'' جب واپس آئیں گے تو یقیناً اپنے سارے وعدے بھول چکے ہوں گے۔

رازی صاحب نے پھر اے ٹی او کو حکم دیا کہ وہ ہمیں ساتھ لے جا کر کنٹرولر آفس دکھائیں۔ وہ ہمارے ساتھ پیدل چلتے ہوئے کنٹرولر آفس کی جانب گامزن ہوئے۔ کسی نے ہوٹر بجایا نہ کسی نے رک کر سلام کیا۔ کنٹرولر آفس میں داخل ہوتے ہی بڑی میز پر بیٹھے ایک مصروف شخص سے ہمارا تعارف کروایا۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے، لیکن ان کا دماغ ریلوے لائنوں پر دوڑتی ریلوں کے تعاقب میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا، یقیناً یہی وہ خوفناک شخص ہے جسے ریلوے کی زبان میں کنٹرولر کہا جاتا ہے۔ اور جو پورے لاہور ڈویژن کی گاڑیوں کی نقل و حرکت کو اپنی ذہانت سے کنٹرول کرتے ہیں۔

پھر ہم لاہور تا فیصل آباد سیکشن کا ٹریفک کنٹرول کرنے والے کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک نوجوان سامنے لگے لمبے سے مسلسل گھور رہا تھا۔ ایک ڈایاگرام نما لکیروں والا کاغذ اس کے سامنے تھا۔ جیسے ہی ریل ایک سے دوسرے اسٹیشن پہنچتی، وہ اپنے ڈایاگرام میں لکیر کھینچ دیتا۔ پھر ہمیں لاہور تا ساہیوال سیکشن والے روم میں لے جایا گیا۔ وہاں بھی ایک مستعد نوجوان بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سامنے بھی ہر بڑے اسٹیشن کی تمام لائنوں کو ظاہر کرنے والی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے سوال پر اے ٹی او نے بتایا کہ نہ صرف تمام آنے جانے والی ریلوں کی نقل و حرکت یہاں سے کنٹرول ہوتی ہے بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کون سی ریل کس پٹڑی پر کھڑی کرنی ہے اور کس سے گزاری جائے۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر درمیانے درجے کے اسٹیشن پر دونوں جانب بنے پلیٹ فارم کے درمیان چار لائنیں ہوتی ہیں۔ پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائنوں کو لوپ لائن کہا جاتا ہے۔ دوسری مین لائن کہلاتی ہے۔ جن ریلوں کو اسٹیشن پر رکنا ہو، انھیں پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائن پر لایا جاتا ہے۔ ایکسپریس ٹرینوں کو درمیانی لائنوں سے گزارا جاتا ہے۔

کنٹرولر کے دفتر کا دورہ کرتے ہوئے مجھے خانہ کعبہ کا غلاف لے جانے والی ایکسپریس ریل روکنے کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کے رکنے پر کنٹرولر حبیب آباد اسٹیشن کے تمام عملے پر برسا تھا، شاید اب بھی کسی ایکسپریس ریل کو بغیر اسٹاپ روکنے پر کنٹرولر کا یہی رویہ ہوتا ہوگا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ بڑی سی میز پر بیٹھا افسر (شاید کنٹرولر) برستا ہے یا چھوٹے کمروں میں بیٹھنے والے افسر ریلوے ملازمین پر غصہ اتارتے ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام روزانہ لاکھوں انسانوں کی بیک وقت روح قبض کرتے ہیں لیکن اس کام میں لاکھوں فرشتے بھی ان کی معاونت کرتے ہیں۔ شاید اسی طرح کنٹرولر آفس میں بھی کنٹرولر تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کے معاون بے شمار ہیں۔ وہ ہر ریلوے اسٹیشن کے عملے بطور خاص اے ایس ایم پر روزانہ گولہ باری کرتے ہوں گے۔

آخر وہ دورہ اختتام پذیر ہوا جس کی خوشگوار یادیں ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہیں گی۔ والد مرحوم سے ملاقات تو روزانہ خواب میں ہوتی ہے، لیکن مجھے یقین ہے، کسی رات خواب میں ذی ایس آفس دورے کے حوالے سے بات ہوئی، تو والد یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ وہ کام جو خود نہیں کر سکے، اسے ان کے بیٹے نے سے انجام دے دیا۔ پھر دل سے یہی آواز نکلتی ہے کہ کاش یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے والد زندہ ہوتے تو میری اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

دنیا میں یکتا و نرالا

دیکھنے والا نابینا

ایک بزرگ کا یادگار قصہ، وہ معذوری کے باوجود بھکاری بننے کو تیار نہ تھا

تنویر اقبال واکھوارہ

سوزوکی

جیسے ہی اسٹاپ پر رکی۔ میں نے نیچے اترنا چاہا، تو میرے پہلو میں بیٹھے ایک نابینا بزرگ نے میری کلائی پکڑ لی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سوزوکی سے اترنے میں میرا سہارا چاہتا ہے۔ میں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اترنے میں مدد دی۔ بزرگ جب اتر چکا، تو بھی میری کلائی پر اس کی گرفت بدستور قائم رہی۔

''بزرگ! آپ سوزوکی سے باخیریت نیچے اتر چکے ہیں۔'' میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔

''مجھے اگلے چوک تک پہنچا دو۔'' بزرگ نے فرمائش کی۔

''مگر بزرگ! مجھے اس طرف نہیں جانا۔'' میں ہرگز پیچھا چھڑانا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقتاً مجھے مخالف سمت جانا تھا۔ کچھ ہی دور میرا دفتر تھا۔ اگر میں چوک کی طرف جاتا، تو مجھے لمبا چکر کاٹ کر دفتر پہنچنا پڑتا۔ یہ جانتے ہوئے میں نے بزرگ سے پیچھا چھڑانا چاہا، مگر وہ کمبل کی طرح میرے گلے پڑ گیا۔

''جب صف میں کھڑے ہو چکو، تو امام کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔'' کلائی پر بزرگ کی گرفت بدستور برقرار تھی۔ مجھے ناچار اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ بزرگ نابینا ضرور تھا مگر اس کی ظاہری حالت کافی بہتر تھی۔ صاف ستھرا لباس، بینائی سے محروم آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔ ہاتھوں

www.pdfbooksfree.pk

تین چھری، بغل میں لاٹھی، سیاہ رنگ کا صاف ستھرا تھیلا۔ ویسے تو ایسے نابینا بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر وہ بزرگ مجھے کسی بھی طرح بھکاری نہ لگا۔

لیکن اس نے مجھے جس چوک پر پہنچانے کا کہا، وہاں اکثر بھکاری ہی بیٹھے نظر آتے کہ کافی ہجوم ہوتا تھا۔ باقی جگہوں کی نسبت وہاں کے بھکاری خاصی بھیک بٹور لیتے تھے۔ بزرگ نے میری کلائی پکڑ رکھی تھی۔ میں طوعاً کرہاً اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ حالانکہ میں تیز چل کر جلد چوک پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس بزرگ سے جان چھوٹے۔ میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھنے لگا کہ بزرگ کو کیا مجبوری ہے جو اس عمر میں بھی گھر میں ٹک نہیں پایا... اوپر سے گرمی بھی بلا کی تھی۔ ویسے تو ابھی صبح کے نو بجے تھے مگر ان دنوں سورج صبح ہی سے سوا نیزے پر محسوس ہوتا۔ میں بزرگ کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ اب گلے پڑے ڈھول کو بجانا تو تھا۔

"بزرگو! آپ نے کدھر جانا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"اس چوک تک ہی جانا ہے... وہیں بیٹھتا ہوں۔" بزرگ نے کہا۔

"تو کیا آپ وہاں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے بزرگ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ بولا "الحمدللہ، ابھی تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ ابھی تو یہ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا اور ویسے بھی بزرگ کسی طرف سے بھکاری نہیں لگتا تھا مگر چوک پر جانے کا مقصد کیا ہے؟

"معاف کرنا بزرگو!" میں نے معذرت چاہی "لیکن آپ چوک میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں؟"

"سرمہ اور سرمہ سلائی بیچتا ہوں۔" بزرگ نے کہا۔ میں تعجب سے اس کی بغل میں لٹکتے تھیلے کو دیکھنے لگا جس میں یقیناً سرمہ اور سرمہ سلائیاں (سرچو) ہوں گے۔

"یقیناً تم حیران ہو گے کہ نابینا اور سرمے کا کاروبار لیکن واقعی میں سرمہ بیچتا ہوں۔ میں خود پیدائشی نابینا ہوں۔ میرے پاس بینائی نہیں لیکن جن کے پاس یہ نعمت ہے، انھیں اس کی حفاظت کا درس دے رہا ہوں کیونکہ کسی چیز کی قدر و قیمت کا انسان کو تبھی پتا چلتا ہے جب وہ اسے کھو بیٹھتا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"لیکن بزرگو کوئی آپ کو پیسوں کے معاملے میں دھوکا بھی تو دے سکتا ہے۔ آپ دیکھ تو پاتے نہیں۔"

بزرگ مسکرایا.....

"اور بولا کہ میں نابینا ہوں مگر میں وہ کچھ بھی دیکھ لیتا ہوں جو تم آنکھوں والے نہیں دیکھ پاتے ... اور جو کچھ تم لوگ دیکھ سکتے ہو، وہ میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

بزرگ کے کہنے پر میں متعجب ہوا "آپ کیا دیکھ لیتے ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

"یہی کہ ... دیکھو تم میرے ساتھ چلنے پر اندر ہی اندر کڑھ رہے ہو۔ حسن بیٹے مجھے برا بھی کہہ رہے ہو۔" بزرگ نے کہا، تو لاشعوری طور پر میری گردن شرمندگی سے جھک گئی۔ وہ کہنے لگا "آج کی نسل اچھائی سے دور بھاگتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب لوگ رضاکار ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔"

"معاف کیجیے گا بزرگو! آپ نے میرے بارے ٹھیک ہی کہا، کیونکہ آپ پہلے ہی بتا چکے کہ وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ پاتے۔ اس لیے یہ تو نہیں

www.pdfbooksfree.pk

پوچھوں گا کہ میری حالت کا آپ کو کیسے پتا چلا ...؟ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے۔" میں نے کہا۔

بزرگ ہنس دیا اور کہنے لگا "کاش لوگ اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں، مگر ایسا ہوتا نہیں۔ کوئی چاہے خطا کاری ہی کیوں نہ کر آئے، سمجھتا یہی ہے کہ اس نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ بلاوجہ خود پہ گھمنڈ رکھتا ہے۔"

ہم بظاہر چل مگر حقیقتاً رینگ رہے تھے۔ اوپر سے سورج آگ اگل رہا تھا۔ ایسی سست رفتار میں دھوپ اور بھی تیز لگ رہی تھی۔ "بزرگو! اس عمر اور ایسی حالت میں بھی آپ محنت کرتے ہو۔ کیا آپ کی کوئی اولاد ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"الحمدللہ دو بیٹیاں ہیں۔ مگر کما کر کھلانے کے لیے بیٹا نہیں ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے بیٹا دینا مناسب نہیں سمجھا۔" بزرگ نے بتایا۔

"تو کیا سرمہ بیچنے سے آپ کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سارا تکیہ، تو اوپر والی ذات پاک ہی چلاتی ہے۔ رزق حلال میں برکت وہی ذات ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی فاقہ کشی کرنا پڑے، تو برائی نہیں ... ایک مسلمان کی بڑی پہچان ہے کہ جب تک جسم مشقت کرنے میں ساتھ دیتا رہے، اسے حلال کی روزی کمانی چاہیے۔ جب اس قابل نہ رہے، تو زکوٰۃ اور فطرانہ لینے میں کچھ حرج نہیں۔ مگر یہ نہیں کہ تندرست اور صحیح سلامت ہونے کے باوجود بھیک مانگتا پھرے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور جب تک جسم نے ساتھ دیا، ان شاءاللہ محنت مزدوری سے رزق حلال کمانے کی کوشش کروں گا۔ بس اللہ تبارک تعالیٰ اپنی ذات پاک کے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔"

میں نے دل میں بزرگ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بولا "بقول آپ کے جو کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں، وہ آپ دیکھنا نہیں چاہتے، یہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

میں نے کھلبلا کر سوال کیا، تو وہ مسکرا دیا اور بولا "پڑھے لکھے لگتے ہو مگر اتنی موٹی بات نہیں سمجھ سکے۔"

"آپ وضاحت کر دیجیے۔"

"تم بینا لوگ یہ بے حیائی، قتل و غارت، لوٹ مار، بربریت جو دیکھ رہے ہو، خدا مجھے کبھی نہ دکھائے۔" بزرگ کہنے لگا "خدا نے مجھے بینائی نہ دے کر اچھا ہی کیا ورنہ میں بھی تم لوگوں میں شامل ہو کر خواہ مخواہ گنہگار ٹھہرتا۔"

"وہ کیسے ... میں سمجھا نہیں؟" میں متعجب ہوا۔

"جانتے ہو گناہ دیکھ کر بھی جو اسے نہ روکے، وہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اگر میری بینائی ہوتی تو میں بھی تمہاری صف میں شامل ہوتا۔ تمہاری یہ روشنی سے میرے روشن اندھیرے کہیں بہتر ہیں۔" بزرگ نے کہا۔

خدا خدا کر کے ہم منزل مقصود پر جا پہنچے۔ میں نے بزرگ کو آگاہ کیا "ہم چوک پر پہنچ چکے ... بتایئے آپ کو کہاں بیٹھنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی سائے میں بٹھا دیجیے، مگر ان بھکاریوں سے ذرا دور ہی بٹھانا۔"

میں اسے ایک سایہ دار جگہ کی طرف لے گیا۔ کچھ دور بھکاری بھیک مانگ رہے تھے "اللہ کے نام پہ دیدے بابا ... مولا خوش رکھے ..... جگ جگ جیے ..... محتاج کو دے جا، مولا تجھے دے گا ..... کوئی اللہ دے نام تے دیوے گا۔"

میں نے دیکھا ان بھکاریوں میں کچھ تو لنگڑے اور نابینا تھے یا اداکاری کر رہے تھے۔ کچھ ہٹے کٹے جھوٹ موٹ ہاتھ پاؤں مروڑے لولے لنگڑے بنے بیٹھے تھے۔ ان کی درد بھری صداؤں پہ کچھ لوگ جن کے دل پسیج جاتے،

www.pdfbooksfree.pk

دو نوٹ اور سکے ان کی جھولی یا تھیلوں میں ڈال دیتے۔

بزرگ نے تھیلا زمین پر رکھا۔ اندر سے تہ شدہ ایک چادر نکالی اور نیچے بچھا کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا ''میں بھکاری نہیں ہوں تم سمجھ رہے ہو۔ یقیناً تمھیں تم دیکھ بھی سکتے ہو۔''

''ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ اور یہ تو کافی سکے ہیں۔ پھر بھی جیب... لگ رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہی تو میں تمھیں دکھانا چاہتا'' بزرگ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ''میری تھی ایک دکان آتشزدگی نے ... اس سے دور کی جیبوں ورنہ مجھے بھی بھری تھی روٹی جیب نہ دے ڈالے۔'' بزرگ نے کہا۔

اس نے پھر تھیلے سے میں ضرب میں انچ کا اسٹینڈ بورڈ نکال کر ... پر مشرف میں لکھا تھا: خدا تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ نعمت ''آنکھ'' کی حفاظت کیجیے۔''

نیچے یہ عبارت درج تھی: ''ماہ ... سرمہ فی ڈبی مع سرمچو قیمت ۲۰ روپے۔''

میں نے پڑھا، تو پوچھا ''بزرگ آپ حافظ ہیں؟''

''لندن یونین سے ... اپنی بیٹیوں کو بھی قرآن پاک حفظ کرایا ہے۔'' یہ کہہ کر بزرگ تھیلے سے باقی سامان نکالنے لگے۔

''اچھا بزرگ اب میں چلوں گا... دعا کرنا۔''

میں مڑنے لگا تو بزرگ نے کہا ''ٹھہرو۔''

میں ٹھہر گیا۔ بزرگ نے ایک ڈبی سرمہ مع سرمچو نکال کر میری طرف بڑھائی اور بولا ''تم نے میری مدد کی ہے۔ یہ میری طرف سے تحفہ رکھ لو۔ ویسے میں کسی کا احسان رکھتا تو نہیں لیکن اس وقت تمھارا احسان بھی نہیں سکتا۔ اگر خدا نے موقع دیا، تو ضرور اس بوجھ سے چھٹکارا چاہوں گا... اور ہاں... خدا تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ نعمت کا شکر اسی صورت بجا لاتے ہیں جب بندہ اس نعمت کی حفاظت کرے۔''

بزرگ کے کہنے پر میں نے سرمہ مع سرمچو لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس مختصر سی ملاقات میں وہ کیا پیغام دے گیا تھا، آپ بھی پوچھیے گا۔

◆◆◆

احساس ذمے داری

ایک بدو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگا۔ امیر المومنین نے فرمایا ''میرے گھر میں آج کی روٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔''

بدو مایوس ہو کر چلا گیا۔ وہ بلند آواز سے کہتا جا رہا تھا ''بخدا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ سے میرے متعلق باز پرس کرے گا۔''

اس پر امیر المومنین رو پڑے اور اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر بدو کو بلایا اور اپنے غلام کو آواز دی ''قنبر! میری زرہ لے آؤ۔''

قنبر لے آیا۔ امیر المومنین نے زرہ بدو کو دیتے ہوئے کہا ''دیکھو تمھیں کوئی دھوکا نہ دے۔ یہ بڑی قیمتی زرہ ہے۔ اس سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر آئی ہوئی پریشانیوں کو بارہا دور کیا ہے۔''

''امیر المومنین، بدو کے لیے بیس درہم کافی تھے۔'' قنبر نے عرض کیا۔

''قنبر! اگر یہ دنیا میرے لیے سونا اور چاندی بن جائے اور میں سب کی سب اس شخص کو دے دوں، تب بھی مجھے دلی سکون نہ ہوں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس شخص کے بارے میں جو میرے سامنے کھڑا ہے، باز پرس کی تو میں کیا جواب دوں گا۔''

(حکمران صحابہ، انتخاب آمنہ رمضان، عارف والا)

www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے دلکش سیاحتی مقامات

کھیوڑہ سے کلرکہار تک

کوہستان نمک کی تاریخی و تہذیبی جھلکیاں دکھاتا ایک دلچسپ سفرنامہ

پروفیسر اسد سلیم شیخ

ہماری گاڑی پنڈ دادنخاں شہر چھوڑتے ہوئے کھیوڑہ کی طرف رواں دواں تھی۔ راستے میں گورنمنٹ البیرونی کالج، پنڈ دادنخاں بھی گزرا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ اسی علاقے کے ایک امیدوار سے پبلک سروس کمیشن کی انٹرویو کمیٹی نے سوال کیا "یہاں کے کالج کا نام "البیرونی" کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا "یہ کالج شہر سے کافی باہر واقع ہے، اسی لیے۔"

سچ یہ ہے کہ البیرونی نے اس علاقے میں قیام کیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الہند" کے چھ حصے تحریر کیے اور زمین کا قطر بھی معلوم کیا۔ البیرونی کی بابت سوچتے ہوئے ہم کھیوڑہ کان پہنچ گئے۔ ٹکٹ گھر ایک پرانی بنگلہ نما عمارت میں قائم تھا۔ پتھریلے اونچے نیچے راستوں سے ہو کر براہ مرکزی دروازہ کان کے اندر داخل ہوئے۔

ہاتھوں میں بیٹری لائٹس اٹھائے اور سر پر ہیلمٹ پہن کر ایسے لگا، چاند کے سفر پر روانہ ہونے والے ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

کان کے اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوا، گہری اندھیری غار میں داخل ہو چکے۔ اندر کا درجہ حرارت باہر سے قدرے کم تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹرام گاڑی ہمیں کان کے اندرونی حصوں کی سیر کرانے تیار کھڑی تھی۔ پہلے کان سے نمک باہر لانے کے لیے کوئلے سے چلنے والے انجن چلتے تھے۔ ان کے دھوئیں سے کان کی اندرونی چھت اور درو دیوار سیاہ ہو چکے تھے۔ ویسے بھی اندر اندھیرا گھپ تھا مگر ٹرام کی بتی نے اسے کچھ کم کر دیا۔

ایک خطرناک موڑ آیا، تو ہم دبک کر بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی کان کے اندر چاندنی چوک پر جا رکی۔ وہاں راہبر نے ہمیں ایک دائرے میں کھڑا کیا اور خود ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر کان کی تاریخ بتانے لگا۔

کھیوڑہ میں نمک کی یہ کانیں، لحاظ رقبے اور ذخائر دنیا میں سب سے بڑی اور نمک کی برآمد میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ یہاں سے سکندر اعظم کی ہندوستان آمد سے بھی پہلے نمک نکالا جا رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا۔ جب سکندر اعظم کی فوجیں اس علاقے میں آئیں، تو ان کے گھوڑے پہاڑ چاٹنے لگے۔ تبھی یونانیوں کو یہاں نمک کی موجودگی کا پتا چلا۔ پہلی بار باقاعدہ طور پر کھیوڑہ سے نمک اکبر اعظم کے عہد میں نکالا گیا۔

کہا جاتا ہے، ایک مقامی شخص "اسپ خان" نے اکبر کو یہاں نمک کی موجودگی کی اطلاع اس شرط پر دی کہ وہ جب تک زندہ رہا، اسے کان کی کل عمومی اجرت کے برابر رقم بطور انعام دی جائے گی۔

جدید سائنسی بنیادوں پر کان سے نمک کا حصول انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شروع ہوا۔ کان تک پہنچنے کے لیے مرکزی سرنگ کھودنے کا سہرا ڈاکٹر وارتھ نامی انگریز کے سر ہے جس نے ۱۸۷۲ء میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ کانیں اب نمک سے متعلق اہمیت ہی نہیں رکھتیں بلکہ ہر سال ہزاروں افراد بہت شوق سے یہ دیکھنے آتے ہیں۔ کان کے باہر پہاڑ سوجیسم کے پہاڑ ہیں جس سے سیمنٹ تیار ہوتا ہے۔

صاحب تحریر

پروفیسر اسد سلیم شیخ کا تعلق وسطی پنجاب کے قصبے پنڈی بھٹیاں سے ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کرکے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کی ڈگری پائی۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج پنڈی بھٹیاں میں بطور وائس پرنسپل تعینات ہیں۔ قومی اخبارات میں مضامین اور کالم نگاری کرتے ہیں۔ رائٹرز گلڈ پنجاب کے رکن اور ذلا بھٹی ٹرسٹ پنجاب کے چیئرمین ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں حکومت پاکستان نے انھیں علمی و تحقیقی کی خدمات کے صلے میں صدارتی ایوارڈ "اعزاز فضیلت" سے نوازا۔ ۲۰۰۱ء میں راولپنڈی آرٹس کونسل کی طرف سے ان کی کتاب "انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان" پر تحریک پاکستان میڈل ملا۔ وزارت ثقافت حکومت پنجاب کی طرف سے کتابوں حاکمان پنجاب اور نواب سعداللہ خاں پر ایوارڈ دیے گئے۔ آپ کی تصانیف میں ڈلے دی بار، وسیب، ٹھنڈی سڑک (مال روڈ لاہور کا منظر نامہ)، اور کچھ سفر بھولتے نہیں (سفرنامہ) شامل ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

راہبہ کی تاریخ دانی ختم ہوئی، تو سامنے ہی نمک سے بنی اور قمقموں سے جگمگ جگمگ کرتی مسجد نظر آئی۔ یہ بھی ایک عجوبہ ہے۔ ساتھ ہی کان کی چھت سے نمک کے آنسو ٹپ ٹپ کر زمین پر یوں جم گئے تھے کہ وہ قدرتی مجسموں کا منظر دکھائی دیتے۔ اسی چوک میں نمک کی اینٹوں سے چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہیں جہاں دمے کے مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ چند آگے بڑھے، تو ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ اس کے دونوں طرف نمکین پانی کے گہرے تالاب تھے۔ اس ہال سے اب تک اتنا نمک نکالا جا چکا ہے کہ اس کی چھت بہت بلند ہو چکی۔

اس لیے اسے دیکھنے کے لیے ہمارے راہبہ نے روشنی کے ایک غبارے کو بلند کیا۔ اس نے غبارے سے ... تعلق ... چھتا ... جیسے ہی اوپر آنے لگی، تو بلند روشنی کا گولہ چمک اٹھا۔ ساتھ ہی وہ غبارہ اوپر چھت تک لے گیا۔ اس روشنی سے ہمیں ہال کی وسعت، بلندی اور نقش و نگار دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ بڑا عجیب و غریب اور دلفریب منظر تھا۔ راہبہ نے بتایا کہ یہاں کئی فلموں کی شوٹنگ بھی ہو چکی۔

ہال سے نکلے، تو راہبہ ہمیں ایک بڑے تالاب کی طرف لے گیا۔ اس کے اوپر لکڑی کا پل بنا تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں تالاب کے پانی سے ٹکرا کر بہت خوش نما منظر پیش کر رہی تھیں۔ پل پر کھڑے ہو کر تالاب کی گہرائی کا اندازہ لگایا۔ نمکین پانی کی وجہ سے تالاب میں اگر کوئی گر جائے، تو ڈوبتا نہیں۔ مگر ہمارے خیال میں بچتا بھی نہیں۔ روایت ہے کہ تالاب میں پتھر پھینکتے وقت انسان کے دل میں جو خواہش ہو، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ ہماری تو صرف یہی خواہش تھی کہ وطن پوری ہو جائے۔ اس لیے صرف ایک پتھر پھینکا۔ مگر دیکھا کہ ہمارے کئی ساتھیوں نے دو دو پتھر پھینکے۔ شاید انھوں نے غالب کا یہ شعر سن رکھا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کٹاس مندر کی ایک خوبصورت تصویر

یوں نا تمام خواہشیں لیے کان کا ہمارا اندرونی سفر ختم ہوا۔ باہر نکل کر ہم پھر اگلی منزل کٹاس کی جانب روانہ ہو گئے۔ بل کھاتی سڑک پر ہماری گاڑی جوں جوں بڑھتی، اونچائی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پہاڑ اور میدان بھی اپنا رنگ بدل رہے تھے۔ کہیں سرسبز میدان آ جاتے، تو کہیں سرخی مائل، بنجر، پتھریلی زمین کے قطعے دکھائی دیتے۔ چند منٹوں کا سفر طے ہوا ہو گا کہ پہاڑوں کے دامن سے ڈنڈوت سیمنٹ فیکٹری کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں دکھائی دیا۔ اس میں وہاں کام کرنے والے سیکڑوں مزدوروں کا خون پسینا بھی شامل تھا۔

تیس پینتیس منٹ سفر کے بعد قصبہ چوا سیدن شاہ آ گیا۔ یہ قصبہ وہاں مدفون بزرگ حضرت سیدن شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ "چوا" کے معنی ہیں چشمہ۔ روایت

www.pdfbooksfree.pk

کے مطابق یہاں بہنے والا چشمہ اسی بزرگ کی کرامت اور دعا سے جاری ہوا۔ قصبے کا عرق اور گلاب بہت مشہور ہے۔

قصبے سے نکل کر گاڑی ایک تنگ سڑک پر رواں دواں ہوئی تو دونوں اطراف سے ناشپاتی، آڑو اور لوکاٹ کے باغات میں گھری تھی۔ کٹاس پہنچے تو ایک پہاڑ کے دامن میں پتھروں اور بالکل سامنے اسکول کی عمارت تھی۔ اسی کالج ہم نے ساتھ لایا کھانا گرم کیا اور جھوک منائی۔ فارغ ہوئے تو کٹاس کے مندروں کی سیاحت کرنے نکل پڑے۔ ہندو عقیدے کے مطابق کٹاس مقدس جگہ ہے۔ مہابھارت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ہندی روایات کے مطابق جب شیو دیوتا کی بیوی ستی کا انتقال ہوا تو وہ بہت صدمہ ہوا۔ اس کے آنسوؤں سے روئے زمین پر دو جھیلیں معرض وجود میں آئیں۔ ایک اجمیر کی "پشکر" یا "پشکرا" ہے۔ دوسری دو آب ہندو ساگر کی "کٹک شالا"۔ کثرت استعمال سے یہی لفظ آہستہ آہستہ کٹاس بن گیا۔

بعض مورخین کے نزدیک کٹاس کا اصل نام "کیلاش راج" تھا۔ اس کے معنی ہیں پہاڑوں کا بادشاہ۔ روایت کے مطابق ... ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بھگوان شنکر کا ظہور اسی جگہ ہوا۔ کٹاس کے مندر ان مندروں کی باقیات ہیں جنھیں پانڈوؤں نے بارہ سالہ بن باس کے دوران تعمیر کیا گیا۔ ماہرین آثار قدیمہ انھیں

... ست گھرا ... نام سے موسوم ... ہیں۔ ... کی عبادت گاہیں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئیں۔ ان کے سامنے ایک چشمہ صدیوں سے بہہ رہا ہے۔ ہشت عبادت گاہیں اسی چشمے کے اردگرد واقع ہیں۔

کٹاس میں ایک قدیم درس گاہ بھی واقع تھی جہاں دور دراز سے طالب علم حصول تعلیم کے لیے آتے۔ معروف چینی سیاح "ہیون سانگ" نے وہاں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ یہاں ہر سال بہت بڑا میلا لگتا تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک چشمے میں اشنان (غسل) کرنے سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہاں سات مندروں میں سب سے بڑا مندر وشنو جی کا ہے جس کی چھ سو سال پہلے مرمت کی گئی۔ دوسرے مندروں میں شیو جی، ہنومان جی، شیو لنگ، رام چندر، پاربتی اور لکشمی دیوی کے مندر شامل ہیں۔ ... یہ مندر ... رہتے ہیں۔ ... مرمت کر کے انھیں محفوظ بنایا گیا ہے۔

تخت بابری جہاں شہنشاہ بابر کھڑا ہوتا تھا

ہم ... چشمے پر ... سے گزر کر ان مندروں تک پہنچے۔ تفصیلی جائزے کے بعد واپس لوٹنے لگے تو ایک طرف کسی پرانی حویلی کے کھنڈر نظر آئے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ حویلی راجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل ہری سنگھ نلوہ نے تعمیر کرائی تھی۔ ہم پھر اپنی اگلی منزل تخت بابری روانہ ہوئے جو یہاں سے ۲۸ کلومیٹر دور تھی۔ راستے میں سیمنٹ کے تین کارخانے دکھائی دیے۔ موڑ وے قریب ہوئی تو

www.pdfbooksfree.pk

کلرکہار بھی آ گیا۔

جھیل کی طرف جانے والی بل کھاتی سڑک کی طرف مڑے، تو تاحد نظر پھیلے باغات نے ہمارا استقبال کیا۔ معطر اور سرد ہوا بدن چھونے لگی۔ پُر کیف و سرور کے عالم میں گاڑی سے اترے۔ تاریخی وادی کا قدرتی حسن و جمال ہمارے سامنے تھا۔ تاحد نگاہ پھیلے باغات میں پھولوں کی مہک، کوکلوں کی کوک اور موروں کی چھوں چھوں کی سرمئی آوازوں نے مل کر خوب صورت اور سحر آگیں جشن کا روپ دھار لیا۔

جنرل کننگھم کے بقول اس وادی کا پرانا نام ''شاکلیا'' تھا۔ اس کو ''کلوکہر'' بھی کہا گیا۔ مغل بادشاہ بابر یہاں آیا، تو تخت بابری کے نام سے پہاڑ کی چٹان تراش کر ایک تخت بنوایا۔ اس پر کھڑے ہو کر بابر نے اپنی فوج سے خطاب کیا۔ نیز ''باغ صفا'' کے نام سے ایک خوبصورت باغ لگوایا۔ یہ برصغیر میں پہلا مغلیہ باغ تھا۔ تخت بابری اور باغ صفا کلرکہار میں مغلیہ دور کی بہترین یادگاریں ہیں۔

باغ کی دیکھ بھال موضع بھون میں آباد شیخ گدھوک خاندان کے مورث اعلیٰ بابا کالی داس کے ذمے تھی۔ آج یہ باغ تاحد نظر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ایک وسیع جھیل ہے جس کا پانی نیلگوں تھا۔ اس پر تیرتی رنگ برنگی سائیکل نما کشتیاں بہت بھلی لگیں۔ کناروں پر سیکڑوں مچھلیاں آلودگی کی وجہ سے مری پڑی تھیں اور آبی پرندے ان کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ یہ قدرتی چشموں کے پانی سے بننے والی جھیل ہے۔ اس کے کناروں پر بچوں کے کئی جھولے بنے ہیں۔ ایک اونٹ اور ایک گھوڑا بھی سیاحوں کی سواری کے لیے موجود تھے۔

جھیل کی سیر سے فارغ ہو کر تخت بابری کا نظارہ کیا، تو خود کو مغل بادشاہ بابر سمجھنے لگے، مگر نیچے کوئی فوج نہ تھی جسے خطاب کرتے۔ تخت پر کھڑے ہو کر نظر دوڑائی، تو نیچے لوکاٹ اور کیلے کے باغات تھے، سامنے خوبصورت جھیل کا رواں دواں پانی اور بائیں طرف کلرکہار کی پھیلی آبادی۔ تخت بابری کے اوپر دو تین خوب صورت ریسٹ ہاؤس بھی ہیں۔ ان میں سے ایک قصر ناز کے نام سے منسوب تھا۔ یہ باغ صفا کے درمیان واقع ہے۔ اب اس کے دروازے پر ''ویرانی'' درج ہے۔ ساتھ ہی شاعر مصطفی زیدی کا یہ مشہور شعر درج ہے:

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

دراصل برطانوی طرز کے اس ریسٹ ہاؤس کو ضلع جہلم کے ڈپٹی کمشنر اور شاعر مصطفی زیدی نے ۱۹۶۱ء میں بنوایا تھا۔ وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنی محبوبہ کی یاد میں کئی غزلیں کہیں۔ اب یہ ریسٹ ہاؤس کلرکہار کے اسسٹنٹ کمشنر کی رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا۔ اس کے بالمقابل خوبصورت سفید آنچل اوڑھے آشیاں ریسٹ

www.pdfbooksfree.pk

ہاؤس واقع ہے جسے ضلعی حکومت نے تعمیر کیا۔ ہم نے اسی میں پڑاؤ کیا۔

گلمکبار میں شام اترتے ہی خاموشی چھا جاتی اور عجیب قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں ستا کر ہم پہاڑی پر واقع مزار ''سخی آہو باہو'' چلے گئے۔ اس دربار پر شیشہ اور کاشی کاری ایسی صناعی سے کی گئی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ روایت کے مطابق یہ دربار غوث الاعظم کے دو پوتوں، سید محمد یعقوب اور سید محمد اسحٰق کا ہے۔ ان کے دادا حضرت عبدالقادر جیلانی نے انھیں اس علاقے میں تبلیغِ دین کے لیے بھیجا تھا۔ مقامی قبائل سے لڑائی میں انھوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انھیں پہاڑ کی چٹان پر موجود دربار میں دفن کیا گیا۔

اس دربار پر بڑی تعداد میں موروں اور کبوتروں کا بسیرا ہے۔ کبوتر دن رات دربار ہی پر رہتے ہیں۔ مور دن بھر باغوں میں پھرتے اور شام کو دربار آجاتے ہیں۔ جب سورج غروب ہونے لگے، تو مور اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوتے اور سرور میں رقص کرتے ہیں جسے مقامی زبان میں ''پائل'' کہا جاتا ہے۔

ہم مزار پر فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے، تو باہر دکانوں کا جائزہ لینے لگے جہاں مختلف اشیا برائے فروخت رکھی تھیں۔ ان میں عرق گلاب، عرق چوعرق اور گل قند نمایاں تھے۔ یہ چیزیں مقامی سوغات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک آدھ دکان پر پتھر کی بنی اشیا بھی دیکھیں۔ سب نے پسند کی اشیا خریدیں۔ شام تیزی سے رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ چناں چہ ہم نے واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا۔

◆◆◆

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔''

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

www.pdfbooksfree.pk

ایک انجمن نے دی

شادی کی سلامی

منگتے کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دینے
والے مہربان کا سبق آموز قصہ

[illegible]

یہ اس دور کا واقعہ ہے جب افغانستان میں [illegible] اور قوانین کی بالادستی تھی۔ مختلف نوعیت کے جرائم کی سزائیں [illegible] مقرر تھیں۔ [illegible] اور اقبال جرم پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ [illegible] بھی ہوتی تھی۔

ایک بھکاری نے [illegible] ایک خوش پوش راہگیر سے درد بھری آواز میں کہا "جناب میں دو دن سے بھوکا ہوں۔"

اسی اثنا میں ایک سپاہی ادھر آ نکلا تو بھکاری نے [illegible] بلند آواز میں کہا "اور اگر میں دو دن [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] ہے۔"

میں نے ہوش سنبھالا تو [illegible] میں [illegible] تھا۔ میں بھکاری کیوں بنا، مجھے نہیں معلوم۔ [illegible] سے کیسے محروم ہوا، یہ بھی نہیں پتا۔ ماں باپ اور خاندان کا

www.pdfbooksfree.pk

بھی پیدا نہیں [illegible] خدا سے ذہنی [illegible] کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یوں لگتا جیسے میں آسمان سے پھینکا ہوا ہوں۔ وہ دیہاتیوں سے بہت [illegible]۔ یہ دیہاتی مجھے ان کے دین میں یہ بھی نہیں جانتے۔ [illegible] میں ان کی عبادت سے [illegible] جیسے یہ کسی میرے ساتھ آسمان ہی سے اترے اور میرے وجود کا حصہ ہی ہیں۔

پس میں ان لوگوں کو چاہتا ہوں جس نے [illegible] ہر [illegible] سے [illegible] میں سے ایک وارڈ مجھے [illegible] [illegible]

[illegible]

دیتے۔ میں نے مدت سے کوئی بھیک نہیں لی۔ یہ بات [illegible] جب بھی بارش ہو جاتی تو [illegible] میں پڑا رہتا۔ کبھی فاقہ ہونے کے باعث یہاں [illegible] ہو جاتا اور میرے لیے پانی میں [illegible] دشوار ہوتا۔

ان چیزوں سے [illegible] کے علاوہ میں "[illegible]" بھی [illegible] مگر کبھی میرا منہ نہیں کھلا۔ یہ بھی ایک طرح کا [illegible] ہے۔ [illegible] "[illegible]" بھی [illegible] بھی کرلیتا۔

[illegible]

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور [illegible] [illegible]

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

اُسے بُرا کہتا رہا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رقم واقعی معقول تھی' میری تو سمجھیے چاندی ہو گئی۔ پورا ہفتہ میں بھیک مانگنے نہیں گیا بلکہ اس رقم سے خوب عیاشی کی اور نمبر بھی کھیلے' مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب میرے پاس صرف پندرہ سو روپے باقی رہ گئے' تو مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اگر بازار جا کر اسی تھڑے پر بیٹھا' تو ان صاحب سے ٹاکرا لازمی تھا۔ پھر کیا جواب دوں گا؟

اسی اُدھیڑ بن میں ایک دن اور گزر گیا۔ بجائے میرے انجان مہربان کی آنکھوں میں یہ بات تھی کہ میں اس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتا۔ برسوں سے بغیر مشقت مفت کی کھا رہا تھا' چار پانچ ہزار روپے کی خاطر یہ "دھندا" چھوڑنا بہت مشکل لگا۔ یہ خیال بھی آیا کہ وہ میرا کیا بگاڑ لے گا' اگر میں نے کاروبار نہ کیا تو؟ اسی رات میں نے بڑا ہی ڈراؤنا اور عجیب و غریب خواب دیکھا۔ جیسے میرے چہرے سے گوشت نوچ لیا گیا تھا۔ میں جدھر رخ کرتا' لوگ ڈر کے مارے چیخیں مارتے بھاگ جاتے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بے ساختہ میرے ہاتھ اپنے چہرے پر گئے۔ شکر خدا کا کہ وہ ٹھیک تھا۔

میں حسب معمول گھر سے "دھندے" کے لیے نکلا۔ حیرت انگیز طور پر میرے قدم اس منڈی کی طرف اٹھ گئے جہاں سے دکاندار تھوک میں سودا سلف خریدتے تھے۔ جیب میں پندرہ سو روپے تھے اور انہی پیسوں سے میں نے بھی ٹکٹ' کنگھیاں' بال پوائنٹ اور بعض خریدے اور اسی تھڑے پر آ بیٹھا جہاں بھی لوگ مجھے صدقہ' زکوٰۃ اور خیرات دیا کرتے تھے۔ اس روز جس نے مجھے جتنی رقم دی' میں نے اسی حساب سے اُسے سودا دے دیا۔ جس نے سودا لینے سے انکار کیا' اس کی رقم لوٹا دی۔ لعین شیطان مجھے ورغلاتا کہ رکھ لو وہ تمھیں خوشی سے دے رہا ہے' مگر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بھیک ہرگز نہیں لوں گا' خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں اعوذباللہ کا ورد شروع کر دیتا جس سے تقویت پاتا اور شیطانی وسوسے دور ہو جاتے۔ خیر آہستہ آہستہ میرا کاروبار چل نکلا' لیکن آمدن معقول نہیں تھی۔ اس پر میں فکرمند رہنے لگا۔

بہرحال محنت کی کمائی کھانے پر میرا ضمیر مطمئن رہنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں' یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے اس محسن کی مہربانی تھی جس نے مجھے کاروبار کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ مالی تعاون بھی کیا۔ ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا' تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ عیاں اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور آمدن کے بارے میں بھی جاننا چاہا۔ میں نے بتایا کہ لوگ اب بھی مجھے بھیک دینے کی کوشش کرتے ہیں' تو میرے محسن نے مجھے ایک تختہ دیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

"بھیک نہیں' مجھ سے سودا لیجیے۔"

میں نے وہ تختہ اپنی پشت پر سجا دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ راہ چلتے لوگ بھی رک کر اسے پڑھتے اور کچھ نہ کچھ خرید لیتے۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے میرے کاروبار میں ایسی برکت ڈالی کہ میں نے تین پہیوں والی سائیکل خرید لی جس کے پیچھے میری چھوٹی سی موبائل دکان ہے۔ میں اپنے علاقے کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی پھیری لگاتا ہوں۔ اب میں نے کاپیاں' پنسلیں اور دیگر اسٹیشنری کا سامان بھی رکھ لیا ہے۔ پھر اسی مہربان کے مشورے پر بچوں کے لیے رنگ برنگ مختلف شکلوں کے غبارے بھی

www.pdfbooksfree.pk

بیچنے شروع کیے۔ چھوٹے چھوٹے ننھے منے بچے اپنے والدین کو بضد ہو کر غبارے خریدنے پر مجبور کرتے جو انھیں چار و ناچار مجھ سے لینے ہی پڑتے۔ مختصر یہ کہ باعزت طریقے سے میں پندرہ سولہ ہزار ماہانہ کما لیتا ہوں۔ دکاندار مجھے ادھار سودا دینے پر آمادہ ہیں' بلکہ زبردستی دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں' لیکن میں اس سے کتراتا اور تھوڑے ہی کو بہت سمجھتا ہوں۔

وہ لوگ جو کبھی مجھے معذور سمجھ کر میری مالی اعانت کیا کرتے تھے، اب بخوشی مجھ سے سودا لیتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ مجھ سے سودا لیا کریں جو میرے کاروبار اور میرے لیے تقویت کا باعث بنا۔ بعض مہربان تو اپنے بچوں کی کاپیاں' پنسلیں' روشنائی' ربڑ اور قلم تراش اکٹھے ہی منگوا لیتے جس سے میری آمدن تیزی سے بڑھنے لگی۔ کاروبار کی برکت سے نہ صرف میری تنگیاں دور ہوئیں بلکہ میرا رہن سہن اور حلیہ بھی درست ہو گیا۔ اسپتال برائے معذوراں سے ڈاکٹر صاحب کی وساطت سے میں اپنی مصنوعی ٹانگ بنوا رہا ہوں جنھوں نے میری ٹانگ کا ناپ لے کر کمپنی کو آرڈر دے دیا ہے۔ اس پر دو ہزار روپے خرچ آئے گا۔

محلے میں لوگ میری عزت کرتے اور دوسروں کو میری ہمت اور مستقل مزاجی کی مثال دیتے ہیں۔ اب میں کوارٹر کا دو ہزار روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتا ہوں اور اسے سامان آرائش سے بھی سجا لیا۔ بجلی کا میٹر لگ چکا اور سوئی گیس پڑوس سے لے رکھی ہے جس کا آدھا بل میں ادا کرتا ہوں۔ آج کل میری ایک غریب اپاہج دوشیزہ سے رشتے کی بات چیت چل رہی ہے۔

میں اپنی معذوری سے صرف اس وقت دلبرداشتہ ہوتا جب مجھے بیت الخلا جانے کی حاجت ہوتی' یہ نہایت جانگسل اور اذیت ناک مرحلہ ہوتا۔ کئی بار طہارت کے دوران میرے کپڑے بھی خراب ہو جاتے اور میں لڑھک کر گر پڑتا تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے۔ تب دو ٹانگوں والوں پر مجھے رشک آتا اور اللہ کے حضور گڑگڑانے لگتا۔ پھر اس رحیم و کریم ذات نے اپنے غیبی خزانے سے مجھے دولت سے نوازا۔ کاشی ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے میں نے غسل خانے میں کموڈ لگوایا جس کے ساتھ نصب مسلم شاور نے مجھے اس اذیت سے نجات دلا دی۔

ایک دن سر راہ اپنے محسن سے ملاقات ہو گئی۔ انھیں اپنا حال احوال بتایا اور یہ بھی کہ عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ اتفاق سے اس روز میری جیب میں پانچ ہزار روپے موجود تھے وہی رقم جو مجھے بطور قرض حسنہ ملی تھی۔ میں نے اپنے محسن کو روپے لوٹانے چاہے تو انھوں نے کہا "اسے میری طرف سے اپنی شادی کی سلامی سمجھو۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے چل دیے۔

◆◆◆

سنہرے پھول

۱۔ صرف مال کمانے میں نہ لگے رہیے یوں آپ عزیز و اقارب کو گنوا بیٹھیں گے۔

۲۔ سب لوگوں کو ایک جیسا مت سمجھیے۔ ان کی طبیعتیں کتنی رنگا رنگ اور مختلف ہیں، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ لوگوں سے ایسی باتیں کیجیے جن میں وہ دلچسپی لیں نہ کہ ایسی باتیں جن سے آپ کو دلچسپی ہے۔

۴۔ جس شخص سے آپ کا میل جول ہے اس کا مزاج سمجھنا آپ کی مشکلات میں کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۵۔ شہد کی مکھی کا طرز عمل اپنایے جو میٹھے پر بیٹھتی اور کڑوے سے کتراتی ہے۔ گھریلو مکھی کی طرح نہ بنیے جو ہمیشہ زخموں کی تلاش میں رہتی ہے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، دوار برٹن)

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

ہماری مذہبی و قومی اقدار پر

شیطان کا وار

بے حیائی کا امنڈتا طوفان ہمارے مقدس رشتوں کو بھی پامال کرنے لگا

رقیہ عائشہ

چھوٹی چھوٹے انتہائی احتیاط سے کمرے میں شیشی نرم و ملائم بچی نرس سے لے کر وہ میں آیا اور بے ساختہ "ماشاء اللہ" کہہ کر مبہوت سی ہو گئیں۔ بچی یوں تھی جیسے گلاب کی پنکھڑی، نازک سی کانچ کی گڑیا۔ آنکھیں میچے بڑی نیند میں تھی جیسے سخت مشکل کے بعد منزل پر پہنچنے والا مسافر۔

اسپتال کے کمرے میں موجود چچی، دادی اور خالہ سب کی نگاہوں کا مرکز یہ بچی شعیب اور ان کی بیگم علمی نے بے قدرت کا عطا کردہ تحفہ تھا۔ دو بیٹوں کے بعد نکاح میں بیٹی کی آس میں آسمان کی طرف اٹھتی تھیں۔ مانگنے والے نے رحمت طلب کی تھی، سو خواہش پوری کر پوری کی گئی اور نہایت حسین بچی سے نوازا گیا۔ تب سب مبارک باد لیتے گئے اور بچی کی ماں آنکھیں موندے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔

بچی چھوٹے اپنی گود میں لیتے ہوئے رضوانہ نے کہا "اسے تو میں اپنی بہو بناؤں گی۔"

شعیب کو ہنسی آگئی، بولے "واہ بھائی، ابھی اس نے ہاتھ کا ... بھی نہیں دیکھا اور آپ نے سسرال طے کر دی۔"

خالہ نے فوراً چٹکی لی "میاں اب وہ وقت گیا جب بڑے بچوں کے سارے حقوق اپنی مٹھی میں بند کر لیتے تھے۔ اس دور میں ایسی باتیں سوچتی بھی نہیں چاہئیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

قبل اس کے کہ بچی کی سسرال کا حتمی فیصلہ ہوتا اور بچہ پرانے قصے چھیڑے جاتے، دادی جان نے نیا موضوع اٹھا دیا۔ "میں تو اس کا نام مہ وش رکھوں گی۔ چاند کا ٹکڑا ہے میری پوتی۔"

یوں ہنستے ہوئے وقت گزر گیا۔ بچی بہت ہی پیاری تھی۔ جو دیکھتا بے اختیار پیار کرنے لگتا۔ دادی صبح شام دعائیں اور آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتیں، مبادا اپنے پرائے کی نظر لگ جائے یا کوئی ان دیکھی شے سایہ ڈال دے۔ ننھیال اور ددھیال میں پھول کی طرح پرورش پانے والی بچی اب ہمیشہ بچی ہی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ وقت تو بچپن سے چھوٹنے والی گھڑی کی سوئی کو بتدریج مضبوط و توانا کرتا چلا جاتا ہے۔ ننھے پودوں اور بچوں کو بھی!

سو بچپن پیچھے چھوڑتے ہوئے مہ وش بھی عمر کے اس دور میں آ پہنچی جب بے وجہ ہنسی آتی ہے۔ جب خاموشی میں بھی آوازیں آتی ہیں اور آوازیں بھی جل ترنگ سے بجتے ہیں۔ ہر گزرتا دن اسے سب کی چہیتی بناتا چلا جا رہا تھا۔

***

شعیب خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ایک مستحکم کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ایک خوش باش رہتے۔ خاندان اور دوستوں سے بنا کر رکھتے۔ ان کے کئی دوست تھے مگر زبیر کی تو بات ہی جدا تھی۔ دونوں کے والدین ایک ہی محلے کے رہائشی تھے۔ سو بچپن سے ساتھ پلے بڑھے۔ ہم عمر، ہم مزاج، ہم مکتب۔ یکساں مضامین لے کر تعلیمی مدارج طے کرنے والے۔

بھائیوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، لیکن ان دوستوں کا معاملہ ہی نرالا تھا۔ ہر معاملے پر دونوں کی رائے بالآخر کسی بڑی بحث و تمحیص میں پڑے بغیر یکساں

> ہماری معاشرتی قدریں بھیانک طوفان کی زد میں ہیں۔ ایسے سانحات جنم لے رہے ہیں کہ قلم تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ عشروں سے ہمارے گھروں کی دہلیز پر ایک نادیدہ رکاوٹ ہماری گھریلو معاشرت کی محافظ تھی۔ جب رکاوٹ ہٹا کر گھر کو گزرگاہ بنا دیا گیا، تو شیطانی تہذیب اپنے پورے ہتھیاروں کے ساتھ اس میں وارد ہوئی۔
>
> اب حال یہ ہے کہ اونٹ تو خیمے کے اندر ہے اور بدو صحرا کی یخ بستہ رات اور جھلسا دینے والے دن کا سامنا کرتے خیمے کے آرام کو ترس رہا ہے۔ کوشش کی ہے کہ اس سکون بخش پاکیزہ روایات سے محرومی کا غم قارئین کا اپنا غم بن جائے۔
>
> (توقیر عائشہ)

ہوتی۔ ہاں! ایک وقت دوری کا خطرہ در آیا جب دونوں کو الگ الگ اداروں میں ملازمت ملی۔ شعیب کی کمپنی مضبوط تھی اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی زیادہ۔ مناسب جگہ خالی ہوتے ہی اس نے زبیر کو بلا لیا اور یوں روزگار میں بھی یکسانیت حاصل کر لی۔

سال آگے پیچھے کے فرق سے دونوں کی شادیاں بھی انجام پا گئیں۔ دونوں کی بیگمات یوں آپس میں گھل مل گئیں جیسے گھر میں رہنے والی دیورانیاں جٹھانیاں۔ ان کی اس صحبت دوستی سے بعض رشتہ دار حسد بھی کرتے اور موقع آنے پر اس کا اظہار بھی کر دیتے۔ خاص طور پر جب تقریبات میں خاندان اکٹھے ہوتے، کوئی نوک جھونک ہو ہی جاتی مگر انھیں اس کی پروا نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں صاحب اولاد بھی ہو گئے۔ زبیر کا ایک بیٹا احمر اور بیٹی ماہم تھے۔ جبکہ شعیب کے دو

www.pdfbooksfree.pk

بیٹے، سلمان اور نعمان تولد ہوئے۔ اب مہ وش کے آنے سے خاندان مکمل ہوگیا۔

ابھی بچے چھوٹے ہی تھے کہ انھیں ایک نوتعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائش حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ایک ہی گلی میں آمنے سامنے کے دو گھر مناسب ادائیگی کی شرائط پر مل گئے۔ یوں ذاتی رہائش کا حصول بھی آسان ہوگیا۔

بچے جس ماحول میں پلے بڑھے تھے، ایک دوسرے کے والد کو اپنا چچا ہی سمجھتے۔ یہ زبیر انکل تھے تو وہ شعیب انکل۔ دونوں گھرانوں میں بے تکلفی تھی۔ دن بھر آنا جانا لگا رہتا۔ بچے ایک دوسرے کے گھریلو کام مثلاً لڑکیوں کو ٹیوشن سنٹر، سہیلیوں کے ہاں ملانے، ماؤں کو اپنے میل ملاپ اور مارکیٹ کے کاموں سے لانا لے جانا وغیرہ انجام دیتے رہتے۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

جہاں بڑوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو وہاں نوجوانوں میں آپس کی بے تکلفی معنی خیز ہو جاتی ہے۔ یہ بات بڑوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ لہٰذا زبیر کے بیٹے امر کے لیے مہ وش کا رشتہ طے پا گیا۔ امر کو سعودی عرب میں اچھی ملازمت مل چکی تھی۔ مہ وش کی تعلیم کے اختتام پر شادی ہونا قرار پایا۔ دونوں گھرانے پرسکون اور زندگی کے سارے رنگوں سے لطف اٹھا رہے تھے۔

٭٭٭

شعیب دفتر کے کمرے میں ایک فائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ دو دن پہلے وہ چند فائلیں مطالعے کی غرض سے گھر لے گئے تھے۔ گھر فون کر کے معلوم کیا تو پتا چلا کہ فائل گھر پر ہی ہے۔ زبیر کو دوپہر کے طعام کے بعد آنا تھا۔ اس وقت تک فائل دفتر میں موجود ہونی چاہیے تھی۔ ایسے میں زبیر کمرے میں داخل ہوئے۔

آج وہ گھر پر کھانا کھانے کے موڈ میں تھے۔ شعیب نے موقع غنیمت جانا اور فائل لانے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ زبیر نے گاڑی لی اور گھر کی طرف چل پڑے۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ گھر کی گاڑی مصروف ہونے کے باعث مہ وش کو رکشے سے واپس آنا پڑا۔ آج اس کا سمسٹر تھا، فارغ ہوتے ہی گھر آ گئی۔ گھریلو ملازم فضل دین مرکزی دروازے پر کسی کام سے کھڑا تھا۔ مہ وش نے شکر ادا کیا کہ اطلاعی گھنٹی بجا کر دروازہ کھلنے کے انتظار سے بچ گئی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ اے سی بھی چل رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے بیگ ایک طرف ڈالا اور صوفے پر آڑی ترچھی پڑ گئی۔ کمرے کی خوشگوار ٹھنڈک نے نیند طاری کر دی اور وہ بالکل ہی بے خبر سو گئی۔

٭٭٭

زبیر ذیلی سڑکیں عبور کر کے جب مرکزی شاہراہ پر پہنچے، تو ٹریفک بری طرح جام ہو چکا تھا۔ وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ انھوں نے پلیئر آن کر دیا اور ان کی انگلیاں موسیقی کا ساتھ دینے لگیں۔ پورا رستہ اشتہارات سے سجا ہوا تھا۔ بڑے بڑے ہورڈنگز پر خوبصورت ماڈل لڑکیاں کہیں لباس، کہیں شیمپو، ڈراموں اور دیگر مصنوعات کی تشہیر کر رہی تھیں۔ پورے رستے دائیں ہاتھ شہر کا ایک مشہور تھیٹر واقع تھا۔ اس میں کئی فلموں کے نیم برہنہ اداکاروں والے اشتہار دور ہی سے دعوت نظارہ دیتے۔ زبیر نے آس پاس دیکھا۔ سب اپنی اپنی گاڑیاں بند کیے ان ماڈلوں کے حسن سے اپنا وقت دور کر رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد راستہ کھلا۔ اگلے دس منٹ میں وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے سوچا، پہلے شعیب کے گھر سے فائل اٹھا لیں۔ فضل دین نے دروازہ کھولا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہہ کر بیگم صاحبہ کو بتانے چلا گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ مرکزی میز پر فائل بھی نظر آ گئی۔ فائل اٹھاتے ہوئے سامنے نظر پڑی...... حسن خوابیدہ حالت میں سامنے تھا۔ ان کی نظریں سراپا حسن پر جیسے جم سی گئیں۔ وہ دل پھینک اور گھٹیا قسم کے انسان نہ تھے۔ مگر فرشتہ بھی نہیں اور ابھی تو وہ چور رستے پر حسن کی ترنگ میں دیکھتے آ رہے تھے۔ شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیا۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔ اپنی نظروں میں آپ گر گئے۔ شرمندگی کے مارے پسینا پھوٹ نکلا۔ تیزی سے فائل اٹھائی اور اپنے گھر چلے گئے۔

ادھر سلمیٰ ان کے لیے شربت لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں، تو وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ بیٹی صوفے پر آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ "ابھی تو زبیر بھائی فائل لینے آئے تھے، کہاں چلے گئے؟ اور یہ مدہوش سب رہی، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" خود کلامی کرتے ہوئے [illegible] پوچھا لیکن اس کے [illegible] میں کچھ نہ تھا۔ [illegible] سوائے زبیر کے [illegible] فضل دین نے فائل دے دی ہے۔ مطمئن ہو کر [illegible] چلی گئیں۔

شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیا۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔

ادھر زبیر کی بیگم رضوانہ میز پر کھانا چن رہی تھیں۔ زبیر کو پسینے میں شرابور گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھنے لگیں "کیا گاڑی کا اے سی ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا؟ آپ تو پسینے میں بھیگ رہے ہیں۔"

وہ بات نظر انداز کرتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تو بڑے سکون سے گھر طعام کرنے آئے تھے، مگر اب کھانے سے رغبت اور بھوک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی بے دلی رضوانہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ "کیا ہوا؟ کس خیال میں گم ہیں؟"

اس کے پوچھنے پر وہ دکھ سے مسکرا دیے۔ اپنے احساسات بتا کر اپنی ذلت کا سامان خود تو نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے تیسے کھانا کھایا۔ واپس جانے میں کچھ وقت تھا۔ رضوانہ چائے بنانے گئیں، تو وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹ گئے۔ مگر کسی ڈرامے کے ری پلے کی طرح وہ منظر بار بار آنکھوں کے آگے ناچتا رہا۔

انھیں لگا، در و دیوار ان پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ [illegible] آنکھوں کے سامنے بڑی ہوئی ہے۔ [illegible] شعیب [illegible] بات کی تھی۔ اب [illegible] ڈال آئے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو! احساس جرم کی شدت سے ان کے [illegible] نہیں اٹھتی تھیں۔ چائے آنے سے [illegible] سے چائے پی اور دوبارہ دفتر کی راہ لی۔

مدہوش اور ان کی بیٹی [illegible] کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا لگا رہتا۔ کبھی [illegible] ہیں، تو کبھی [illegible] زبیر کی کوشش ہوتی [illegible] مدہوش کے سامنے نہ [illegible] ہی سامنا ہوتا، اپنے مجرم ہونے کا احساس

www.pdfbooksfree.pk

پھر سر اٹھا کے تکتے۔ ابتدا اس کی معصوم صورت اور وقار اپنے خیال کی تردید کی۔ وہ ادھر دیکھا کرتے، پہلے کی طرح بیمار بیمار ناراض ہونے کی کوشش کرتے مگر انھیں اپنی آواز اجنبی اور بے جان سا محسوس ہوتا۔

انھی دنوں مہوش کی خالہ زاد بہن کی شادی ہوئی۔ نادیہ کی رضوانہ سے بہت دوستی تھی۔ وہ اسے دعوت نامہ دینے چلی آئیں۔ مہندی، مایوں سب ہی تقریبات کی دعوت دے ڈالی۔ رضوانہ نے زبیر سے ذکر کیا تو وہ الجھ سے گئے، بولے "ساری تقریبات میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس بارات والے دن چلی جانا اور میرا جانا کوئی ضروری تو نہیں۔"

رضوانہ نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں؟ آپ نہیں چلیں گے؟ شعیب بھائی تو بہت برا منائیں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر زبیر نے بات ختم کر دی۔ شعیب کے دونوں بیٹے احسن اور نعمان خالہ کے گھر کی تقریبات کے انتظامات میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ مہوش کے والدین بھی منتظمین میں شامل تھے۔ بارات والے دن وہ جلد چلے گئے۔ لہٰذا زبیر کا بھی شادی میں سب کے ساتھ جانا ضروری ٹھہرا۔ مہوش اور ماہم پہلے ہی میک اپ کے لیے پارلر گئی ہوئی تھیں۔ رضوانہ اور زبیر ان کا انتظار کرنے لگے۔

اتنے میں دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ رضوانہ نے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے "ماشاء اللہ" کہا۔ ان کی بیٹی ماہم بہت پیاری لگ رہی تھی مگر مہوش گہرے کام والے سفید پشواز نما لمبی فراک میں یوں معلوم ہوتی جیسے کوئی باوقار شہزادی عوام کو اپنی جھلک دکھانے محراب میں جلوہ افروز ہو رہی ہے۔ زبیر خوفزدہ سے ہو گئے اور اس پر اچٹتی سی نظر ڈال بیٹی کو دیکھنے لگے۔ ایک عجیب سا خیال ان کے ذہن میں کوندا۔ جب میری نظر بھٹک سکتی ہے تو کئی دوسرے بھی ایسے گندے خیال کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ تقریب میں جانے کون کیسی نظر ڈالے گا۔ ان کی اذیت یہ خیال آتے ہی دو چند ہوئی۔ اچانک رضوانہ سے کہنے لگے "ہم سب یہ پروگرام کینسل کر دیں تو کتنا اچھا ہو۔"

رضوانہ یہ سن کر پریشان ہو گئیں، بولیں "ارے بچے پارلر سے تیار ہو کر آئی ہیں۔ دوسرے ہمارے نہ جانے کو تو شکایت پیدا ہو جائے گی۔ ہم کسی بڑی تقریب میں تو نہیں جا رہے۔"

زبیر چپ ہو گئے۔ معاشرتی روایت اتنی تیزی سے تبدیل ہو چکی تھیں کہ ان کا یہ معصومانہ مطالبہ پورا نہیں ہو سکتا۔ بس دونوں کو موبائل کی تصویروں میں قید کرتے دیکھتے رہ گئے۔

دوران تقریب انھیں ایسا لگا کہ سوائے ان کے ہر شخص مسرور ہے۔ تقریب ختم ہوئی۔ رات کے ایک بجے واپسی ہوئی۔ دوسرے دن سب ہی دیر سے اپنے معمولات انجام دینے اٹھے۔ جمعہ لیٹ ہوئے مگر ان کی نیند آج سب معمول روٹھی ہوئی تھی۔

خاموشی سے لیٹے تو گئے مگر دماغ جاگ رہا تھا۔ انھیں اپنا ابتدائی زمانہ یاد آیا۔ تب وہ اور شعیب گھر کے باہر، باغات کے پیچھے یا کسی تخت پر بیٹھ کر گھنٹوں سے بھی زیادہ وقت گزار دیتے۔ معاشرتی روایت یہ تھیں کہ جس گھر میں بہنیں ہوں، وہاں بھائیوں کے دوست گھروں کے اندر نہیں آتے۔ عزیز و اقارب میں بھی گھر کی بہو بیٹیوں کے لیے حجاب اور احترام ہوتا۔ بے تکلفی کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرنے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

چچا جان بھی گھر میں آتے تو کھنکار کر داخل ہوتے۔ ان کی امی جب اپنے دوپٹے نماز کی طرح چُن لیا کرتیں۔ تب کتنا سکون تھا، بچے لوگ کی فتنوں سے بچے ہوئے تھے۔ اب تو جس کا جی چاہے گھر میں داخل ہو جائے۔ باپ اور بھائیوں کے دوست اور دور پار کے رشتے دار سب ہی "انکل" ہیں... وہ خود بھی تو انکل ہی ہیں۔ انھیں لگا کہ کوئی در و دیوار میں سے سرگوشی کی آواز آ رہی ہے۔ "زبیر انکل... زبیر انکل!" انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ جانے کب پھر انھیں نیند آ گئی۔

انسان جسمانی طور پر بیمار یا معذور ہو تو تیمار دار میسر آ جاتے ہیں۔ مگر وہ ایسی کیفیت میں گرفتار تھے کہ دل و دماغ نادیدہ بوجھ تلے دبے رہتے تھے اور وہ کسی سے مدد بھی نہیں لے پاتے۔ ایسی حالت میں جسمانی صحت کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔ صوفیہ کا قول ہے کہ روح پہلے بیمار ہوتی ہے اور جسم بعد میں۔ ان پر یہ بات بالکل صادق آ رہی تھی۔

نیند کی کمی، جلد تھک جانا، معمولی باتوں پر شدید جھنجھلاہٹ، تنہائی پسند رہنا اور زیادہ تر خاموش رہنا یہ علامات گھر والوں سے چھپی نہ رہیں۔ ادھر دفتر میں کارکردگی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ان کی بیگم رضوان اور شعیب یہ صورت حال محسوس کر رہے تھے۔ باہم مشورے سے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

ڈاکٹر نے علامات دیکھ کر بتایا کہ انھیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ گو بظاہر کوئی بات اس کی تصدیق کرتی نظر نہ آتی۔ خاندان اور معاشرے میں انھیں بلند مقام حاصل تھا۔ مالی آسودگی تھی، بچوں کی طرف سے بھی کوئی فکر کا پہلو نہ تھا۔ بس دل آرام کا مشورہ مانگ رہا تھا۔ ذہن و دماغ کہتا تھا کہ سخت مصروف رہا جائے تاکہ آسیب کی طرح چمٹنے والے خیال سے پیچھا چھوٹ سکے۔ مگر شاید ان کی صحت جواب دے رہی تھی۔

ان کی گرتی صحت کے پیش نظر طے کیا گیا کہ مہ وش اور احمر کی شادی کا فرض جلد ادا کر دیا جائے۔ ممکن ہے گھر میں ماحول کی تبدیلی، رونق اور چہل پہل سے طبیعت بہتر ہو جائے۔ لیکن سب کا تجویز کردہ یہ نسخہ ان کے لیے تریاق کے بجائے زہر ثابت ہوا۔

ان کا تو یہ دل چاہ رہا تھا کہ مہ وش کے دلہن بن کر گھر آنے سے پہلے ہی وہ کہیں بھاگ جائیں۔ دونوں خاندان مختصر تقریبات کے ساتھ شادی پر متفق تھے تاکہ یہ فرض جلد ادا ہو جائے۔ مگر آنے والا ہر دن زبیر کی دہشت اور اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔

جس دن احمر سعودی عرب سے آیا، وہ اسے دیر تک سینے سے لگا کر روتے رہے۔ وہ کہتا رہا "ابو! آپ کیا کر رہے ہیں! تین سال میں کتنی بار آیا ہوں، ایسے تو آپ نے کبھی نہیں کیا۔ ہمت کریں ابو۔ کیا ہو گیا ہے ابو آپ کو!"

بیوی، بچے اور شعیب سب قریب ہی موجود تھے۔ زبیر دل پر پڑنے والا بوجھ اٹھائے تھک چکے تھے۔ اچانک انھیں محسوس ہوا کہ دل میں لگی آگ اب سرد ہو رہی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اس آگ کو بجھاتے بجھاتے جسم کی ساری قوتیں صرف ہو گئیں۔

احمر نے ہاتھوں کی جنبش ڈھیلی پڑتے دیکھ کر باپ کو بستر پر لٹا دیا۔ ان کی گردن عجیب انداز میں تکیے پر ڈھلک گئی۔ سب ہی ان پر بے ساختہ جھک گئے۔ فون اور ایمبولنس کی تلاش کرنے کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی... مگر انھیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

جاسوسی ادب

وہ باتوں باتوں میں بن گیا

دنیا کا سب سے بڑا احمق

ایک چالاک آدمی کا ڈرامائی قصہ، اس نے مارنے آنے والے کو شہ مات دے دی

جیک رچی

وہ دیکھنے میں ایک شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے ہلکے فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ جب میں نے چہرہ دیکھا، تو میری نظر خود بخود اس کے ہاتھ کی طرف گئی۔ مجھے یقین تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس ہوگا۔ یہ مرد شریف اسے کھول کر کوئی چیز فروخت کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن میری توقع کے خلاف اس کے ہاتھ میں بریف کیس کے بجائے بڑے دہانے کا ایک ریوالور چمک رہا تھا۔ پکڑنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ یہ "شریف آدمی" ایسے ہتھیار استعمال کرنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

اس نے بڑی شائستگی و اہتمام سے یہاں آنے کا مقصد بیان کیا، لیکن میں پرسکون رہا۔ خود مجھے بھی اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ "تو گویا تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟ ٹھیک ہے مگر یہ تو بتا دو کہ مجھے ہلاک کرنے پر تمھیں کس نے مامور کیا؟ مرنے سے پہلے مجھے کم از کم یہ جاننے کا حق تو ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو صرف ذاتی دشمنی کی بنا پر ہلاک کرنا چاہوں؟" اس نے بھی بڑے سکون سے کہا۔ "مجھے کسی بھی شخص کو اپنا دشمن تصور کرنے کا پیدائشی حق حاصل

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

جب وہ آیا، میں لائبریری میں بیٹھا اپنے لیے ایک گلاس میں مشروب انڈیل رہا تھا۔ آہٹ ہوئی، تو پلٹ کر اسے دیکھا۔ میں نے تحمل سے کہا "میں اپنے دوستوں اور دشمنوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم میرے لیے قطعاً اجنبی ہو۔ کیا تمھاری خدمات میری بیوی نے حاصل کی ہیں؟"

وہ مسکرایا۔ "درست ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی کے پاس آپ کو مروانے کے لیے معقول وجہ موجود ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں دولت مند آدمی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میری ساری دولت پر قابض ہونا چاہتی ہے۔"

وہ چند لمحوں تک مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"ترپن سال۔"

"اور بیوی کی عمر؟"

"بائیس سال۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں، تو آپ کو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "اگر آپ اس سے وفاشعاری کی امید رکھتے ہیں، تو معاف کیجیے گا، آپ دنیا کے سب سے بڑے احمق ہیں۔"

میں نے مشروب کی چسکی لی اور کہا "مجھے اس سے وفاشعاری کی توقع تو نہیں تھی البتہ شادی کرتے وقت یہ توقع ضرور تھی کہ وہ سال دو سال بعد طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ اور مجھے طلاق کے ساتھ اپنی کچھ جائداد بھی اسے دینی پڑے گی۔ اس کا حسن دیکھتے ہوئے مجھے یہ سودا مہنگا نظر نہیں آیا۔ لیکن اب نوبت جان کی بازی تک پہنچ گئی اور یہ قیمت ادا کرنا بڑا مہنگا سودا ہے۔"

"آپ کی بیوی خوب صورت ہونے کے علاوہ لالچی بھی ہیں مسٹر ولیم! مجھے حیرت ہے، آپ جیسا تجربہ کار آدمی اس کی یہ خوبی نہیں بھانپ سکا۔"

میں نے اس کا ریوالور دیکھا اور بولا "مجھے امید ہے تم پہلے جس معقول معاوضے پر دوسروں کے لیے یہ خدمت انجام دے چکے؟"

"جی ہاں۔" اس نے انکسار سے جواب دیا۔

"اور تمھیں اپنے اس عمل سے لطف بھی ملتا ہوگا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں آپ اسے بھیانک مسرت کا نام دے سکتے ہیں مسٹر ولیم! مجھے اعتراف ہے، دوسروں کو قتل کرتے وقت مجھے واقعی بڑی مسرت ملتی ہے۔"

میں چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر کہا "دیکھو تو

صاحبِ تحریر

امریکا کے ممتاز ادیب، جیک رچی امریکی شہر، ملواوکی میں ۲۶ فروری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام جان جارج رچی تھا۔ جاسوسی کہانیاں لکھ کر نام کمایا۔ ان کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ ایک ناول بھی لکھا "ٹائیگر آئی لینڈ" نامی یہ ناول ۱۹۸۷ء کو شائع ہوا۔ رچی کی کئی کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہو چکیں۔ جو ڈرامائی موڑوں کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ رچی ۷ اپریل ۱۹۸۳ء کو چل بسے۔

www.pdfbooksfree.pk

تمھیں یہاں آئے دو منٹ سے زیادہ عرصہ بیت چکا لیکن میں اب تک زندہ ہوں!"

"میں اپنا کام اطمینان سے انجام دینے کا عادی ہوں اور مجھے کوئی جلدی بھی نہیں۔ آج بس یہی ایک کام کرنا ہے۔"

"تو گویا تمھیں اپنے شکار کو تڑپتا ہوا دیکھ کر مسرت نہیں ہوتی بلکہ تم اسے دہشت زدہ کر کے لطف اندوز ہوتے ہو ٹھیک ہے نا؟"

"آپ بہت گہرے آدمی ہیں مسٹر ولیم!" اس نے مجھے تعریفی نگاہ سے دیکھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم لطف اندوز ہوتے رہے، میں زندہ رہوں گا؟"

"ہاں لیکن ایک حد تک۔ میں ساری رات تو یہاں بیٹھ نہیں سکتا اور پھر مجھے ایک بات کا خیال رکھنا ہے۔"

"ظاہر ہے، ظاہر ہے۔ مشروب کے ایک گلاس کے بارے میں کیا خیال ہے مسٹر...؟"

"آپ مجھے احمق کہہ سکتے ہیں۔ سادہ سا نام ہے۔ جھوٹے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کی دعوت شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں لیکن مہربانی فرما کر مشروب بوتل سے گلاس میں میرے سامنے انڈیلیں۔ میں شربت کے ساتھ بے ہوشی کی دوا یا زہر پینے کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم یہ تو سوچو، مجھے تمھاری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ میں ایسی صورت میں اپنی جیب میں زہر کی پڑیا تیار رکھنے سے تو رہا۔"

"درست ہے، اچھا نکتہ ہے لیکن میں خوامخواہ خطرہ مول لینے کا قائل نہیں۔"

میں نے میز پر رکھی بوتل سے مشروب ایک اور گلاس میں انڈیلا۔ وہ میرے ہاتھوں پر مسلسل نظریں جمائے رہا۔ میں نے اس کا گلاس میز کے کونے پر رکھ دیا۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ریوالور کی نال اب بھی میری طرف تھی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ میں نے پوچھا "اس وقت میری بیوی کہاں ہے؟ ظاہر ہے اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کا کوئی بہت عمدہ انتظام کیا ہوگا؟"

"وہ ایک تقریب میں شریک ہیں۔ اس لیے ایک درجن سے زیادہ گواہ قسمیں کھا کے یہ بیان دیں گے کہ وہ آپ کے قتل کے وقت ان کے سامنے موجود تھیں۔"

"ظاہر ہے، ظاہر ہے اور میرا قاتل ایک چور ہوگا جس نے میری غیر متوقع مداخلت سے گھبرا کے مجھے گولی ماردی؟ یہی کہانی بنے گی نا؟"

اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا اور کہا ہاں، کہانی تو واقعی گھسی پٹی ہے لیکن اثر اب بھی رکھتی ہے۔ کم از کم پولیس کو اس پر یقین آجاتا ہے۔ آپ کو گولی مارنے کے بعد میں یہ گلاس پانی سے اچھی طرح دھو کر دوبارہ الماری میں رکھ دوں گا۔ اور جب واپس گیا، تو دروازے کا ہینڈل بھی رومال سے صاف کر دوں گا کیونکہ اندر آتے وقت میں نے اسے پکڑا تھا۔ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ میں ہر کام نہایت سلیقے اور احتیاط سے کرتا ہوں۔"

"اور غالباً تم یہاں سے چند چیزیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے تاکہ چوری کی کہانی میں جان پڑ جائے؟"

"جی نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر ولیم! پولیس یہ سمجھے گی کہ چور مسٹر ولیم کو گولی مارتے ہی دہشت زدہ ہوا اور گھبراہٹ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے خالی ہاتھ فرار ہو گیا۔"

www.pdfbooksfree.pk

"وہ تصویر جو دیوار پر آویزاں ہے۔" میں نے نظروں سے اس کی پشت پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تیس ہزار ڈالر مالیت رکھتی ہے۔"

اس نے ایک ثانیے کے لیے مڑ کر تصویر دیکھی۔ پھر بولا "میں اپنے پاس ایسی کوئی چیز رکھنا نہیں چاہتا مسٹر ولیم جو میرا آپ سے تعلق ثابت کرے۔ میں فن کا قدردان ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس کی خاطر پھانسی کا خطرہ مول لے لوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ شاید یہ قیمتی تصویر اپنی زندگی کے عوض مجھے دینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی خیال تھا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر ولیم! جب میں کسی کے لیے معاوضے پر کوئی کام قبول کر لوں، تو مخالف مجھے کسی قیمت پر نہیں خرید سکتا۔ یہ میرا کاروباری اصول ہے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

میں نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور بولا "تمھیں غالباً یہ انتظار ہے کہ میں دہشت زدہ ہو کے تم سے گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگوں؟"

"ہاں، اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کا یہ سکون محض کچھ دیر کی بات ہے۔"

"پھر تم مجھے قتل کر دو گے؟"

"ظاہر ہے مسٹر ولیم! ویسے خوشی محسوس کرنے کے باوجود اسے ظاہر نہ کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔"

"شاید تم اپنے ہر شکار سے گڑگڑا کے رحم کی بھیک مانگنے کی توقع رکھتے ہو؟"

"ہاں اور مجھے اس میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ البتہ ہر شخص کا انداز مخصوص اور منفرد ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نے کبھی رحم کھا کر کسی کو زندہ چھوڑا؟"

"اب تک تو ایسا نہیں ہوا۔" وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرایا۔

"مرنے والوں نے تمھیں مال و زر کی پیشکش بھی کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں، اکثر و بیشتر۔"

"پھر بھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؟"

"جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔"

"ابھی میں نے تمھیں جو تصویر دکھائی، اس کے پیچھے ایک تجوری پوشیدہ ہے۔"

اس نے کچھ دیر کے لیے مڑ کر دوبارہ تصویر دیکھی اور کہا "اچھا پھر؟"

"اس تجوری میں اس وقت پانچ لاکھ ڈالر موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو خاصی بڑی رقم ہے مسٹر ولیم!" اس کی آنکھوں میں لالچ چمکا۔

میں نے میز سے اپنا گلاس اٹھایا۔ اس میں کچھ مشروب باقی تھا۔ پھر میں تصویر کے قریب گیا۔ تجوری کھولی۔ اندر سے ایک لمبا لفافہ نکالا اور بچے مشروب کا ایک گھونٹ لے کے خالی گلاس تجوری میں رکھ پھرتی سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ تجوری دروازہ بند ہونے پر خود بخود مقفل ہو جاتی تھی۔

اس کی نظریں لفافے پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ لفافہ ذرا یہاں لائیے مسٹر ولیم!" وہ بولا۔

میں نے لفافہ میز پر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا "نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھیں کسی قیمت پر بددیانتی کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا "اس کے باوجود آپ نے تجوری سے رقم کا لفافہ نکالا؟ کیوں آخر؟"

میں نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور اسے میز پر الٹ دیا۔ کچھ بوسیدہ کاغذات نکل کر میز پر بکھر گئے۔ "دیکھ لو، اس میں ایک بھی کرنسی نوٹ نہیں۔ یہ سب پرانے بل ہیں اور تمھارے لیے بیکار ہیں۔"

وہ کچھ جھنجھلا سا گیا۔ "پھر اس حرکت کا مقصد؟"

"مجھے اس بہانے تجوری کھول کر اس میں تمھارا گلاس رکھنا تھا۔ اس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات ثبت ہیں۔"

اس نے جلدی سے اپنے سامنے رکھے گلاس کی طرف دیکھا اور بولا "وہ آپ کا گلاس تھا، میرا تو یہ رکھا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ تمھارا گلاس تھا مسٹر! مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تجوری میں ایک خالی گلاس دیکھا تو ضرور سوچے گی کہ آخر یہ تجوری میں کیوں آیا؟ اور چونکہ یہ قتل کی واردات ہوگی، اس لیے وہ گلاس پر ضرور توجہ دے گی۔ اسے گلاس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات آسانی سے مل جائیں گے۔"

اس کی پتلیاں سکڑ گئیں، تلملا کر کہنے لگا "آپ بک رہے ہیں۔ میں نے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ آپ گلاس تبدیل کر ہی نہیں سکتے۔"

"کیا واقعی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے کم از کم دو بار سر موڑ کر اس تصویر کی طرف دیکھا جس کی قیمت میں نے تیس ہزار ڈالر بتائی تھی۔"

اس نے بے اختیار سر موڑ کر پھر تصویر دیکھی پھر کہا۔ "لیکن وہ ایک دو سیکنڈ سے زیادہ کا وقفہ نہیں تھا۔"

"میں وقت کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتا لیکن میرے لیے وہ وقفہ کافی تھا۔ میں نے تمھارا گلاس اپنے سامنے رکھا اور تمھارے سامنے اپنا گلاس رکھ دیا۔"

اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں، وہ ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "میں کہتا ہوں، یہ ناممکن ہے۔"

"ہوگا۔ مگر مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تمھیں گرفتار کیا، تو تمھیں بڑا تعجب ہوگا۔ پھر کچھ عرصے بعد تمھیں موت کی کرسی پر بیٹھ کے موت کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملے گا۔ مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ تمھیں اپنی موت کا ہفتوں یا شاید مہینوں انتظار کرنا پڑے۔ ہر نیا دن تمھیں یقینی موت سے قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ تم نے اب تک کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا؟ اپنے اس کھیل سے تم ہر بار کتنی دیر لطف اندوز ہو سکے؟ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے؟ لیکن تمھیں اپنی موت کا کئی ہفتے، ہزارہا گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا! مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس وقت تمھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ریوالور کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھارے آخری لمحات کیسے ہوں گے؟" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے اسمتھ، تمھیں بھی دوسروں کی طرح یہ غلط فہمی ہوگی کہ جب مرنے کا وقت آیا، تو بے حد پرسکون انداز میں اس کا

www.pdfbooksfree.pk

استقبال کرو گے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جب جیل کے محافظ تمھیں گھسیٹتے ہوئے۔''

''تجوری کھولو ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔'' اس کی آواز شدید غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں بہت زور سے ہنسا اور بولا ''واہ مسٹر، خوب لطیفہ سنایا۔ جب تک تجوری بند ہے تم میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہم دونوں کو معلوم ہے، اگر میں نے تجوری کھول دی، تو تم یقیناً مجھے گولی مار دو گے۔''

ماحول میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اس نے کہا ''آپ اس گلاس کا کیا کریں گے؟''

''اگر تم مجھے گزند پہنچائے بغیر یہاں سے چلے گئے جس کا اب مجھے پورا یقین ہے، تو میں یہ گلاس ایک سراغ رساں ادارے کے پاس لے جاؤں گا...... تاکہ گلاس سے تمھاری انگلیوں کے نشانات اتار کر محفوظ کر لیے جائیں۔ پھر میں تمھاری انگلیوں کے نشانات آج کی مکمل روداد کے ساتھ ایک لفافے میں بند کر ان کے حوالے کر دوں گا۔ انھیں ہدایت کروں گا کہ اگر میری موت غیر فطری طور پر واقع ہو، تو وہ لوگ میرا لفافہ اسی طرح پولیس کے حوالے کر دیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ ''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' آخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں آج سے جانے کے بعد دوبارہ کبھی تمھیں شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ''تمھاری اس یقین دہانی کے باوجود میں اپنے منصوبے ہی کو ترجیح دوں گا کیونکہ اس طرح مجھے مستقبل کا تحفظ بھی مل جائے گا۔''

وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا ''آپ

کام کی باتیں

☆ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔
☆ لوگوں سے ڈرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔
☆ اے مسلمانو! تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ایک عمدہ نمونہ ہے۔
☆ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔
☆ جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی، ہم ان کو اپنا راستہ بتائیں گے۔
☆ لوگو! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ اسے بطور رشوت حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔
☆ جو شخص جو بھی کوئی عمل کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔
☆ اے نبی ﷺ کہہ دو کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم کو دوست بنا لے گا۔
☆ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔
☆ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم کیا جائے گا۔

(محمد شہزاد، ملتان)

پولیس سے ابھی رابطہ کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اس کی بھی چند وجوہ ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنے ریوالور کی طرف دیکھا پھر اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا، بولا ''آپ کی بیوی قتل کے لیے کسی دوسرے کی خدمات بھی تو حاصل کر سکتی ہے!''

''ہاں تمھاری آج کی کارکردگی سے مایوس ہو کر وہ ضرور کوئی نیا آدمی تلاش کرے گی۔

www.pdfbooksfree.pk

"پھر سراغ رساں ادارہ آپ کا خانہ فوراً پولیس کے حوالے کر دے گا۔ پولیس آپ کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کرے گی اور عدالت بھی مجھے موت کی سزا سنا دے گی۔"

"ظاہر ہے، بشرطیکہ۔۔۔" میں نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

اسمتھ خاموشی سے جملہ مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا "تم اب بھی بچ سکتے ہو اسمتھ! بشرطیکہ میری بیوی کسی نئے آدمی کی خدمات حاصل کرنے کے قابل نہ رہے۔" میں مسکرایا "یہ میری بیوی نے تمھیں یہ بتایا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "جی ہاں۔ صرف یہ بتایا کہ وہ کسی مسز پیرسن کے گھر میں ہے۔ وہاں سے گیارہ بجے رات کو واپسی کے لیے آئیں گی۔ انھوں نے کہا تھا کہ مجھے اپنا کام گیارہ بجے سے پہلے پہلے انجام دینا ہوگا۔"

"گیارہ بجے؟ تب تو بہت تاریکی چھا جاتی ہے۔ ویسے بھی آج کی رات بہت تاریک ہے، کیا تمھیں مسز پیرسن کا مکان معلوم ہے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا "نہیں۔"

میں نے اسے مسز پیرسن کا پورا پتا تفصیل سے بتا دیا تاکہ وہ آسانی سے مکان تلاش کر لے، پھر کہا "ابھی گیارہ بجنے میں خاصا وقت ہے، تم اطمینان سے وہاں پہنچ سکتے ہو۔"

ہم دونوں آدھے منٹ تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ میں نے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ پھر بولا "گیارہ بجے آپ کہاں ہوں گے مسٹر ولیم؟"

"میں اپنے کلب میں پانچ دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا ہوں گا۔ وقت آنے پر وہ دوست پولیس کو حلفیہ بیان دیں گے کہ میں گیارہ بجے ان کے ساتھ تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے تم یہ کام گیارہ بجے ہی کرو گے؟"

"اس کا انحصار مناسب حالات اور موقع ملنے پر ہے۔" اس نے کہا۔

"تم نے مسز پیرسن کا مکان نہیں دیکھا۔ میں بتا دوں، وہاں تمھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

وہ مجھے گھورتا رہا پھر دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ کو کسی زمانے میں اپنی بیوی سے محبت تو ہوگی؟"

میں نے میز پر رکھا ہوا ایک قیمتی مجسمہ اٹھا کے کہا۔ "جب میں نے اسے خریدا، تو مجھے یہ بہت پسند تھا۔ میں اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ لیکن اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے گودام میں ڈال دوں اور اس کی جگہ نیا مجسمہ خرید لاؤں۔"

اسمتھ کے رخصت ہوتے ہی میں نے میز پر رکھا گلاس لیا اور سیدھا ایک سراغ رساں ادارے کے دفتر پہنچا۔ گلاس حوالے کرتے ہوئے میں نے انھیں اسمتھ کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور اپنے کلب چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر گھڑی دیکھی، پونے گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے اسمتھ کے سامنے تجوری میں جو گلاس رکھا، وہ وہیں موجود رہا کیونکہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت تھے۔

●●●

www.pdfbooksfree.pk

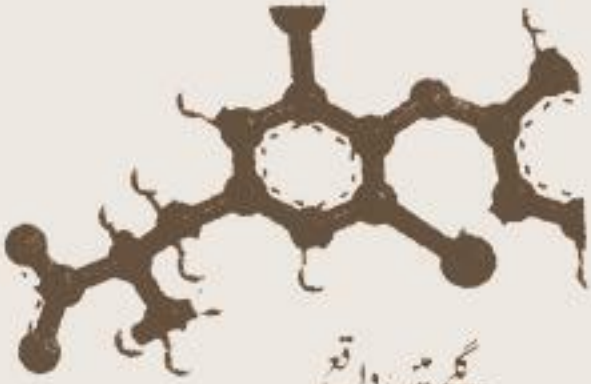

گلے میں واقع

انسانی جسم کا ایک اہم غدہ

اس غدے کی خرابی ہمیں تھکن، کمزوری اور سستی کا شکار بنا ڈالتی ہے

عالیہ فاطمہ

۴۰ سالہ عالیہ کچھ عرصے سے تھکن کا شکار تھی۔ جب بھی لیٹتی، تو سر درد ہونے لگتا۔ اس کی یادداشت بھی کمزور ہوگئی۔ باتوں پر توجہ دیتے ہوئے بھی دشواری محسوس کرنے لگی۔ جب یہ تکلیف دہ کیفیت کافور نہ ہوئی، تو ماہر ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر بیماری کی وجوہ سمجھ نہ پایا اور اسے کچھ ادویہ دے کر ٹال دیا۔

عالیہ کی ایک سہیلی تعلیم یافتہ تھی۔ وہ بھی کچھ عرصہ قبل غدہ درقیہ یا تھائرائڈ (Thyroid) کے ایک بیماری کا شکار ہوکر انہی علامات میں مبتلا رہ چکی تھی جن سے عالیہ دوچار تھی۔ سہیلی کے مشورے پر وہ ماہر امراض صماوی (Endocrinologist) کے پاس پہنچی۔

ماہر امراض صماوی نے عالیہ کو بتایا کہ وہ غدہ درقیہ سے خارج ہونے والے ہارمونوں کا ٹیسٹ کرائے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہارمونوں کا اخراج کم یا زیادہ تو نہیں ہو رہا۔

جب غدہ درقیہ کے ٹیسٹ ہوئے، تو انکشاف ہوا کہ عالیہ "ہائپوتھائرائڈزم (Hypothyroidism) میں مبتلا ہو چکی۔ غدہ درقیہ کی اس بیماری میں وہ بہت کم ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس خلل کے باعث انسان کئی طبی مسائل کا نشانہ بن جاتا ہے جن میں کمزوری، تھکن، قبض، نیند آنا، جلد خشک ہونا، چہرے کی سوجن، یادداشت کی کمی، وزن بڑھنا، آواز بیٹھنا اور عضلات میں اینٹھن شامل ہیں۔

مرض کی تشخیص کے بعد ماہر امراض صماوی عالیہ کا علاج کرنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مرض ابتدائی حالت میں تھا، اس لیے وہ جلد تندرست ہوگئی۔

www.pdfbooksfree.pk

خدانخواستہ وہ اپنی بیماری ٹالتی رہتی، تو موت کے منہ میں بھی جا سکتی تھی۔

٭٭٭

پاکستان میں کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جسم میں غدہ درقیہ اہم ترین غدود میں سے ایک ہے۔ تتلی کی شکل والا یہ غدہ ہمارے گلے میں واقع ہے۔ یہ تقریباً ۵ سینٹی میٹر لمبا ہے۔ ہمارے بدن میں اس غدے کی بنیادی ذمے داریاں یہ ہیں:

جسم کو غذائی توانائی جذب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ۲۔ پروٹین بنانے میں حصہ لیتا ہے ۳۔ اور یہ کنٹرول کرتا ہے کہ ہمارا جسم دیگر ہارمونوں کے ساتھ کس طرح توازن رکھے۔ ۴۔ جسمانی درجہ حرارت معتدل اور دل تندرست رکھنے میں بھی اس کا اہم کردار ہے۔

غدہ درقیہ ہارمون خارج کر کے درج بالا ذمے داریاں انجام دیتا ہے۔ ان میں سے دو ہارمون اہم ہیں: ٹرائیوڈوتھائرونین (Triiodothyronine) اور تھائروکسن (Thyroxine)۔ یہ دونوں ہارمون کئی جسمانی اعضا کی نشوونما اور دیگر نظاموں کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ ان دونوں کو مختصراً بالترتیب ٹی ۳ (T3) اور ٹی ۴ (T4) کہا جاتا ہے۔

غدہ درقیہ سے ہارمون کم خارج ہوں گے یا زیادہ، اس امر کو تھائرائڈ اسٹیمولیٹنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون ہمارے دماغ میں واقع غدہ نخامیہ (Pituitary Gland) سے خارج ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ درج بالا ہارمون کی پیداوار بھی تھائروٹروپین ریلیزنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون دماغ ہی میں واقع ایک اور عضو، وطاء یا ہائپوتھیلمس (Hypothalamus) چھوڑتا ہے۔

غیر صحت مند طرز زندگی اور دیگر مسائل کے باعث غدہ درقیہ چار امراض کا نشانہ بن سکتا ہے۔ ان میں ہائپرتھائروڈزم، تھائروڈیٹس، ہائپوتھائروڈزم اور سرطانی یا غیر سرطانی رسولیاں شامل ہیں۔ ان چاروں امراض کی وجہ سے غدہ درقیہ گلہڑ (Goiter) میں مبتلا ہوتا ہے۔

ہائپوتھائروڈزم کے بارے میں آپ اوپر پڑھ چکے، ہائپرتھائروڈزم کا شکار ہونے پر غدہ درقیہ معمول سے زیادہ ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس غیر معمولی کیفیت کی بنا پر جسم انسان میں یہ علامات جنم لیتی ہیں: گھبراہٹ، رنج و تردد، عضلات میں کمزوری، وزن میں کمی اور پیاس لگنا۔

تھائروڈیٹس میں غدہ درقیہ سوزش زدہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ سرطانی رسولی جنم لینے پر جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ گلہڑ جنم لے، تو غدہ درقیہ پھول جاتا اور تکلیف دیتا ہے۔ ان تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے۔

خرابی کی نمایاں علامات

اگر انسان کا وزن کم یا زیادہ ہو جائے، طبیعت میں تبدیلیاں آئیں، خون کا دباؤ کم یا زیادہ ہو، ڈپریشن چمٹ جائے اور نظر کمزور ہونے لگے، تو سمجھ جائیے کہ آپ کے غدہ درقیہ میں خرابی پیدا ہو چکی۔ اب ڈاکٹر مرض کی تشخیص کر کے دیکھے گا کہ کس قسم کا علاج کرنا ہے۔

ایک طبی رپورٹ کی رو سے پاکستان میں تقریباً دو کروڑ مرد و زن غدہ درقیہ کی کسی نہ کسی خرابی میں مبتلا ہیں۔ اکثر لوگوں کو پتا ہی نہیں چل پاتا کہ وہ غدہ درقیہ میں نقص کی وجہ سے بیمار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ پاکستانی غدہ درقیہ سے متعلق کم ہی معلومات رکھتے ہیں۔

اگر خدشہ ہو کہ آپ کا غدہ درقیہ خراب ہے، تو کسی اچھے اسپتال میں جائیے۔ وہاں غدہ کی تندرستی جاننے کے لیے مختلف طبی ٹیسٹ ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس کی

www.pdfbooksfree.pk

اسکیننگ بھی ہوتا کہ مرض کا پتا چل سکے۔ اگر غدہ درقیہ ناقابل علاج ہو، تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔

لاہور کے ایک ممتاز معالج، ڈاکٹر زمان شیخ کا کہنا ہے "جب کسی انسان میں غدہ درقیہ کام نہ کرے، تو کئی لحاظ سے اس کی صحت پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ وجہ یہ کہ غدہ درقیہ کی خرابی ڈپریشن، امراض قلب، بے چینی، بال گرنا، ہاتھ پیر وغیرہ کو بڑھاوا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ غدہ درقیہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں۔"

قدرتی علاج

کئی لوگ ادویہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے بعض قدرتی علاج سے غدہ درقیہ کو صحت مند رکھنا ممکن ہے۔ اگر غدہ خراب ہو، تو سفید آٹا، چکنائی، چینی، گوبھی، ناشپاتی اور آڑو معتدل مقدار میں استعمال کیجیے۔ یہ اشیا زیادہ کھانے کی صورت میں غدہ درقیہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، روزانہ ایسی غذا کھائیے جس میں ۵۰ فیصد حصہ پھلوں و سبزیوں پر مشتمل ہو۔

غدہ درقیہ کی خرابی کا شکار لوگ کیفین سے دور رہیں۔ یہ شے غدے کا فعل متاثر کرتی ہے۔ جبکہ زنک، تانبا، سیلنیم اور وٹامن اے رکھنے والی غذائیں کھائیے۔ یہ معدن اور وٹامن غدہ درقیہ کو تندرست رکھتے ہیں۔

غدہ درقیہ کے ہارمونوں کی پیدائش کے لیے آئیوڈین عنصر کا جسم میں ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے آئیوڈین کی کمی سے غدہ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ کمی آئیوڈین ملا نمک کھانے سے دور کرنا ممکن ہے۔

جسم میں چکنائی کے ضروری تیزاب (Essential fatty acids) بھی ہونے ضروری ہیں۔ یہ غدہ درقیہ کے ہارمونوں کی پیداوار میں حصہ لیتے اور جسمانی سوزش گھٹاتے ہیں۔ السی کا تیل ان تیزابوں کا خزانہ ہے۔

انسانی جسم میں کیلشیم اور میگنیشیم بھی وافر ہونا چاہیے۔ یاد رہے، یہ دونوں اپنے افعال انجام دینے کی خاطر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اگر جسم میں میگنیشیم کی کمی ہو، تو کیلشیم صحیح طرح جزو بدن نہیں بن پاتا۔ عام طور پر ۱۰۰۰ ملی گرام کیلشیم کے لیے ۳۳۵ ملی گرام میگنیشیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

◆◆◆

کوئی مہرباں سا ہے

ہر ایک نقش ترے پاؤں کے نشاں سا ہے
ہر ایک راہگزر تیرا آستاں سا ہے
کہیں سمٹ کے نہ رہ جائے ہمت پرواز
کہ شاخ شاخ پہ پنہاں اک آشیاں سا ہے
ابھی گلوں کی نظر سے نظر نہیں ملتی
ابھی فضائے چمن میں دھواں دھواں سا ہے
نجانے شوق کی وہ رات کٹ گئی کیسے؟
ہر ایک لمحہ جہاں عمر جاوداں سا ہے
اُجڑ گئی ہے میری کائنات دل، پھر بھی
مری نگاہ میں آباد اک جہاں سا ہے
زباں پہ نام بھی آتا ہے تیرا رُک رُک کر
ہر ایک تار نفس دل کا پاسباں سا ہے
یہ کس نے آج جگائی ہے یاد رفتہ کی
یہ کون دل کے قریں آج نوحہ خواں سا ہے
لگے ہیں دل سے ابھرنے وفا کے افسانے
کہ اپنے حال پہ پھر کوئی مہرباں سا ہے

(صوفی تبسم)

www.pdfbooksfree.pk

ہماری حاضر جواب اور بذلہ سنج

بیٹی گھر کی رونق بن گئی

ایک فخر مند باپ اپنی ہونہار دختر کی کامیابیاں بیان کرتے ہیں

انور احمد علوی

ہمارے تین بچے ہیں: عمیر، سارہ اور حفصہ۔ تینوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان سے کسی غریب کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ یہ ابھی بچے ہیں اور سیاست نہیں جانتے۔ اس لیے عملی قدم اٹھاتے اور تصویر بھی نہیں کھنچواتے! پتا اس وقت چلتا ہے جب وہ بار بار جیب خرچ دینے کا مطالبہ کریں۔

ایک مرتبہ عمیر نے پندرہ سو روپے مانگے۔ ہم نے چپ چاپ دے دیے۔ ہمیں تو خیر کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ماؤں کو ایسے مواقع پر تشویش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اہلیہ کو شک گزرا کہ بیٹا لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے، کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا رہا؟ اگر کبھی تنخواہ دینے میں دیر ہو جائے، تو یہی شک انھیں ہم پر بھی ہوتا ہے! وہ ٹوہ میں لگ گئیں۔

جب عمیر کے دوستوں سے رابطہ کیا، تو پتا چلا، مالی بابا کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور عمیر اسکول کے بچوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطیر رقم کا بندوبست کر رہا ہے۔

تینوں بچوں کی انفرادی خصوصیات بالکل مختلف ہیں۔ عمیر تابع فرمان اور ذمے دار ہے۔ ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ گھر میں کب کس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سارہ کھلے دل کی مالک اور شاہ خرچ ہے۔ وہ خوشی کے موقع پر (کوئی توقع رکھے بغیر) دل کھول کر تحائف دیتی ہے۔ یہ نہیں سوچتی کہ ماضی میں اسے کس نے کیا دیا تھا۔ جہاں تک بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستگی میں حفصہ کا جواب نہیں۔ اس سے پہلے کہ حفصہ کا ذکر کریں، عمیر اور سارہ کے بچپن کا

www.pdfbooksfree.pk

ایک ایک دلچسپ واقعہ سنتے چلیں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے باہر جانے لگے۔ عمیر نے کہا "حالات اچھے نہیں لہٰذا کوئی دروازہ کھٹکھٹائے، تو ہرگز نہ کھولنا۔ مبادا ڈاکو وغیرہ اندر آجائے۔"

اتفاق سے اس دوران ہمارے بڑے ماموں آ گئے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، اپنا نام بتایا اور عمیر سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ عمیر (جو اس وقت چار سال کا تھا) کہنے لگا "نانا ابا، میں گھر میں اکیلا ہوں۔ ابو نے منع کیا ہے کہ ڈاکو آئیں تو دروازہ نہیں کھولنا!"

ایک بار سارہ نے ہم سے بڑی فرمائش کر ڈالی۔ ہم نے کہا "ہم غریب آدمی ہیں، تمھاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے۔" وہ سمجھ گئی۔ ہمیں سخت ملال ہوا۔ اسے بہلانے کی غرض سے شام کو سیر و تفریح کا پروگرام بنایا۔ اہلیہ نے سارہ سے تیار ہونے کے لیے کہا، تو انتہائی معصومیت سے بولی "آپ لوگ چلے جائیں، مجھے غریبوں کے ساتھ گھومنے نہیں جانا۔"

***

میری بیٹی حفصہ ۲۲ اگست ۱۹۹۱ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے اور بے حد حساس۔ اس نے چھے برس کی عمر میں انگریزی زبان میں خط اور نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ بچپن میں جب کسی کی کوئی بات ناگوار گزرتی، تو زبان سے کچھ نہ کہتی، غصے میں دروازہ بند کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کچھ دیر بعد ایک لفافہ باہر پھینک دیتی۔ ہم لوگ لفافہ کھول کر خط پڑھتے، محظوظ ہوتے اور اسے محفوظ کر لیتے۔ دلیل میں وزن ہوتا، تو اس کی بات مان بھی لیتے۔ ان یادگار خطوط کا مجموعہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور دلچسپ انگریزی کتاب "Warning Letters to Parents" (والدین کے لیے تنبیہی خطوط) کے نام سے شائع ہو چکا۔

یہ وہ باتیں ہیں، جو بچے بڑے ہو کر حد ادب کی وجہ سے نہیں کر سکتے۔ یہ خطوط اس کی حساس طبیعت کا ردعمل ہیں اور طنز و مزاح کا خوب صورت امتزاج۔ ان میں پایا جانے والا مزاح فطری ہے۔ یہ مزاح زیادہ تر اس کی منفرد تشبیہات سے پیدا ہوتا۔ وہ جو کچھ دیکھتی، سوچتی، محسوس کرتی، اسے "پرنس اینڈ پبلیکیشن آرگنائزیشن" کی پروا کیے بغیر معصومیت سے لکھتی جاتی۔ وہ مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتی۔

یہی وجہ ہے، اپنے خطوط میں وہ ہمیں ہم میاں بیوی کو دھمکیاں دیتی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات یاد کراتی اور ہمیں اپنے بڑے بھائی کی تربیت کرتی نظر آتی ہے۔ اس کے یہ خطوط چھے سے بارہ برس کی عمر کے درمیان لکھے گئے۔ یہ ایک بچی کے احساسات و جذبات ہیں۔ اس لیے ان میں زبان و بیان اور گرامر کی غلطیاں تلاش نہ کی جائیں۔

حفصہ کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے کام ترتیب سے کرنے کی عادی ہے۔ خود پریشان ہوتی ہے نہ دوسروں کو تنگ کرتی ہے۔ دہلی میں پیدا نہ ہونے کے باوجود نہاری، پائے اور پلاؤ اس کے پسندیدہ کھانے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہمارے ہاں مشرقی کھانے پکانے کی روایت برقرار ہے ورنہ عمیر اور سارہ بدمزہ مغربی کھانوں اور فاسٹ فوڈز کے دلدادہ ہیں۔ اسکول جاتے وقت اہلیہ کو باقاعدہ دھمکی دے کر جایا کرتی "امی آج فلاں چیز بنایئے گا ورنہ دیکھیے گا، میں کیا کرتی ہوں؟"

اب حفصہ کے چند مزیدار واقعات جنھیں پڑھ کر

www.pdfbooksfree.pk

آپ کو یقیناً لطف آئے گا:

ایک رات حفصہ نے اسکول جاتے ہوئے پچاس روپے مانگے۔ اہلیہ نے ڈانٹ دیا کہ اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟ اسے پندرہ بیس روپے دیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد حفصہ ایک بڑی سی چادر اوڑھے باورچی خانے میں داخل ہوئی اور کپکپاتی آواز میں بولی ''اے باجی... اے باجی! تیرے بچے سدا جیویں... مجھ گریب کو پچاس روپے دے دے!'' یوں اپنی ذہانت سے امی کو ہنسا کر پچاس روپے لے لیے۔

ہماری بڑی بیٹی سارہ کو بلی پالنے کا شوق ہے۔ ایک بار وہ کہنے لگی ''ابو اس مرتبہ نتیجہ آنے پر آپ مجھے تحفے میں بلی دیجیے گا۔ امی، بھائی اور حفصہ کی مرضی، وہ جو بھی دیں۔''

حفصہ، جو اسکول کا کام کرنے میں مصروف تھی، دور ہی سے چلائی ''سارہ کوئی بھی تمھیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتا۔''

''کیوں نہیں دے سکتا، میں تو ابو سے بلی ہی لوں گی۔''

''ابو تمھیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتے۔''

''کیوں نہیں دے سکتے؟''

''پاگل، وہ بلی کو ڈبے میں پیک کیسے کریں گے!''

ایک بار ہمارے ایک ادیب دوست آئے۔ ہم نے حفصہ سے کہا کہ ان پر اچھی سی نظم لکھ دو۔ اگلے ہفتے انھیں اپنے ہاں ادبی نشست میں بلائیں گے، تو پڑھ دینا، خوش ہو جائیں گے۔ انھیں گئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ حفصہ دوڑی آئی اور کہنے لگی ''ابو، ابو! آپ کے دوست پر ایک شعر تو ہو گیا آپ... جلدی سے نوٹ کر لیں، کہیں میں بھول ہی نہ جاؤں۔''

ہم نے اسی وقت کاغذ پنسل اٹھائی تو بولی:

His colour is very fair,
But his head is without hair!

(ان کا رنگ تو اجلا ہے، مگر سر بالوں سے خالی ہے)

اسی طرح ایک دن ہمارے ہاتھ میں پرچی لا کر دی کہ میں بھائی پر نظم لکھ رہی ہوں، ابھی ایک شعر ہوا ہے، یہ اپنے پاس رکھ لیں، مجھ سے کہیں گم نہ ہو جائے۔ ہم نے شعر پڑھا، تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ لکھا تھا:

My brother is thin
Just like a common pin!

(میرا بھائی پتلا ہے، کامن پن سے ملتا ہے)

ہمارے ایک دوست محمد سرور عالم دفتر کے ساتھی ہیں۔ ہمیں جب کچھ رقم درکار ہو، ان سے تذکرہ کر دیتے۔ وہ ہمیں رقم دے ڈالتے، کبھی انکار یا بہانہ نہ کرتے۔ ایک روز رات کے کھانے پر اسکول سے متعلق کسی بڑے خرچے کا ذکر ہوا۔ ہم نے کہا ''ہمارے پاس تو اتنی رقم ہے نہیں، کل دفتر میں 'سرور' سے بات کریں گے۔''

حفصہ نے سنا، تو چھوٹتے ہی بولی ''ابو جی ی ی ی! 'سرور' تو کمپیوٹر میں ہوتا ہے!''

ہمارا بیٹا بہ لحاظ پیشہ ایکچوئری (Actuary) ہے۔ ایکچوئری کا شمار بھاری معاوضہ لینے والے ماہرین میں ہوتا ہے۔ حفصہ کو معلوم ہوا کہ ایکچوئری کو بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے، تو اس کے معصوم ذہن میں ایک خدشہ پیدا ہوا۔ پریشان ہو کر اہلیہ سے کہنے لگی ''امی... امی! بھائی جب ایکچوئری بنا، تو اس کی تنخواہ ابو سے زیادہ ہو جائے

www.pdfbooksfree.pk

گی تب کہیں کہیں ابو اس سے جلیں گے تو نہیں؟"

ایک بار حفصہ چھٹیوں میں کسی عزیزہ کے ہاں رہنے گئی۔ خاتون خانہ نے کسی بات پر اپنی ملازمہ کو مارا، تو وہ رونے لگی۔ حفصہ سے چھوٹی سی بچی کو مارنا اور اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ شام کو جب وہ بچی بچوں کو لیے پارک میں گئی، تو راستے میں حفصہ اس سے کہنے لگی "نصرت! سب سے پہلے تو تم یہ ملازمت چھوڑ دو تاکہ تمھیں مار نہ پڑے۔ پھر کسی اچھے اسکول میں داخلہ لو۔ تمھاری زندگی بن جائے گی۔"

حفصہ بے چاری کو کیا پتا کہ اگر بچی کے والدین کے پاس وسائل ہوتے، تو وہ غریب کھیل کود کی عمر میں ملازمت کرنے کے بجائے کسی اسکول میں پڑھ رہی ہوتی۔

> حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے "اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔"

ایک بار اہلیہ نے کسی بات پر اسے ڈانٹا، تو کہنے لگی "میں نے بہت صبر کر لیا۔ اب میں اور برداشت نہیں کروں گی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں ورنہ میں آپ کے رویے پر ایک نظم لکھ دوں گی۔"

حفصہ کو بچپن میں بیر بہت پسند تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ 'بیر' کو بیئر کہتی اور مونث بولتی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا، تو اس سے کہتی "آپ کو پتا ہے، ہمارے فریج میں 'بیئر' رکھی ہے، ابو لائے تھے۔"

جو بھی سنتا مشکوک نظروں سے ہمیں گھورنے لگتا۔ تب ہمیں اپنے گھر میں رکھی 'بیئر' دکھانی پڑتی۔

ایک روز بازار سے ہم مہینے کا سودا لے کر آئے۔ حفصہ کارٹن سے مختلف اشیا نکال نکال کر اہلیہ کو دینے لگی۔ اچانک اس کی نظر باریک کنگھی پر پڑی، جو سامان میں نیچے کہیں دبی تھی۔ جس طرح املی یا کھٹائی کے ذکر سے منہ میں پانی بھر آتا ہے، کنگھی دیکھ کر اسے اپنے سر میں کھجلی محسوس ہونے لگی۔ سر کھجاتے ہوئے بولی "امی، امی کنگھی آئی، کھجلی شروع۔"

ایک دن بولی "ابو ہمارے اسکول میں سب بچے گاڑی پر آتے ہیں، آپ بھی خرید لیں۔"

ہم نے کہا "اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہمیں گاڑی دے دیں۔"

کچھ دیر بعد بالکونی میں پڑے اپنے کپڑے اٹھانے گئے، تو دیکھا حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے "اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔"

ایک روز اس کے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی اور وہ زخمی ہو گیا۔ غصے میں بھری ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی "ابو، ابو، امی کو دیکھیں، مجھے ہرا جوزا پہنا رہی ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ لال جوزا پہنائیں، میری چوٹ اس سے میچ کرے گی، مگر امی سمجھ ہی نہیں رہیں۔"

ایک مرتبہ دونوں بہنیں اپنے اپنے کمروں کا موازنہ کرنے لگیں کہ میرے کمرے میں یہ ہے، تمھارے میں وہ نہیں۔ دونوں میں کافی دیر بحث چلتی رہی۔ سارہ کے کمرے میں زیادہ چیزیں نکلیں۔ حفصہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرے کمرے میں تو امی اور ابو بھی ہیں۔" سارہ یہ سن کر مسکرائی اور لاجواب سی ہو گئی۔

اب ذرا حفصہ کے چند معصوم مشاہدے ملاحظہ

www.pdfbooksfree.pk

فرمائے جنھوں نے ہمیں حیران کر دیا۔

حفصہ چار سال کی ہوئی، تو ہم نے اسے اسکول میں داخل کر دیا اور آنے جانے کے لیے وین کا بندوبست کر دیا۔ پہلے دن اسکول سے واپس آئی، تو ہم نے پوچھا ''اسکول کی وین میں مزہ آیا؟''

کہنے لگی ''ہاں بہت مزہ آیا۔ مگر اس میں وہ آدمی تو تھا ہی نہیں جس کے ہاتھ میں بہت سارے پیسے ہوتے ہیں اور جو بار بار دروازے پر ہاتھ مار کر شور مچاتا رہتا ہے، چھدر چھدر (صدر صدر)۔''

ایک مرتبہ حفصہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ رات وہ ڈاکٹر کے ہاں گئی، تو وہاں کافی بھیڑ تھی اور بہت دیر سے نمبر آیا۔ اگلے روز اہلیہ نے دوبارہ ڈاکٹر کے ہاں چلنے کو کہا، تو کہنے لگی ''امی! بس نماز مغرب پڑھتے ہی چلیں۔ ڈاکٹر کے ہاں ہجوم نہیں ہو گا کیونکہ اس وقت ساری عورتیں اپنے میاں کو چائے دے رہی ہوں گی۔''

ہمارے ایک ہم زلف بنوں اور ڈیرہ میں پروفیسر ہیں۔ ہم نے ایک روز ہوا بھروانے پٹرول پمپ پر کار روکی۔ وہاں ٹائروں میں پنکچر لگانے والے لڑکوں کے منہ پر کالک لگی تھی۔ حفصہ کچھ دیر تو انھیں غور سے دیکھتی رہی کہ یہ کالے کالے سے لڑکے کس ملک سے آئے ہیں، پھر حیران ہو کر اہلیہ سے کہنے لگی ''امی! کیا ہمارے خالو بھی ٹائروں میں پنکچر لگاتے ہیں؟''

عمیر نے دفتر جانا شروع کیا، تو اہلیہ اس کا خاص خیال رکھنے لگی۔ وہ صبح جا کر شام کو تھکا ہارا واپس آتا اور پھر رات بھر پڑھتا رہتا۔ حفصہ نے محسوس کیا کہ امی اب ہمارے مقابلے میں بھائی کا زیادہ خیال رکھنے لگی ہیں۔ اس سے نہ رہا گیا اور معصومیت سے بولی ''امی! اگر میں اور سارہ بھی دفتر جانے لگیں، تو پھر آپ ہمارا بھی اسی طرح خیال رکھیں گی؟''

ہمارے بیٹے کو دفتر کی طرف سے اپنے علاقے میں مکان ملا، تو ہم لوگ گلشن اقبال سے وہاں منتقل ہو گئے۔ ایک دن ہم نے عمیر سے کہا ''گھر تو اچھا ہے، علاقہ بھی ٹھیک، مگر مسجد بہت دور ہے۔ ہماری فجر کی جماعت ضائع ہو رہی ہے۔'' حفصہ نے سنا، تو گھبرا گئی کہ ہم کہیں فلیٹ میں واپس جانے کا پروگرام تو نہیں بنا رہے۔ اس نے اسی وقت ہمیں دو صفحات پر مشتمل ایک طویل خط لکھا، جس میں پہلے تو آپ اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد دلائے اور پھر ہمیں ہماری حیثیت بتائی گئی۔ اس خط کا آخری جملہ کچھ یوں تھا:

''ابو آپ کو اللہ کی جنت میں چھوٹا سا فلیٹ ملنا چاہیے۔''

ایک مرتبہ ہم نے ایک صاحب کو دوران گفتگو بے وقوف کہہ دیا۔ وہ اکڑ گئے اور کہنے لگے ''مجھے پاگل تو بہت سے لوگوں نے کہا ہے، مگر بے وقوف ابھی تک کسی نے نہیں کہا تھا۔'' پھر اچانک انھیں کچھ خیال آیا اور کمرے کے اندر گئے اور ہمارا خط لا کر دیا کہ اسے پڑھو۔ ہم نے پڑھا تو شرمندہ ہو گئے، کیونکہ اپنے اس خط میں ہم نے انھیں ''مدبر'' کا لقب دیا تھا۔

اسی طرح حفصہ نے کتاب آنے کے بعد خط لکھنے چھوڑ دیے۔ اب اسے جب بھی ہماری کوئی بات ناگوار گزرے، تو چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں جاتی اور اپنی کتاب میں ایک رقعہ رکھ ہماری طرف بڑھا دیتی ہے۔ مثلاً ''آپ ذرا کتاب کے صفحے ۱۱ اور ۵۰ پڑھ لیجیے۔''

www.pdfbooksfree.pk

پنڈت نہرو کے عشق نے

پاکستان کو مسلم اکثریتی علاقوں سے محروم کر دیا

انگریز ہندو ملی بھگت کی چشم کشا داستان

رضی الدین سید

جب تقسیم ہند کا باضابطہ اصول طے پایا، تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی باہمی رضامندی سے "نیشنل باؤنڈری کمیشن" تشکیل دیا جس کا مقصد دونوں ملکوں کی سرحدوں کی حد بندی کرنا تھا۔ بحث مباحثے سے بچنے کی خاطر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فریقین سے پہلے ہی ضمانت لے لی کہ کمیشن کے فیصلے پر وہ رضامند رہیں گے۔

لیکن جون ۱۹۴۷ء کے آخر تک بھی کمیشن کا قیام عمل میں نہیں آسکا۔ کمیشن کا چیئرمین "ریڈکلف" تھا جس کے نام پر ہی باؤنڈری کمیشن کا نام بھی رکھا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص ۸ جولائی ۱۹۴۷ء ہی کو ہندوستان پہنچا۔ وہ پاک بھارت علاقوں کے جغرافیے سے بالکل نابلد تھا۔ ایک اور حیران کن بات یہ کہ ریڈکلف نے اپنا ایوارڈ اس وقت سنایا جب پاک بھارت آزادی کی منزل میں آچکی تھی یعنی ۱۷/ اگست ۱۹۴۷ء کو۔

دو ممالک وجود میں آچکے تھے لیکن ان کی سرحدیں کہاں تک ہوں گی، اس کی وضاحت ۱۵/ اگست تک موجود نہیں تھی۔ فیصلے میں تاخیر کیوں ہوئی، ساری داستان بس اسی بات میں پوشیدہ ہے۔ باؤنڈری کمیشن اس لیے بنایا گیا تھا کہ دونوں ممالک کے علاقے متعین ہو جائیں اور پڑوسی کی حیثیت سے پاک بھارت مل جل کر رہیں۔ کمیشن کا مقصد مستقبل کے سرحدی تنازعات کا خاتمہ

www.pdfbooksfree.pk

تھا، لیکن جو کچھ سامنے آیا، وہ توقعات اور مقاصد کے بالکل برعکس تھا۔ سازشی ہندو اور مکار انگریزوں نے پاکستان کو کمزور کرنے کے ہتھکنڈے منانے کی خاطر ایک طرف کئی مسلم اکثریتی علاقے خفیہ طور پر بھارت کو عطا کر دیے، دوسری جانب کشمیر کا شعلہ جوالا ہمیشہ کے لیے سلگتا چھوڑ گئے۔

معروف دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تحقیقی کتاب "جدوجہد پاکستان" میں لکھتے ہیں "ایسا ہی ایک علاقہ بھی، جس پر ہندو اپنا جھوٹ موٹ کا حق جتا سکتے تھے، مسلمانوں کے حصے میں نہیں آنے دیا گیا۔ ایسے علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوؤں کے پاس چلے گئے۔ جو نہریں پاکستان کو سیراب کرتی تھیں، ان کی سیرابی کا ہیڈ (سرچشمہ) ہندوؤں کو مل گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلم اکثریتی ضلع گورداسپور ہندوؤں کے [illegible] ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ مل جائے۔"

اس معاملے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے پاکستان کے ایک [illegible] قاضی عبدالرحمن مرحوم [illegible] پاکستان [illegible] بھارت [illegible] کشمیر جہاں ۸۵ فیصد اکثریت مسلمانوں کی تھی [illegible] پاکستان میں شامل [illegible] بھارت کو [illegible] پاکستان [illegible] (میرا کاروان، قاضی عبدالرحمن، ص ۷۱ [illegible])

واضح رہے [illegible] تقسیم ہند کی اولین تاریخ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء مقرر کی تھی۔ تاہم انجانے معاملات کے باعث تاریخ اچانک نو ماہ قبل یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کر دی گئی۔ بعض کانگریسی مصلحتوں کے پیش نظر سردار پٹیل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا تھا کہ انتقال اقتدار کی طویل مدت گھٹا دی جائے۔ (بحوالہ کتاب فریڈم ایٹ مڈ نائٹ۔ Lorry Collins اور Lappierre۔ ص ۱۹۳)

یہ امر بھی حقائق واضح کرتے ہیں کہ پاکستان کے خلاف سازشیں شروع ہی سے جاری تھیں۔ قاضی عبدالرحمن اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "مجوزہ انتقال اقتدار کی تاریخ کا تعین باؤنڈری کمیشن کے حوالے سے کیا جانا چاہیے تھا تاکہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے اپنا ایوارڈ مکمل کر لیتا کہ کون سے علاقے کہاں جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے باؤنڈری کمیشن کی تقرری ۳۰ جون ۱۹۴۷ء تک نہ ہوئی، جبکہ اس کا [illegible] ۱۶ [illegible] گیا۔" (میرا کاروان، ص ۲۴۳)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مزید وضاحت کرتے ہیں جو منصوبہ بندی ہندوستانی حکومت [illegible] ایک [illegible] اکثریت والے کشمیر [illegible] بھارت کی [illegible] قائداعظم [illegible] (جدوجہد پاکستان، ص ۱۲۶)"

ڈاکٹر قریشی مزید لکھتے ہیں "آل انڈیا [illegible] ۳ جون ۱۹۴۷ء [illegible]" (ایضاً، ص ۱۲۷)

کاش [illegible] ۱۹۴۷ء [illegible] پاکستان [illegible]

www.pdfbooksfree.pk

ایٹمی قوت بن چکا۔ قاضی عبدالحنان لکھتے ہیں: ہندو، انگریز سازش قیامِ پاکستان کے راستے میں بارودی سرنگ بچھانے کے مترادف تھی۔ اسی مقصد کے تحت پاکستان کی سرحدوں میں کانٹ چھانٹ کی گئی۔ اس سے آبپاشی نظام کا گلا گھونٹا گیا اور اس کے جنگی سازوسامان (طیاروں، توپوں وغیرہ) کو منتقل نہیں ہونے دیا گیا۔" (ص۔۵۵۹)

انٹرنیٹ کے وکی پیڈیا میں درج ہے: "ریڈکلف نے اپنا کام انتہائی رازداری سے انجام دیا۔ حال یہ تھا کہ بہت سے ہندو یا مسلم ریاستوں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا یا انھیں بھارت ہی میں رہنا ہوگا۔ بنگال کے علاقے مرشد آباد اور مالدہ کے لوگوں کی اکثریت (۷۰ فیصد) مسلمان تھی اور ان کا یقینی گمان تھا کہ انھیں از خود پاکستان میں شامل کیا جائے گا اور وہ اس کے شدید خواہش مند بھی تھے۔ ۱۷ اگست تک بھی وہ اپنے علاقوں میں جوش و خروش کے ساتھ پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کے علاقے بھارت کے ساتھ ملا دیے گئے۔ گورداسپور کی مسلم آبادی بھی ۵۱ فیصد کے حساب سے اکثریت میں تھی۔ لیکن انجانے اسباب کے تحت گورداسپور کو بھی بھارت کے ساتھ ملا دیا گیا۔ واضح رہے کہ اسی ضلع میں قادیانیوں کا صدر مرکز قادیان بھی موجود تھا۔ اس وقت تک قادیانیوں کو سرکاری طور پر مسلم ہی تسلیم کیا جاتا تھا، ہندو وہ بہرحال نہیں تھے۔

"فیروز پور جہاں سکھ اور ہندو ... تھا، اسے پہلے پاکستان کو دیا گیا۔ بعد میں ایک ہندو ... فیصلے میں تبدیلی کرتے ہوئے اسے بھارت ... دیا۔ ... کا تعلق ... بھارت ... ۲۰۰۱ کی بھارتی مردم شماری کے مطابق وہاں اب بھی اکثریت

تعارف مصنف

رضی الدین سید کراچی کے معروف مصنف و کالم نگار ہیں۔ ان کے تحقیقی و مدلل مضامین پاکستان کے تقریباً تمام بڑے اخبارات و رسائل، بشمول انگریزی روزنامہ ڈان اور دی نیوز وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں صہیونیت پر مکمل توجہ کے ساتھ مربوط کام کے آغاز کا سہرا انھی کے سر ہے۔ اس موضوع پر اب تک تقریباً ۱۰ جلد ... تحقیقی موضوعات پر ۱۴ کتابیں تصنیف و ترجمہ کر چکے جنھیں پڑھنے والوں نے سراہا۔ آپ کی کتب میں (۱) "یہودی مذہب ابتدا سے حال تک"، (۲) "دجال"، (۳) "معرکہ عظیم"، (۴) "یہودی"، (۵) "بساطِ عالم کے مہرے"، (۶) "جدید صلیبی جنگ" اور (۷) "تحریک حقوق نسواں" شامل ہیں۔

(۳-۵۲) ... [illegible]

"... اس سے ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible]

www.pdfbooksfree.pk

یہ ہے کہ اس ضمن میں اقوام متحدہ کو بھی بیچ میں نہیں ڈالا گیا۔" (حالانکہ تقسیم ہند کے بعد نہرو نے کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ ہی کے سپرد کیا)۔ انسائیکلوپیڈیا مزید لکھتا ہے:

"ایوارڈ میں درون خانہ کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ اگرچہ رپورٹ انتہائی خفیہ رکھی گئی لیکن نہرو، پٹیل اور مینن کی وساطت سے اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔

وکی پیڈیا کا مضمون وضاحت کرتا ہے کہ ریڈ کلف کے اعلان اور پھر واپس لندن روانگی کے بعد سر ریڈ کلف نے اس ایوارڈ کے تمام کاغذات جلا کر ضائع کر دیے۔

ان حقائق کے بعد اب یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ۱۶ اگست کو جب ریڈ کلف فیصلہ (ایوارڈ) سامنے آیا اور جس میں بددیانتی سے پاکستان کا رقبہ کم کر دیا گیا تو قائداعظم نے اسے خاموشی سے کیسے برداشت کر لیا اور بھارت کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟

جواب یہ ہے کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا، تو وہ کمزور، مفلوک الحال، اقتصادی ابتری کا شکار اور فوجی ساز و سامان سے یکسر محروم تھا۔ اس وقت سوائے زبانی کلامی احتجاج کے اور دوسرا کوئی اقدام اٹھانا ممکن نہ تھا۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوتا۔ تاہم ایوارڈ آنے کے بعد قائداعظم نے اس پر احتجاج ضرور کیا۔ اس ضمن میں برطانیہ میں پاکستانی سفارت خانے کے سابق سیکرٹری اطلاعات قطب الدین عزیز حقیقت احوال سے واقف ہیں۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ نقشوں میں یہ تبدیلی مسز ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی پس پردہ سازشوں کے تحت ہوئی۔ ان دونوں کا خفیہ معاشقہ مدت سے جاری تھا۔ (اس کی تائید ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں کی ہے)۔ اسی دوستی کے باعث لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ میں تبدیلی کے لیے اپنے وائسرائے شوہر پر دباؤ ڈالا۔ قطب الدین عزیز مزید لکھتے ہیں کہ پنجاب کا علاقہ فیروزپور ایک بہت بڑا فوجی ڈپو اور آبپاشی نظام کا ہیڈ ورکس تھا۔ اسی باعث یہ علاقہ بھی پاکستان کے نقشے سے مٹا دیا گیا تاکہ اسے ناقابل بیان نقصان پہنچایا جا سکے۔

قائداعظم تک جب یہ فیصلہ پہنچا تو وہ سکتے میں آ گئے۔ قطب الدین عزیز بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر راہنمائے قوم نے ردعمل میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا "ہمیں ممکنہ حد تک سکیڑ دیا گیا ہے۔ باؤنڈری کمیشن نے ہم پر یہ آخری وار کیا ہے۔ اس ایوارڈ کو سراسر غیر منصفانہ، ناقابل تصور اور متعصبانہ فیصلہ ہی گردانا جائے گا۔ لیکن چونکہ ہم نے باؤنڈری کمیشن کے قیام پر اپنی تائید و منظوری کا سرکاری اعلان کر دیا تھا، اس لیے اب اسے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اس آخری جھٹکے کو بھی ہم ان شاءاللہ استقلال، جذبے اور امید کے ساتھ باعزت برداشت کر لیں گے۔" (دیکھیں قطب الدین عزیز کی کتاب (Jinnah and the Battle of Pakistan) کراچی۔ باب ۱۰)

یاد رہے کہ کمیشن کے ایک مسلم رکن منیر احمد اپنی فطرت کے اعتبار سے لبرل تھے اور جو بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان بھی مقرر ہوئے۔ ہماری مراد چیف جسٹس منیر احمد سے ہے۔ نجانے متنازع ایوارڈ پر انھوں نے دستخط کیوں کر دیے؟

یہ واضح ہے کہ ایسے موقع پر قائداعظم کی جگہ کوئی اور سربراہ بھی ہوتا تو احتجاج کے علاوہ کچھ اور نہ کر پاتا۔ کیونکہ اس وقت پاکستان معاشی و عسکری لحاظ سے کمزور حالت میں تھا۔ اس لیے باؤنڈری کمیشن کے معاملے میں قائداعظم پر انگلی اٹھانا حقائق سے ناواقفیت، مطالعے کی کمی اور تعصب و جانبداری کا مظہر ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

سبھی کے سامنے چل بسنے والی

مردہ دُلھن زندہ ہوگئی

انسانی جذبات کی پُراسرار بھول بھلیوں میں جنم لینے والا حیرت انگیز ماجرا

ناہید ہاشمی

یہ واقعہ غیر معمولی نوعیت کا تو نہیں پھر بھی اس کی صداقت پر قدرے شبہ ہو جاتا ہے۔ یہ شبہ دور کرنے کے لیے میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔ نانی مرحومہ بیان کرتی تھیں کہ یہ واقعہ سچ ہے۔ اس کے علاوہ ابھی اس واقعے کے چند عینی شاہد زندہ ہیں جن میں میرے نانا جان بھی شامل ہیں۔

اس وقت نانی اماں بانو کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اٹھان اچھی تھی اس لیے اپنی سب رشتے دار بہنوں سے بڑی نظر آتیں۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اللہ نے صورت کے ساتھ سیرت بھی اچھی دی۔ ساتھ ہی دولت بھی گھر کی لونڈی تھی۔

یوں سمجھ لیں کہ خاندان کے لڑکے ان کے دیوانے تھے۔ ہر گھر کی یہی خواہش تھی کہ بانو ان کے گھر کی بہو

www.pdfbooksfree.pk

بنے۔ ساتھ کی ہر لڑکی کی شادی ہو چکی تھی، لیکن نہ ہوئی، تو بانو کی۔ دراصل جس رشتہ کے لیے ہامی بھرتے، دوسرا خواہشمند رشتہ دار فتنہ پردازیاں شروع کر دیتا۔ مجبوراً ان کے ابا کو اس رشتے کا خیال چھوڑنا پڑتا۔ وہ چچا کے ہاں پانی بھرتے، تو تایا مگر جاتے۔ تایا کو خوش کرنا چاہتے، تو اماں کے تنھیال والے منہ پھلا لیتے۔

غیروں میں رشتہ کرنے کو دل نہ مانتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بانو کی عمر بڑھتی گئی۔ ساتھ والیوں کی گود میں بچے کھیلنے لگے، لیکن بانو کی شادی کہیں نہ ہو سکی۔ بانو کچھ دن تو یہ رسہ کشی دیکھتی رہیں پھر مکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگنے لگیں۔ اس زمانے میں منہ سے بولنا قیامت تھا۔ بس اللہ میاں کی گائے ہونے کا خطاب پا کر لڑکی چپ چاپ والدین کی خوشی قبول کر لیتی۔

یہی بانو کے ساتھ ہوا۔ لیکن جوں جوں یہ مسئلہ نازک ہوتا گیا، بانو گھن کی طرح پستی چلی گئی اور پھر بیٹھے بیٹھے دورے پڑنے لگے۔ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ چہرے کی ساری شادابی رخصت ہو گئی۔ بخار اور کھانسی نے راستہ دیکھ لیا۔ جب دیکھو بانو سر پر پٹی باندھے چارپائی پر لیٹی رہتی۔

پہلے پہل تو گھر والوں نے زیادہ توجہ نہ دی مگر جب چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا، تو ابا کا دل دھڑک اٹھا اور اماں بھی چونک گئیں۔ حکیم کو دکھایا۔ اس نے انھیں بتایا کہ لڑکی کو دق ہو گئی ہے۔ یہ سن کر گھر والوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ حکیم کا منہ بھر کر اسے یہ بات پھیلانے سے منع کیا، لیکن یہ مرض بھی عارضی دواؤں سے ٹھیک ہوا ہے؟ سدھرنے کے بجائے حالت اور بگڑتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ چھے ماہ کے اندر اندر جلی ہوئی مکڑی بن گئیں۔

آخر یہ بات کب تک چھپتی، سارے رشتے داروں میں پھیل گئی۔ اب تو سارے امیدوار لڑکوں نے اپنی اپنی دکان بڑھانے کی سوچی۔ اب دور دور تک کوئی لڑکا ایسا نظر نہ آتا جو بانو سے شادی کی خواہش رکھتا۔ بانو کے بڑے بھائی فوج میں ملازم تھے۔ وہ جب لمبی چھٹی لے کر گھر آئے، تو بانو کی حالت دیکھ کر گھر والوں پر برس پڑے۔ انھوں نے شہر سے اپنے دوست ڈاکٹر کو بلا لیا۔

ابا کی مخالفت کے باوجود بانو کا ڈاکٹری علاج شروع ہو گیا۔ مریض پر دواؤں سے زیادہ توجہ اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر کی توجہ نے بانو کے دل میں جینے کی امنگ پیدا کر دی۔ تین ماہ کے اندر اندر کملائی صورت پر بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر کی محبت بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ڈاکٹر صاحب سے جب معائنہ پوچھا گیا، تو انھوں نے کس چیز کا نذرانہ لینا چاہا۔ گویا بانو مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی مگر ڈاکٹر صاحب شادی کے بعد انھیں باہر لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں تبدیلی آب و ہوا کے بعد وہ مکمل ٹھیک ہو جائیں گی۔

مگر اس انکشاف نے خاندان میں آتش فشاں پہاڑ کا منہ کھول دیا۔ منجھلے بھائی سے لے کر ابا تک نے زہر کھا لینے کی دھمکی دے ڈالی۔ اماں نے تو قسم کھائی کہ اگر ایسا ہوا، تو وہ کچھ کھا مریں گی۔ مختصر یہ کہ سوائے بڑے بھائی الطاف کے اور کوئی اس رشتے پر راضی نہ تھا۔

گھر والے ڈاکٹر صاحب کا علاج بتا کر فوراً بانو کی شادی کی کوشش میں لگ گئے۔ اماں کا نالائق بھانجا جائداد کی خاطر اب تک بانو سے شادی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اماں نے اسی سے جھٹ منگنی کر ڈالی۔ بانو بچاری منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن جس نکاح والے دن ایسا

www.pdfbooksfree.pk

واقعہ پیش آیا جس کے متعلق یقین دلانے کے لیے میں ان کی حلفیہ قسم اوپر بتا چکی ہوں۔

گھر میں شادی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ برات آنے میں صرف ایک پہر باقی تھا۔ بڑے بھائی الطاف ڈاکٹر دوست کے ساتھ شہر چلے گئے۔ انھوں نے شادی میں شریک نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ خیر ان کی اس دھمکی کا بھلا کس پر اثر ہوتا تھا؟ سہ پہر کو اچانک بانو کا دل بری طرح گھبرایا۔ انھوں نے سب سہیلیوں کو چلے جانے کی التجا کی۔ پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے تیورا کر گریں اور پھر نہ اٹھیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ نبضیں ٹٹولیں۔ دل کی دھڑکن گنی چاہی، لیکن وہاں تو ایک خاموشی تھی۔ بانو سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

اب گھر والوں کی آنکھیں کھلیں۔ اماں ابا اپنی ہٹ دھرمی پر پشیمان ہوئے۔ اپنی لاڈلی کو یاد آنے کے واسطے دے کر روتے گئے۔ رشتے دار الگ شرمندہ کھڑے تھے۔ بھائی بچارے پچھاڑیں کھاتے دکھائی دیتے۔ سب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ شام برات آنے کے وقت سے کچھ دیر تک میت کو نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا۔ نعش پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ ایک آدمی بڑے بھائی کو بلانے شہر گیا ہوا تھا۔ ان کے آنے تک جنازہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ صبح تک لاش اسی حالت رکھی رہی۔

صبح چار بجے بھائی الطاف بھی آ گئے۔ اس غریب نے اپنی لاڈلی بہن کی پھولوں میں لپٹی لاش دیکھ کر سر پیٹ ڈالا۔ اب اس سوگوار جلوس نے بڑے اہتمام سے میت اٹھائی اور صبح پانچ بجے تک قبرستان پہنچے۔ وہیں یہ عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ قبر کھودنے کے بعد الطاف بھائی قبر میں اترے۔ بہن کی لاش کو سہارا دیتے جوں ہی انھوں نے سر کے نیچے ہاتھ رکھا، لاش میں ایک دم حرکت سی پیدا ہوئی۔

ایک لمحے کے لیے الطاف بھائی چونک گئے۔ انھوں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسری بار ابھی ان کا ہاتھ بڑھا بھی نہ تھا کہ بانو کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے کسی بیمار پر تشنج کا دورہ پڑ گیا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر سارے لوگ الٹے قدم بھاگ لیے۔ قبرستان میں صرف الطاف بھائی اکیلے رہ گئے۔

ان کا بیان ہے کہ انھوں نے جلدی سے کفن کا کپڑا ہٹایا۔ دیکھا کہ بانو پوری کوشش سے جسم کے اردگرد لپٹے کپڑے ہٹا رہی ہیں۔ بھائی کو سامنے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر ایک ٹک دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھائی نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا اور گھر واپس لے آئے۔ جہاں غم کا شور خوف کی دبی دبی سرگوشیوں میں بدل چکا تھا۔

جب غم سے نڈھال والدین کو اپنی لاڈلی کے زندہ ہونے کی خبر ملی اور انھوں نے اسے اپنے قدموں سے بھائی کے ہمراہ گھر آتے دیکھا، تو آپ سوچ سکتے ہیں ان لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ خوف سے بے نیاز ہو کر سب بانو سے لپٹ گئے۔ یہ کہنا اب فضول ہے کہ بانو یعنی ہماری نانی اماں کے شوہر وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو اب ہمارے نانا جان کہلاتے ہیں۔ بقول ان کے بانو کو سکتہ ہو گیا تھا یا پھر انھیں نئی زندگی انھی سے لے لی۔

بات کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے۔ یوں بیٹی کی جدائی کا یہ غم بڑے ڈرامائی انداز میں خوشی میں بدل گیا۔ نانی اماں یہ واقعہ سنانے کے بعد ہمیشہ خلاؤں میں گھورنے لگتیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

ادیبوں کی آئی ایس آئی اور

اُردو ادب کے محتسب اعلیٰ

دو دھاری کاٹ والا تلواری قلم رکھنے والے مشفق خواجہ المعروف بہ خامہ بگوش کا منفرد تذکرہ

راشد اشرف

کراچی کے علاقے ناظم آباد میں ریلوے پٹری کے قریب ایک چھوٹی سی گلی اور اس میں ایک چھوٹا سا مکان جس کے دروازے پر یہ تختی لگی رہتی تھی۔

"پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ کریں۔"

تختی پر لکھے ہوئے یہ الفاظ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کے بعد مؤثر نہ رہے کہ مذکورہ مکان کا مکین پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں جا سویا جہاں اب اس سے کسی بھی ملاقاتی کو ملاقات سے قبل پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ تختے کے بند سے سے شروع ہونے والے لینڈ فون نمبر ۲۶۱۰۱۴۸ پر اب فون کیجیے، تو ایک خاص انداز میں فرمائیے گا کہ مخاطب ہونے والے کی اہلیہ بھی وہاں نہیں ملیں گی کہ مکان کے مکین رہا ہو چکے۔

کس کی خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی کتنے جنازے لیے ہیں آج

معروف نقاد مظفر علی سید نے مشفق خواجہ کی تحریروں کے بارے میں لکھا تھا "ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی سیدؔ چھپا ہوتا ہے۔ خامہ بگوش کی

www.pdfbooksfree.pk

نظریں نہایت تیزی سے اس لیڈر کو برآمد کر لیتیں۔"

بقول مختار زمن "خواجہ صاحب کے اندر بیٹھا ہوا مسخرا بچوں جیسی بات وہ اکثر اپنے انداز میں ایسے بیان کر دیتا کہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔" ایک اور موقع پر مظفر علی سید کہتے ہیں "ان کی کاٹ اکثر دودھاری ہوتی ہے۔ پہلوداری کا کمال یہی ہے کہ ادھر ادھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف باہا کر نیچے تو پتا چلتا ہے۔ کون کون زد میں آگیا۔"

محمد نگر لاہور میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کے دن پیدا ہونے والے عبدالحئی کو دنیائے اردو ادب میں مشفق خواجہ کے نام سے جانا گیا۔ ادبی حلقوں میں وہ خامہ بگوش کے نام سے مشہور تھے۔ مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ایک عہد انہی کے ساتھ تمام ہوگیا۔ بقول انور سدید "مشفق خواجہ کے انتقال پر وہ لوگ زیادہ روئے جن پر خامہ بگوش نے زیادہ سخت کالم لکھے تھے اور جنھیں بار بار اپنے کالم کا موضوع بنایا۔ انھیں غم یہ ہے کہ اب اتنے شگفتہ انداز میں ان کا تذکرہ اپنے کالموں میں کون کرے گا۔"

مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمان طارق کے مطابق انھوں نے بھائی کی موت پر غیروں کو بھی پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ مشفق خواجہ کے بعد شہر کراچی سے علم کا سایہ اٹھ گیا۔ بقول شخصے، شہر کا حافظہ چھن گیا۔ وہ اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود نہ صرف بہت سے معذور اور بیمار ادیبوں و شاعروں کی مالی مدد کرتے بلکہ مرحومین کی بیواؤں اور بچوں کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے۔

ایک ادارے نے ان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کیا تھا جو ہر چھ ماہ بعد یک مشت ادا کیا جاتا۔ خواجہ طارق بیان کرتے ہیں کہ یہ رقم ملتے ہی ان کے بھائی پہلے ہی سے مرتب شدہ فہرست کے مطابق اسے مستحق احباب میں تقسیم کر دیا کرتے۔ خواجہ عبدالرحمان طارق کے بقول مشفق خواجہ کے پاس ڈھائی سو کے قریب ایسے مقالات تھے جنھیں وہ خود شائع کرنا چاہتے تھے۔

خواجہ طارق نے اپنے ایک مضمون جہاں اپنے چہیتے بھائی کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں وہاں مشفق خواجہ کی کالم نویسی کے نتائج کے ایک پریشان کن پہلو سے بھی قارئین کو آگاہ کیا۔ پہلے مشفق خواجہ کا اپنی کالم نویسی سے متعلق یہ تبصرہ ملاحظہ ہو "جس قسم کے خطوط (گم نام اور دھمکی آمیز) ہمارے نام آتے ہیں، اگر کسی دوسرے کے آئیں، تو کالم نویسی تو کیا، شہر بھی چھوڑ دے اور کسی جنگل میں جا کر بقیہ زندگی یاد الٰہی میں گزارے۔"

ایک مرتبہ مدیر ظرافت ضیاالحق قاسمی مرحوم خواجہ صاحب کے پاس اپنا مجموعہ کلام بغرض تبصرہ (فلیپ پر لکھوانے) دے گئے۔ بقول مشفق خواجہ "میں نے کلام دیکھا تو اسے ہر قسم کی رائے سے بے نیاز پایا۔" قاسمی صاحب کے شدید اصرار پر خواجہ صاحب نے لکھا کہ اس مزاحیہ کلام کو پڑھ کر ہمیں کلام پر نہیں شاعر پر ہنسی آتی ہے۔ انھوں نے ایک ایسے کلام پر محنت کی ہے جو ان کی بساط سے باہر ہے۔ اس پر ضیاالحق قاسمی باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہوگئے۔

مشفق خواجہ کراچی کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ء کو اپنا آخری کالم لکھنے کے بعد انھوں نے عملی طور پر اس شغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی

www.pdfbooksfree.pk

اے (آنرز) اور ۱۹۵۹ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۳ء تک اس ادارے میں خدمات انجام دیں۔

انجمن میں انھیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کئی برس کام کرنے کا موقع ملا۔ اردو مخطوطات پر کام کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات مرتب کی۔ انجمن ترقی اردو کے جرائد ماہنامہ اردو اور ماہنامہ قومی زبان کی ادارت کی۔ جریدہ قاموس الکتب کے مدیر بھی رہے۔ برصغیر کے اہم کتب خانوں میں مشفق خواجہ کا کتب خانہ اہم ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتب خانے سے ہندو پاک کے کم و بیش پچاس افراد بشمول مشاہیر ادب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں استفادہ کیا۔

مذکورہ کتب خانے میں لگ بھگ پچیس ہزار کتب اور بارہ ہزار سے زائد رسائل و جرائد موجود ہیں۔ خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق مشفق خواجہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر ہندوستانی لائبریریوں کو بھجواتے تھے۔ ان میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، جامعہ ملیہ لائبریری دہلی اور مولانا آزاد نیشنل لائبریری حیدرآباد کن شامل ہیں۔ اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ مذکورہ کتب خانے میں مشفق خواجہ کے خطوط، ان کی غیر مطبوعہ تحریریں، ذاتی ڈائریاں، تصویریں اور مخطوطات اب موجود نہیں۔ یہ خزانہ اب ان کے اہل خانہ کے پاس ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ (مشفق خواجہ کی اہلیہ ان دنوں سخت علیل ہیں۔)

شاعر مشفق خواجہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں اپنا نادر روزگار کتب خانہ محفوظ کرنے کی خاطر اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم (یونیورسٹی آف شکاگو کنسورشیم) سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس کی رو سے مذکورہ کتب خانہ لائبریری کنسورشیم کو فروخت کر دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ناصر جاوید کتب خانے کے معاملات کے نگران ہیں۔

کتابوں کی کیٹلاگنگ کا کام اس وقت سے مستقل جاری ہے۔ کتب خانے کا نیا نام مشفق خواجہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر قرار پایا ہے۔ یہ کتب خانہ ۲۰۰۸ء میں وقف کے طور پر رجسٹر کرا دیا گیا۔ علم و ادب سے شغف رکھنے والے احباب کے لیے یہ خوش کن خبر ہوگی کہ اس کتب خانے کو آن لائن کیے جانے کے منصوبے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ کام کی تکمیل کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ سے اس سے استفادہ کیا جا سکے گا۔

مشفق خواجہ نجی محفلوں میں بھی اپنے شگفتہ تبصروں کی

www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے مرکزِ نگاہ رہتے۔ راشد شیخ سے روایت ہے کہ ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار انھیں اپنا ماضی یاد آ گیا اور فرمانے لگے "ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا، دایہ بچہ جنوا تھوڑا سا گز اور آنکھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔"

مشفق خواجہ ان صاحب کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی انھوں نے بے اختیار کہا "اور آنکھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔"

لطف علی خان، ادا جعفری، مشفق خواجہ اور نورالحسن جعفری

عطا الحق قاسمی نے ایک مرتبہ مشفق خواجہ سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مونث؟ خواجہ صاحب نے جواب دیا "میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے بھی اسی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔"

خواجہ صاحب خود پر بھی فقرہ کسنے سے نہ چوکتے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ہندوستان سے ایک خاتون اور اس کا شوہر ملنے آئے۔ دونوں تدریس کے شعبے سے واقف تھے اور پہلی مرتبہ مشفق خواجہ سے ملے۔ تھوڑی دیر تک تو فضا میں اجنبیت اور تکلف کا تناؤ سا رہا۔ پھر خاتون نے ذرا بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا "خواجہ صاحب ہم تو آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔"

مشفق خواجہ نے دریافت کیا "کیوں؟"

خاتون بولیں "ہم نے تو سنا تھا کہ آپ پنجابی ہیں لیکن آپ سے مل کر اطمینان ہوا۔ آپ کے لب و لہجے، مزاج اور لباس سے کسی طرح ایسا نہیں لگتا۔"

خواجہ صاحب نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا "ابھی بس تھوڑی دیر بعد دیکھیے، میری حرکتوں سے معلوم ہو جائے گا۔"

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جن مشاہیر ادب کو نہایت تواتر کے ساتھ تختۂ مشق بنایا، ان میں سرفہرست جوش ملیح آبادی، نظیر صدیقی، مظہر امام، انور سدید، منظر علی خاں منظر، قمر جمیل، انیس ناگی، باقر مہدی، بشیر بدر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی، سلطان جمیل نسیم اور ساقی فاروقی شامل ہیں۔ باقر مہدی اور مظہر امام تو باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے، اتنے کہ خواجہ صاحب کو ان سے معذرت کرنی پڑی۔

واضح رہے مشفق خواجہ کے کالم طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے تھے، کوئی ایک کالم بھی ایسا نہیں جس میں کوئی کٹیلا پن نہ چھپا ہو۔ لیکن چند کالم ہی ایسے تھے جن میں محض دنیا سے گزر جانے والوں کی دل کی گہرائیوں سے توصیف کی گئی۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر صلاح الدین، منظر علی خاں منظر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی وفات پر لکھے کالم شامل ہیں۔

کالموں کے تیر اثر جملے

مشفق خواجہ کے قلم سے نکلے چند یک سطری تبصرے ملاحظہ ہوں جنھیں ان کے شگفتہ کالموں سے منتخب کیا گیا۔ یہ وہ کالم ہیں جو ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۷ء تک کراچی

www.pdfbooksfree.pk

کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں شائع ہوئے۔

☆ مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جائے، ہمارے ہاں انہی کاموں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

☆ کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالنا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

☆ ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔

☆ جب ابن انشا کو اپنی کوئی طبع زاد نظم پسند نہیں آتی تھی، تو اس پہ یہ لکھ دیتے چینی زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔

☆ ایک زود نویس ادیب سے کسی نے پوچھا، آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟ انھوں نے فرمایا یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔

☆ منظر علی خاں منظر کی ہر نئی کتاب کا بوجھ گناہوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا بلکہ اس پر کالم لکھنا پڑتا ہے۔

☆ یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے، ان پر اب انعامات ملتے ہیں۔

☆ ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جائیں، تو سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

☆ محقق اکرام چغتائی سے ہم نے عرض کیا کہ آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کروالی، اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے نہیں کی تھی۔

☆ جب نوٹ ادھر ادھر چھپتے ہیں، تو افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کتابیں ادھر ادھر چھپتی ہیں، تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔

☆ عطا الحق قاسمی کے سفرنامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ عطا تو سفر سے واپس آجاتے ہیں، لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

☆ راغب مراد آبادی کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

☆ جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

☆ اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے لاہور کے سپرد کر دیا گیا، حالانکہ اس شہر میں اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔

☆ افتخار عارف کو قاموس الاغلاط ضرور مرتب کرنی چاہیے۔ یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

☆ قمر علی عباسی کے کالم جس اخبار میں چھپتے ہیں، اس میں جرائم کی خبروں کے بعد یہی ایک پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

☆ آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے۔

☆ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں اگر صلح ہو گئی تو انور سدید کیا کریں گے؟ ان کے پاس تو مضامین نو کے انبار لگانے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

☆ علمی و ثقافتی ادارے علامتی نہیں، سچ مچ کے مزار ہیں جن میں علوم و فنون دفن کر کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا اور گورکنوں ہی کو اگلے گریڈ میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

☆ یہ احمد فراز کی سعادت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی

www.pdfbooksfree.pk

کام نہیں کرتے۔

☆ انیس ناگی بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں۔ ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

☆ عہد میر میں صرف دہلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔

☆ غزل کی صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں اگر انھیں بیان کیا جائے، تو چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چنگیز اور ہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی بھار تھک بھی جاتے تھے، غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

☆ عام ادبی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہم عموماً آنکھیں بند کر لیتے ہیں، لیکن کوئی تحقیقی مقالہ دیکھ کر آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔

خواجہ صاحب، دو شعرا رضی اختر شوق اور [illegible] اکبرآبادی کے ساتھ

☆ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

☆ جو شعرا کسی مروجہ صنف شعر میں کمال نہیں دکھا سکتے، وہ ہائیکو کے ذریعے صاحب کمال بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے مشفق خواجہ کے اسلوب کے بارے میں کیا خوب بات کہی تھی، وہ ادب دوست، لاہور کے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

رسالہ کتاب نما، دہلی میں مشفق خواجہ کا یہ جملہ ان کی ہر تحریر کے آغاز میں درج تھا

''خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا لطف اٹھایئے۔''

آخری سفر

اردو زبان و ادب کے اس محتسب اعلیٰ اور بقول شخصے ادیبوں کی آئی ایس آئی، مشفق خواجہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء، رات ساڑھے دس بجے کراچی کے آغا خان اسپتال میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا جنازہ ۲۲ فروری کو پی ای سی ایچ ایس کراچی میں واقع ان کی بڑی بہن کے گھر سے اٹھایا گیا۔ عصر کے وقت سوسائٹی کے قبرستان میں اپنے والدین کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

پرستاروں کی بڑی تعداد تدفین کے وقت موجود تھی۔ وہ علم و دانش کے پیکر کو سپردِ خاک کرنے آئے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، بعض پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں:

''نمازِ جنازہ کے لیے وضو کر کے آتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھا ''یار! اگر اب اردو اور ادب کے بارے میں کچھ پوچھنا پڑا، تو کس کے پاس جائیں گے؟''

مشفق خواجہ کا قطعہ تاریخ وفات ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کہا:

تھا بسکہ غنیمت دم مشفق خواجہ
کیسے نہ کریں ماتم مشفق خواجہ
بے سر ہوا علم اور بے پا تحقیق
ہاتف جو پکارا غم مشفق خواجہ

◆●●

www.pdfbooksfree.pk

پُراسرار کہانی

قبر کی ہولناک تاریکی سے

مُردے کا ٹیلی فون

وہ لالچ و ہوس میں ایسے اندھے ہوئے کہ عقل سے پیدل ہو کر
گورکنارے جا سوئے..... حیرت و اسرار کے پردوں میں لپٹی کتھا

سلیم راغب

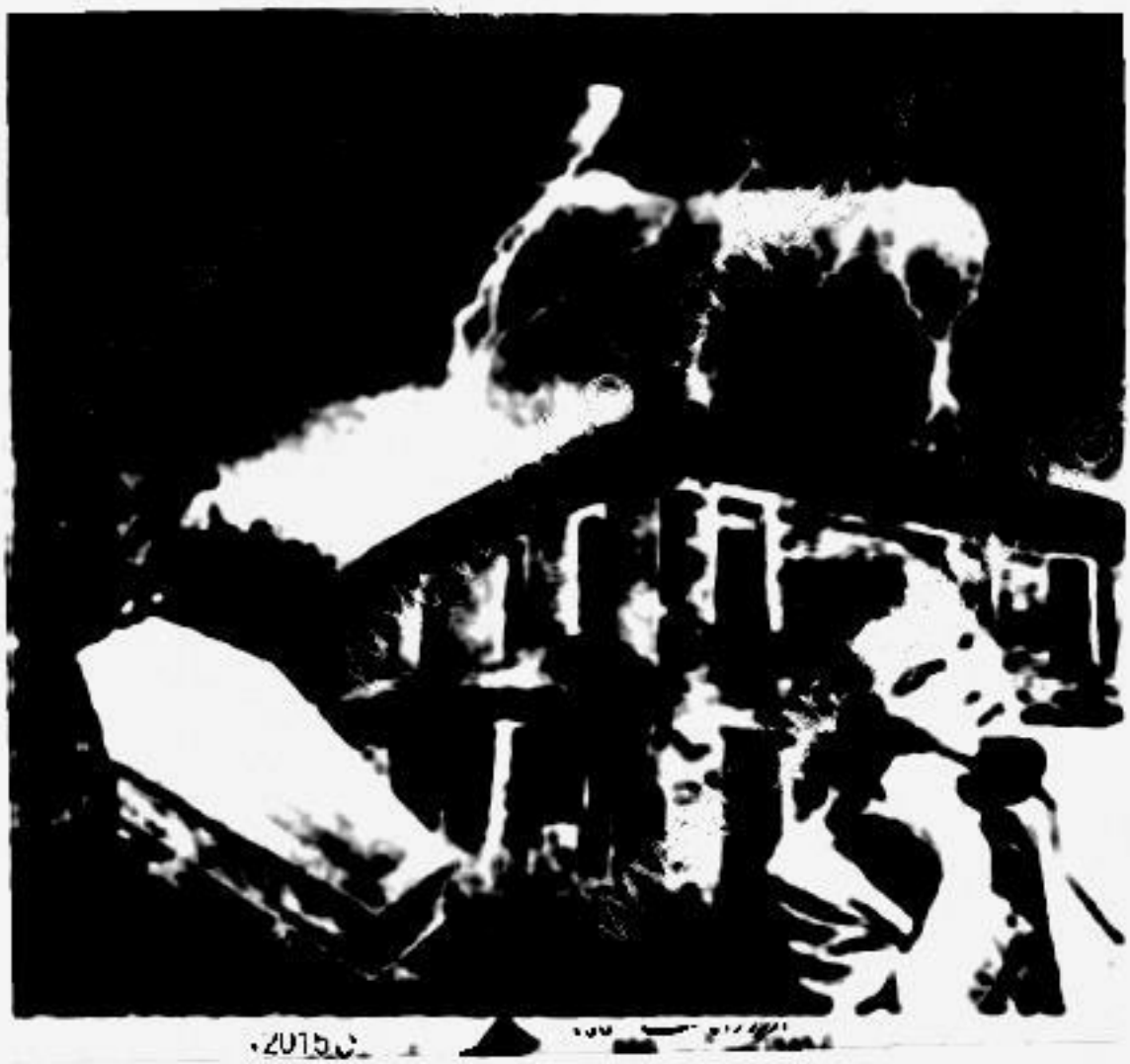

www.pdfbooksfree.pk

ہم منزل پر آ پہنچے۔"

"جمیلہ! کار جس ویران راستے پر رکی وہاں خودرو گھاس نے جھاڑیوں کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ بہادر نے آنکھوں میں تمام منظر سموتے ہوئے کہا

"یہ ہے وہ گھر جس سے میرے بچپن کی تمام اچھی اور بری یادیں وابستہ ہیں۔" وہ خاموشی سے دھند میں چھپے مکان کو گھورتا رہا، اور پھر بولا "میں چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا تھا اور آج، آج یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دوسرے جنم میں گھر کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ گھر؟" جمیلہ کی حیران آنکھیں اس پرانے کھنڈر نما مکان کو گھورنے لگیں جس کی منڈیریں ٹوٹی پھوٹی اور بوسیدہ ستون دیمک زدہ تھے۔ مکان کا نصف حصہ درختوں سے [illegible]

[illegible]

"بھول سکتا ہوں؟ یہ قصبے کا اختتام ہے۔ اس کے بعد آبادی ختم ہو جاتی ہے اور آگے صرف جنگل اور دلدلی زمین ہے۔" وہ بولا۔

اس نے بستر بند اٹھا کر اندر لے جانے کے لیے جمیلہ کو اشارہ کیا۔ اس نے بددلی سے اٹھا لیا۔ "مگر بہادر! مجھے یقین ہے کہ اس کھنڈر میں تمہاری وراثت کا کوئی پیسہ نہیں۔ لاحول ولا! بھلا اس جھوٹ بھیرے میں روپے پیسے کیا کام؟" وہ کہنے لگی۔

"مگر مجھے پا یقین ہے۔" بہادر کے پاؤں تلے سوکھے پتے [illegible]

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی، کیونکہ وہ تو مجھے مردہ سمجھے بیٹھی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔

بند کمرے میں عجیب سی گھٹن اور بو تھی۔ قدیم طرز کے شیشوں والے پلنگ، پرانی وضع کے طاق، فرسودہ پردے، کمرے کی ہر شے عہد پارینہ کا نشان تھی۔ دونوں بوڑھیوں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ خالہ بے نور آنکھوں سے انھیں گھور رہی تھی مگر اس کی ناتواں چچی نے بڑے سکون سے دریافت کیا۔ "تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

جبار نے اپنے بارے میں بتایا۔

وہ اسی طرح پرسکون لہجے میں بولی "جبار ... وہ ... وہ تو کب کا مر چکا۔ پانچ سال پہلے ایک ڈاکے میں دیہاتیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ستار نے یہ خبر خود اخبار میں سے پڑھ کر ہمیں سنائی تھی۔"

جبار ہنسا، بولا "چچی، یہ تو محض خوش فہمی ہے۔ دیکھ لیں آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ یہ جمیلہ ہے میری بیوی۔"

"آداب چچی۔" جمیلہ نے غیر یقینی لہجے میں سلام کیا۔

"ہوں۔" اس کی خالہ نے نہ دیکھنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

جمیلہ نے کچھ کہنا چاہا مگر چچی کی بات شروع ہو چکی تھی "جمیلہ میری بیوی۔" وہ اس کے لہجے کی نقل اتار رہی تھی۔ "ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔" جمیلہ نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر جبار نے اسے روک دیا۔ چچی کہے جا رہی تھی۔ "جمیلہ ہے تو خوبصورت مگر جادو گرنی ہے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ بھی مر چکی۔"

یہ سن کر جمیلہ کو تاؤ آ گیا، تنک کر بولی "مجھے مردہ کہنے سے تمھارا کیا مطلب؟ جبار! یہ تو پاگل ہے۔ یہ تم کس پاگل خانے میں لے آئے ہو مجھے؟"

مگر چچی نے جیسے کچھ نہ سنا ہو، وہ اسی پرسکون لہجے اور کھوکھلی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "جبار مر چکا۔ آج سے پانچ برس قبل ایک ڈکیتی میں مارا گیا تھا۔ بچی تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتیں کہ زندوں کے ساتھ زندہ اور مردوں کے ساتھ مردے رہتے ہیں۔ اگر وہ مر چکا، تو تم بھی مردہ ہی ہو نا۔"

جمیلہ وحشت سے پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبار نے کہا "چچی اب بس کرو اس ڈرامے کو۔ ہم دونوں زندہ ہیں اور تم دیکھ بھی رہی ہو۔"

"ہوں۔" خالہ جیسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔

چچی جیسے فتح پانے کے احساس سے چلائی۔ "اگر تم واقعی زندہ ہو، تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تمھیں یاد نہیں کہ آوارگی کی وجہ سے تمھارے باپ نے تمھیں گھر سے نکالا تھا۔ اور کیا تمھیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے کہا تھا، تم زندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ تو کیا تم یہاں دفن ہونے آئے ہو؟"

جبار ہنس کر بولا "چچی! میں نہ دفن ہونے آیا اور نہ تم زندہ جنازوں کو دفناتے۔ میں تو اپنی وراثت کی رقم لینے آیا ہوں۔" اس نے تمام تفصیلات بتائیں۔ "ستار مر چکا اور اب تمام دولت پر صرف میرا حق ہے۔"

خالہ خاموشی سے اپنی چندھی آنکھیں لیے خوفزدہ بلی کی طرح بیٹھی تھی۔ چچی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں! ستار مر چکا۔ تمھیں بھی ستار کی موت کا علم ہو گیا۔ ظاہر ہے، مرنے کے بعد اس کی تم سے ملاقات ہوئی ہو گی۔ اس نے وراثت کی رقم کے بارے میں بتایا ہو گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

اب جبار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، وہ چلا کر بولا "چچی! بیکار باتیں بند کرو۔ ہم تھکے ہیں اور بس کے سفر نے انجر پنجر ڈھیلا کر دیا ہے۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ خالہ تو جیسے اپنی جگہ دبک گئی۔ وہ بولا "ہم دوسری منزل کے کمرے میں جا کر ہاتھ منہ دھوتے ہیں اور اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔"

جبار نے سامان اٹھا لیا۔ چلتے چلتے ان کے کانوں میں چچی کی آواز آئی

"اب تو انھیں کھانا دینا ہی پڑے گا۔ اگر انھوں نے زندہ رہنے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے، تو بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن بیٹا کی اچھی خاصی شکل کی ہے یہ، جوانی میں کیوں مر گئی؟"

وہ دوسری منزل کے اس کمرے میں پہنچے۔ وہ دھول سے اٹا ہوا اور فرش پر بچھی دری پھٹی ہوئی تھی۔ دیواروں پر خاندان کے مرحومین کی تصاویر انھیں گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے بدتمیزی اور مسکراہٹ سے تمسخر عیاں تھا۔ بند کمرے کی گھٹن بو اور حبس سے سر میں درد کا احساس ہوتا تھا مگر کھانے اور آرام نے دونوں کی طبیعت کچھ بحال کر دی۔ جمیلہ کے اعصاب کا تناؤ بھی کم ہو گیا مگر مکمل طور پر نہیں کیونکہ ابھی تک وہ ذرا سی نامانوس آواز سے چونک اٹھتی۔ ملازم کی مرغابی کی چیخ یا اس کے جواب میں الو کی آواز سے اس کا دل دہل جاتا۔ وہ بولی "جبار! ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں مجھ پر تو ابھی سے دہشت طاری ہے۔ تم جانتے ہو کہ مجھے بند اور سیلن والے کمروں سے کتنی کراہت ہے۔"

وہ چمکار کر بولا "ہمیں صرف ایک رات ہی تو گزارنی ہے۔ صبح ہم ان سے اپنی رقم وصول کریں گے اور پھر اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ پولیس کو اس قتل کے سلسلے میں اب تک میری تلاش ہے۔ پچاس ہزار! میرے خدا! اس رقم سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جعلی پاسپورٹ بنوا کر ملک سے باہر جا سکتے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" جمیلہ غیر یقینی لہجے میں بولی۔ "مگر یہاں اتنی رقم کہاں ہو گی؟" وہ ایک مرتبہ پھر کپکپائی۔

"سب کچھ یہیں ہے۔" وہ اسے سمجھانے کے انداز میں گویا ہوا "میں نے تمھیں اپنے خاندان کے بارے میں جو کچھ بتایا، شاید تم نے اس پر غور نہیں کیا۔ میرے پردادا امیر علی خان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب ان کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو وہ تمام مال و متاع لے اس دورافتادہ علاقے میں آ گئے۔ اب تو یہ ایک خاندانی قصہ بن چکا۔ ریل، تار، ٹیلی فون اور بجلی سب بعد میں آئے یہاں۔ تمھیں اس زمانے میں یہ بالکل ویران تھا۔ بس جنگل اور دلدل۔ ان کے پاس لاکھوں روپے کا زر و جواہر ہو گا۔ گو ہمارے دادا اور اس کے بعد میرے باپ نے خاصی عیاشیاں کیں مگر مجھے یقین ہے، اس میں سے اب تک بھی بہت کچھ بچا ہو گا۔ ہمارے بزرگوں نے دولت کے معاملے میں کبھی کسی بینک پر اعتبار نہیں کیا۔"

> جمیلہ کے اعصاب کا تناؤ بھی کم ہو گیا مگر مکمل طور پر نہیں کیونکہ ابھی تک وہ ذرا سی نامانوس آواز سے چونک اٹھتی۔

"تمام دولت تمھاری چچی کے قبضے میں ہے اور یہ کھوسٹ بڑھیا تمھیں ایک دھیلا بھی نہ دے گی۔"

"وہ مجھے کیسے روک سکتی ہے؟" اس کے لمبے چہرے پر اب بھیڑیے کی سی خشونت اور مکاری تھی۔ "ضرورت پڑنے پر میں ان دونوں 'مرغیوں' کی گردنیں مروڑ بھی سکتا

www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

"قتل؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"اور کیا۔ قتل کیا، یہ تو دنیا سے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہوگا۔ ویسے بھی چچی اور میں نے کبھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا بلکہ یوں سمجھو کہ بارہ برس کی عمر سے ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ وہ میری سالگرہ کا دن تھا اور اسی دن میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہی دادا جنھوں نے اپنے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔"

"جبار!" جمیلہ چلا اٹھی۔

"خانم! گھبراؤ نہیں ہمارے خاندان سے ایسی بہت سی پراسرار روایات وابستہ ہیں۔"

"نہیں۔"

"ہاں جمیلہ! یہ حقیقت ہے۔ مثلاً میرے باپ نے اپنے تابوت میں ٹیلی فون رکھوایا تھا، حقیقی نہیں فون! وہ ٹیلی فون جو درست حالت میں ہو اور جسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ اس لیے کہ اگر وہ بھی تابوت میں کروٹ بدلے یا وہاں سے باہر نکلنا چاہے، تو اسے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔"

"کیا کہتے ہو؟"

"ہاں، ہاں! یہ سب کچھ اس کی وصیت میں تھا۔ ادھر کھڑکی کے قریب آؤ۔" اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ گھر کے چوطرف درختوں کی قطاریں تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر خشک زمین نے دلدل کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کے چاند کی مدھم روشنی میں خشکی اور پانی ملے جلے سے تھے۔ گھر سے سو گز کے فاصلے پر اس نیم دلدلی زمین پر ایک ننھی عمارت نظر آ رہی تھی۔

"یہ تابوت خانہ ہے۔" جبار نے عمارت کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ دونوں خوف زدہ سے خاموشی کے بوجھ تلے دبے اس تابوت خانے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ چرچراہٹ کے ساتھ اس کا دروازہ کھلا۔ جمیلہ نے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کو سرد لہر کے مانند محسوس کیا۔ تابوت خانے کے دروازے سے ایک دراز عورت نکلی جو اس بے نور چاندنی میں کسی بھٹکی روح کی پرچھائیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ گھر کی طرف ہی آ رہی تھی۔

"چچی صادقہ۔" جبار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مگر یہ اس وقت تابوت خانے میں کیا کر رہی ہے۔"

"تابوت خانہ!" جمیلہ نے کپکپائی آواز میں دہرایا۔

"ہاں، اس دلدلی زمین میں مردے دفن نہیں ہو سکتے، اس لیے یہ عمارت تابوت خانے کے طور پر بنوائی گئی۔ اسے تم نجی قبرستان ہی سمجھ لو۔ گو ہمارے خاندان ہی کے تمام لوگ یہیں دفن ہیں۔ پھر بھی خاصی جگہ باقی ہے۔ دراصل اس کے فرش کو آب رو بنایا گیا ہے۔"

دور بجلی چمکی جس سے ایک لمحے کے لیے یہ وحشت ناک منظر چمک گیا اور ساتھ ہی دور بادلوں کی گرج سنائی دی۔ چند ہی لمحوں میں چاند کا دیا بڑھتے سیاہ بادلوں میں بجھنے والا تھا۔ جبار بڑبڑایا۔ "طوفان آ رہا ہے۔"

کھڑکی سے ہٹ کر وہ دونوں پھر کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ جبار اسے بتانے لگا۔ "جب بارش آئے، تو دلدل میں پانی کی سطح ایک دو دنوں کے لیے اونچی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے اسی لیے اس مکان کی نیو بہت اونچی رکھی گئی۔ چناں چہ وہ پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ میں بارش کی وجہ سے اس گھر میں چند دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں۔"

"نہ جبار!" وہ گھبرا کر بولی۔ "میں اس گھر میں ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔"

"گھبراؤ نہیں، بھلا ہمیں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں تو میں تمھیں چچی صادقہ کے

www.pdfbooksfree.pk

بارے میں بتا رہا تھا۔ جب ہم اپنے دادا کو دفن کر کے آئے، تو چچی نے نکلنے میں دیر لگا دی۔ میں نے یہ سمجھ کر دروازے پر تالا لگا دیا کہ سبھی نکل چکے۔ گھر چونکہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھرا تھا، اس لیے اگلی صبح تک کسی نے چچی کی کمی محسوس نہ کی۔ اگلی رات کو چچی نے دادا کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا، تو انھوں نے اسے جواب بھی دیا۔ دادا نے التجا کی کہ وہ اسے یہاں سے نکلنے میں مدد دے مگر چچی نہ مانی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دادا مردہ ہے۔ اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

جمیلہ کا رنگ اڑ چکا اور ہونٹ زرد ہو رہے تھے۔ وہ حلق میں لعاب نگل کر بولی "تم ..."

جبار مسکرا کر بولا "یہ تو صرف مذاق تھا ابھی یہ قصہ پورا کہاں ہوا ہے۔ پہلے پہل تو کسی کو چچی کی بات پر یقین ہی نہ آیا۔ مگر پھر میرے والد کو کچھ تجسس ہوا چناں چہ سب نے مل کر تابوت کھولا، تو واقعی دادا کی نعش کروٹ کے بل پڑی تھی۔ یہی نہیں بلکہ منہ بھی یوں کھلا تھا گویا مدد کے لیے پکارتے پکارتے جان نکلی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی تھیں حتیٰ کہ ادھر ادھر گھر چنے کی وجہ سے انگلیوں کے ناخن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔

"خدا کے لیے جبار! کیوں میری جان نکال رہے ہو۔"

"جمیلہ! اس قصے کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ دراصل ہمارے آبا میں سے کسی کو سکتے کا مرض لاحق تھا، اس لیے امکان ہے کہ دادا کو بھی سکتہ ہوا ہو۔ اس بات سے میرے ابا بہت خوفزدہ ہوئے۔ چناں چہ انھوں نے پیش بندی کے طور پر اپنے تابوت میں ٹیلی فون لگوا لیا۔"

"جبار!" وہ کپکپا کر بولی۔

"سچ ہے یہ!" وہ زور دے کر بولا۔ "چناں چہ میرے ابا کو ان کی وصیت کے مطابق فون کے ساتھ تابوت میں ڈالا گیا تاکہ کبھی ان کی آنکھ کھل جائے، تو وہ مدد کے لیے لوگوں کو بلا سکیں۔"

"اف خدایا!"

"اچھا! چلو چھوڑو اس قصے کو، میں تو چچی صادقہ سے معاملے کی بات کرنے کا خواہاں ہوں، لیکن ٹھہرو! تجوری ابا کی تصویر کے پیچھے ہوتی تھی۔ دیکھیں، تو بھلا یہ اب تک وہیں ہے!"

اس نے جب دیوار کے پاس جا کر ایک تنومند، سرخ چہرے اور باہر کو نکلی آنکھوں والے شخص کی تصویر اٹھائی، تو تجوری کے پٹ وا ہو گئے۔ جمیلہ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ لیکن کھلی تجوری دیکھ کر خوف اور پریشانی کے احساسات ختم ہو گئے۔ جبار نے خوشی سے ہنستے ہوئے نقدی رکھنے والا ڈبا باہر نکال کر جب اسے توڑا، تو اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ وہ بے تابی سے اسے پڑھنے لگا۔ جمیلہ بھی بچوں کے بل اونچی ہو اس کے کندھے پر سے جھانک کر پڑھنے لگی۔ دونوں تحریر پڑھنے میں محو تھے اور سیاہ حروف گویا ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

> "اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

پشت پر چوبی تختے کی چرچراہٹ سنی، تو دونوں نے یکلخت گردنیں گھمائیں۔ دروازے پر چچی صادقہ کھڑی گھور رہی تھی۔ جبار چلا کر بولا "یہ کاغذ کہہ رہا ہے کہ ستار کے بعد تم ساری دولت کی وارث ہو۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ یہ میری دولت ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ بتاؤ وہ سب مال تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"جبار بیٹے! وہ سب محفوظ ہے بالکل محفوظ، اگر تم ایسے

www.pdfbooksfree.pk

ہی بے تاب ہو تو اسے تلاش کیوں نہیں کر لیتے۔"

"بے فکر رہو چچی! میں یہی کروں گا۔" ایک دو لمحوں تک دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر وہ بولا "اور ہاں! اتنی رات گئے تم تابوت خانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

"میں تمھارے بھائی ستار سے باتیں کرنے جاتی ہوں۔ وہ اپنی "ٹھنڈی قبر" میں تنہائی محسوس کرتا ہے۔ میری باتوں سے اس کی طبیعت بہل جاتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مردے خود تو چل کر آنے سے رہے۔ اسی لیے میں ہی اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

جمیلہ خوف سے کانپ رہی تھی مگر چچی صادقہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ "اسی طرح جیسے میں نے پہلے تمھارے دادا اور پھر ابا سے بات چیت کی تھی۔ جبار! تمھیں دادا والی بات تو نہ بھولی ہوگی؟"

جمیلہ دہشت سے چلا اٹھی۔ مگر جبار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ جبار سے پوچھ رہی تھی۔ "مگر بیٹے تم اتنی دولت کا کیا کرو گے؟ تم تو مردہ ہو اور بھلا مردوں کا دولت سے کیا کام؟"

اب وہ جھلا کر بولا "چچی! ختم کرو اس پاگل پن کو تم مجھے سختی پر مجبور کر رہی ہو۔ میں تمھیں کرسی سے باندھ کر جلتے سگریٹ کے کرشمے دکھاؤں گا، پھر میری زندگی کا یقین آئے گا تمھیں۔"

وہ اطمینان سے بولی "اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں دراصل اس وقت ستار کے پاس تمھارے ہی بارے میں مشورہ کرنے گئی تھی۔"

"اچھا؟" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"ہاں! اور اس نے کہا کہ تمھیں دولت کا بتانے میں کوئی حرج نہیں، آخر تم اپنے ہی تو ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ ذرا سے مر چکے۔"

وہ بے تابی سے بولا "کہاں ہے؟"

"تابوت خانے میں۔" وہ فاتحانہ لہجے میں بولی، "ہاں! ہاں! تابوت خانے میں ایسی جگہ پر جہاں کسی چور کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔ تابوت خانے میں جہاں اس خاندان کے تمام لوگ سو رہے ہیں۔ جہاں تمھارا دادا، باپ اور بھائی ہے اور جہاں تمھارے لیے بھی ایک تابوت تیار ہے۔ وہ دولت تمھاری خالی "قبر" ہی میں رکھی ہے۔"

جبار نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "پچاس ہزار روپے میری قبر میں۔ واہ! کیا خوب مذاق ہے چچی۔ ہاہاہا! جمیلہ اب تمھیں اندازہ ہوا کہ ہمارا خاندان کتنا پہنچا ہوا ہے۔ ہاہاہا!"

"جبار!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "خدا کے لیے رقم لو اور جلد از جلد اس پاگل خانے سے نکلنے کی کرو۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔"

"ہاں!" چچی نے کہا۔ "تمھیں یہ کام جلد کرنا ہوگا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی حصوں میں زبردست بارش ہو چکی ہوگی۔ دلدلوں میں پانی چڑھ رہا ہے۔ تابوت خانے کا فرش بھی درست حالت میں تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی، اب میں فرش پر ایک ایک انچ پانی دیکھ کر آ رہی ہوں۔"

"چچی! ہم جاتے تو ہیں لیکن یہ جھوٹ ہوا تو....."

"پگلے! مجھے مردوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت؟ تم بڑے ضدی ہو، بات مانتے ہی نہیں۔ اگر تم خود کو مردہ مان لو تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ ہم سب بڑے اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔ پھر میں، تم اور ہم سب خوب مزے سے گفتگو کیا کریں گے۔"

دولت کے تصور نے جبار کے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ چنانچہ اب اسے چچی کی باتوں پر غصہ نہ آیا بلکہ وہ ہنس دیا۔ جمیلہ نے بھی اس ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

www.pdfbooksfree.pk

جب گھر سے کلہاڑی اور ٹارچ لیے وہ تابوت خانے کی طرف جا رہے تھے، تو ان کے سر پر بادل ایک مرتبہ پھر گرجے۔ فضا تاریک تھی۔ تیز ہوا جیسے درختوں پر چابک برسا رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے زبردست بارش کا پیغام لا رہے تھے۔ تابوت خانے میں خاموشی اور گھٹن کے ساتھ ساتھ سیلن کی سردی بھی تھی اور ہوا جیسے مردہ جسموں کی بو سے بوجھل ہو۔ اس تاریکی میں ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔

اس بند جگہ جبار کی آواز گونجی اور اس کی گونج خوفناک تھی۔ جمیلہ تو ایک دم اچھل پڑی۔ "اس کے پیچھے ایک تہ خانے میں ہمارے بزرگ آرام کر رہے ہیں۔ اس کا راستہ پتھر کی ایک سل سے بند کیا گیا ہے۔ تم ذرا یہ ٹارچ پکڑو، میں اسے کھولتا ہوں۔"

وہ ایک کونے میں جھک کر دیوار کے ساتھ کچھ ٹٹولتا رہا پھر ہلکی سی "کلک" کی آواز آئی۔

> جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔

جب اس نے اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا، تو ایک مدھم شور سے گویا احتجاج کرتی سیاہ سل اوپر اٹھ گئی۔ نیچے تاریکی منہ پھاڑے جھانک رہی تھی۔ جبار نے سل پکڑ کے اوپر کر لی اور "کلک" کی دوسری آواز کے ساتھ سل اپنے بالائی خانے میں پیوست ہو گئی۔

ٹارچ کی روشنی تنگ اور پتلی سیڑھیاں ظاہر کر رہی تھی۔ نیچے تہ خانے سے متعفن اور سرد ہوا کے پہلے جھونکے ہی سے جمیلہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ منت کرتے ہوئے بولی "میں باہر رہتی ہوں، تم نیچے اتر جاؤ۔ اندر گھٹن اور سیلن ہو گی اور یہ مجھے ناپسند ہیں۔"

وہ تنک کر بولا "ذرا سی گھٹن سے مر نہ جاؤ گی، چلو! آخر ٹارچ بھی تو کسی نے پکڑنی ہے۔"

جبار نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا، تو اندر سے شوں کرتی کوئی چیز اس کے منہ سے چھوتی گزر گئی۔ جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔ چند لمحے دونوں خاموشی سے کھڑے کانپتے رہے۔ جبار کے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹارچ کی تھرکتی روشنی میں سیڑھیاں اور بھی ویران نظر آ رہی تھیں۔ اتنے میں ویسی ہی ایک اور چیز آئی، تو جبار نے دیکھا، وہ چمگادڑ تھی۔ وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اوہ اس کم بخت چمگادڑ نے تو جان ہی نکال دی۔" مگر جمیلہ خاموش تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ تھی۔

جبار نے پھر اترنا شروع کیا۔ جمیلہ نے اعصابی تناؤ اور خوف سے مارے مٹھیاں اس زور سے بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلیوں میں چبھ رہے تھے۔ وہ کانپتی ہوئی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے اترنے لگی۔ سیڑھیاں انھیں بالائی کمرے سے مشابہ کمرے میں لے آئیں۔ فرش پر وہ دو انچ پانی تھا جو سیاہ معلوم ہوتا۔ جمیلہ آخری سیڑھی پر رک گئی، بولی "میں اس سے نیچے نہ اتروں گی، میں یہیں سے روشنی کرتی رہوں گی۔"

"بہت اچھا" وہ ناگواری سے بولا اور ٹارچ اسے پکڑا کر کہنے لگا "چلو یہیں سے روشنی کرتی رہو۔ ادھر روشنی کرو۔ ادھر اور ادھر۔ اب ذرا دیکھو، تو۔" روشنی کے دائرے میں تابوتوں کے کتبے اور تعویذ چمک اٹھے۔ "یہ ہیں میرے پردادا اور یہ رہے میرے دادا جنھوں نے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔ یہ دیکھو ان کا کتبہ "عبدالغفار پیدائش ۱۸۵۲ء، وفات ۱۹۳۷ء۔" اور یہ رہا میرے والد کا تابوت۔ یہ ادھر، یہ ان کا کتبہ ہے "عبدالوہاب پیدائش ۱۸۸۵ء،

www.pdfbooksfree.pk

وفات ۱۹۳۵ء۔ اور یہ ہاں! یہی تو ستار کی قبر ہے۔ اور یہ ارے یہ کیا؟..... یہ خالی تابوت اور اس پر ایک کتبہ بھی ہے۔

''ارے!'' وہ ایک لمحے کو حیرت سے چپ رہا۔

جمیلہ گھبرا کر چیخی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، یہ میرے لیے ہے۔''

''تیں۔''

''ہاں! یہ قبر میرے لیے ہے بلکہ اس پتھر پر میرا نام بھی لکھا ہے۔''

''نام۔''

''ہاں! ہاں! یہ دیکھو۔ عبدالجبار پیدائش ۱۹۳۵ء..... وفات ۲۱ نومبر ۱۹۵۹ء۔'' وہ خود سے بولا۔ ''دیکھو چچی کی مکاری، یہ آج ہی کی تاریخ ہے۔''

''اف خدایا!'' جمیلہ جیسے کراہی۔

''معلوم ہوتا ہے شام وہ یہی لکھنے آئی تھی کیونکہ یہ کوکلے سے لکھا ہے۔ میں اس منحوس بڑھیا کے مزاج درست کر دوں گا۔''

''خدا کے لیے کام ختم کرو اور جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!'' وہ جیسے بے صبری سے بولا۔ ''میں بھی کس چکر میں پڑ گیا۔'' اس نے تابوت پر سے پتھر کی سِلیں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں اس کی تہ میں کھبی جا رہی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں واقعی نوٹ پڑے تھے۔ بہت سلیقے سے بنڈل قطار در قطار رکھے تھے۔ جمیلہ کی سانس تیز تھی۔ جبار بھی خاموش کھڑا گھور رہا تھا۔

بالآخر وہ بولا ''تو گویا چچی ٹھیک کہہ رہی تھی، مگر اب یہ سب کچھ کیسے لے کر جائیں گے؟'' پھر خود ہی جس کر اپنا کوٹ اتارا، اس کے بٹن بند کیے، بازوؤں کو گرہ دے کر کو ایک تھیلے میں تبدیل کر دیا اور جمیلہ سے مخاطب ہوا ''اب تم ادھر آ جاؤ اور اس میں نوٹ ڈالتی جاؤ۔''

''اوں اوں۔'' جمیلہ جیسے منمنائی۔

''شاباش!'' وہ خوشدلی سے بولا۔ ''ٹھنڈ سے نہ گھبراؤ، پچاس ہزار کے نوٹوں کی کافی گرمی ہوتی ہے۔''

کسی نامعلوم جگہ سے آنے والا پانی بتدریج بڑھ رہا تھا۔ جمیلہ نے کانپتے ہوئے سیاہ پانی میں پاؤں ڈالا، تو وہ اس کے ٹخنوں تک آ رہا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ شور کے ساتھ اوپر راستے کی سِل دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی۔ جمیلہ نے چیخ ماری جس کے جواب میں مردہ ہڈیوں ایسی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ چچی کی ہنسی سنائی دی۔

''چچی!'' جبار پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

وہ پانی میں سے شڑاپ شڑاپ کرتا گزرا اور سیڑھیاں چڑھ کر پوری قوت سے سِل اٹھانے لگا۔

''چچی!'' اب اس نے زور سے آواز دی۔

زور لگانے سے چہرہ سرخ ہو گیا اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ ''چچی! چچی!''

لیکن سِل اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

''چچی! خدا کے واسطے! چچی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر چلایا۔

جواب میں دوبارہ وہی ہنسی آئی جو اب بتدریج دور ہو رہی تھی۔ وہ دوبارہ چیخا ''چچی!''

مگر اب باہر خاموشی تھی۔ دور سے بادل گرجنے کی آواز آ رہی تھی اور فرش پر بڑھتے پانی کی۔

''جبار!'' اب جو جمیلہ بولی، تو اس کی کپکپاتی آواز محض ایک سرگوشی تھی۔ ''اس خبیث بڑھیا نے ہمیں یہاں بند کر دیا ہے۔ ان مردوں کے ساتھ۔ جبار اب ہم کبھی یہاں سے باہر نہ نکل سکیں گے۔'' وہ اب خوف سے چیخ رہی تھی۔ ''کبھی نہیں! جبار! کبھی نہیں۔''

اچانک وہ خاموش ہو گئی کیونکہ جبار ایک ہی جست

میں اس کے پاس تھا۔ اس نے دہشت کے عالم میں جمیلہ کو تھپڑ مارا اور پھر ایک اور، پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جمیلہ نے سکتے کے عالم میں اپنی انگلیوں سے گالوں کو چھوا۔ اس کی چپکیلی چتیں جبار پر مرکوز تھیں۔

وہ دھاڑا۔ ''بند کرو بکواس۔''

وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''چیخنے چلانے سے کچھ نہ بنے گا، وہ تنگی ہے۔ بعد میں ہمیں نکال دے گی، لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس کلہاڑی ہے۔ تم ٹارچ کو ٹھیک طرح سے پکڑے رکھو۔''

اس نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ کس پر کلہاڑیاں برسا رہا تھا، تو نیچے پانی کا شور اور بھی بڑھ چکا تھا۔ دو چار ہاتھ ہی مارے تھے کہ کلہاڑی کا پھل دستے سے نکل کر پانی میں جا گرا۔ جبار کے حکم پر جمیلہ پانی میں اسے تلاش کرنے لگی۔

''مجھے نہیں مل رہا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ''مجھے نہیں مل رہا جبار۔''

اب جبار خود بھی مغلظات بکتا اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ سرد پانی کو بھول چکا تھا۔ اپنی دھن میں مگن کسی گدھے کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل جھکا فرش ٹٹول رہا تھا۔

''چلو تم بھی جھکو۔'' وہ اب غضب ناک تھا۔ ''مجھے کوئی پروا نہیں کہ پانی کتنا سرد ہے نہ ہی مجھے مرنے ٹھنڈ لگنے کا ڈر ہے۔ زندہ باہر نکلنا ہے، تو اسے تلاش کرو۔''

بڑبڑاتی ہوئی جمیلہ بھی اس کے ساتھ پانی میں جھکی ہاتھوں سے پانی میں ٹٹولنے لگی۔ دونوں سرتاپا بھیگ چکے تھے۔ بالآخر جمیلہ کی ٹھنڈ سے سُن انگلیوں نے کلہاڑی کا پھل تلاش کر لیا۔ جبار نے جھپٹا مار کر پھل لیا۔ اب وہ سیڑھیوں پر

کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔

تھا۔ اس نے رومال میں پھل کا سرا لپیٹا اور لکڑی کے دستے میں ٹھونس کر نئی قوت سے سِل پر وار شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ سانس پھول گئی، پسینے میں شرابور اور تھکن سے چور ہو گیا۔

جب ہاتھ روک کر دیکھا، تو سِل پر ایک نشان بھی نہ تھا۔

''یہ تھی اچھی موٹی سِل ہے۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''تھی اچھی۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ جمیلہ کا گیلا لباس اس کے جسم اور منتشر بال اس کے گالوں سے چپکے تھے۔ جبار کا جسم اور چہرہ گندا ہو رہا تھا، مگر آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ پھر اچانک وہ قہقہے لگانے لگا۔ وہ ہنستا گیا اتنا زیادہ کہ اس کی ہنسی کسی پاگل کی چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ ایسے لگتا جیسے وہ ہنستا ہنستا نیچے لڑھک جائے گا۔ جب وہ خاموش ہوا، تو بولا ''ابا۔'' وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ ''ابا ابا۔''

''کیا ہوا؟'' جمیلہ چیخی۔

''ابا کا تابوت، میں تو بھول ہی گیا۔ وہ دیکھو! وہ دیکھو!'' وہ اسی وحشیانہ ہنسی کے ساتھ پانی سے ہوتا ہوا اپنے باپ کی قبر کی طرف گیا۔ ''تم بھی آجاؤ۔'' وہ چیخا۔ ''دونوں مل کر کھولتے ہیں۔''

''مگر کیوں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

وہ ہنس کر بولا ''فون۔ ٹیلی فون بھول گئیں۔ چلو ادھر آؤ! تابوت میں ٹیلی فون ہے۔''

دونوں پاگلوں کی طرح کلہاڑی سے تابوت کی سلیں ادھیڑتے رہے۔ آخر گھنٹوں کی مشقت کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ مردہ جسم کی بو اس پر مستزاد تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

جمیلہ کی آنکھیں بند تھیں۔ "دیکھو!" وہ فاتحانہ انداز سے چیخا۔

"میں نے کیا کہا تھا۔ یہ ہیں ہمارے پاگل بڈھے! میرا باپ زندگی میں مجھ سے نفرت کرتا رہا مگر اب وہی مجھے موت سے نجات دلائے گا۔"

اس نے چونگا اٹھا لیا۔ "کوئی پاگل ہی اپنی قبر میں فون رکھ سکتا تھا۔ ہم تھانے اطلاع دیں گے۔ پولیس ضرور ہماری مدد کو پہنچے گی۔ سارا قصبہ چچی کی حماقتوں سے واقف ہے۔" وہ بولا۔

"مگر اتنے طویل عرصے بعد تار میں ـــ"

مگر جبار نے اس کی بات کاٹی۔ "گھنٹی بج رہی ہے۔"

"کمال ہے۔"

"ہاں! ہاں! واقعی۔" وہ پرجوش آواز میں چلایا۔ "آپریٹر جواب دے رہی ہے۔ ہیلو! ہیلو!" وہ چلایا۔ "آپریٹر!" "کیا آپ میری آواز صاف سن رہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپریٹر! میں عبدالجبار بول رہا ہوں۔" اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا۔ "کیا تمھیں جگہ کا علم ہے؟"

"ہاں۔"

"مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ تھانے میں اطلاع کرائیں اور پولیس کو بتا دیں کہ میں اپنے خاندانی تابوت خانے کے تہ خانے میں بند ہوں۔ کیا تم سمجھ گئی ہو؟"

"ہاں۔"

"انھیں جلد آنے کی تاکید کرنا۔ ہم خاصی دیر سے اندر بند ہیں۔ ویسے بھی ہم صرف چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ تہ خانے میں پانی بڑھتا جا رہا ہے، جلدی کرنا۔"

"اچھا۔"

جبار نے ایک مرتبہ اسے پھر سمجھایا۔ "دیر نہ کرنا۔"

"اچھا۔"

اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے چونگا اپنے باپ کی نعش کے پاس رکھ دیا۔

وہ جمیلہ کو سمجھا رہا تھا۔ "بس ابھی پولیس پہنچ جاتی ہے۔ اتنی دیر تک ٹارچ کی روشنی بھی ختم نہ ہوگی۔ یہ بہترین ٹارچ ہے۔ اب خود پر قابو پائے رکھو۔ اس کے بعد دولت ہی دولت ہوگی۔ جان من! میں تمھاری ہر فرمائش پوری کروں گا۔ ساری عمر عیش و عشرت سے بسر ہوگی۔ بس کچھ دیر کے لیے صبر کر لو۔"

٭٭٭

موڑ کے قطعے پر شکستہ مکان میں چچی نے بڑی آہستگی سے چونگا ٹیلی فون پر رکھ دیا اور تھکی تھکی آواز میں کہنے لگی۔ "یہ جبار تھا۔ ابھی تک اسے مرنے اور دفن ہونے کے بعد والی زندگی کی عادت نہیں پڑی۔ باہر نکلنے کے لیے مدد طلب کر رہا تھا۔ اس نے مجھے آپریٹر سمجھ لیا۔ اب بھلا میں یہ ظلم کیسے کرتی کہ اسے یہ بتاتی، تم اور تمھاری بیوی مر چکے۔ اس لیے تمھارے باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے یہ امید دلا دی کہ لوگ ان کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ اس سے ان دونوں کا دل بہلا رہے گا۔ پھر جب کل پرسوں تک وہ واقعی خاموش ہو جائیں گے، تو میں ان سے گفتگو کروں گی۔ اب تو وہ اتنی افراتفری میں تھے کہ ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو سکی۔"

خالہ ارجمند بے نور آنکھوں سے چچی کو گھور رہی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور دلدل پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ چچی دھیمے سروں میں گنگنانے لگی

"میرے مولا، مدینے بلا لو مجھے۔"

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

نیکی اور اخلاق کے مرقع

پانچ عظیم پاکستانی

ان عام پاکستانیوں کا تذکرہ جاں فزا
جن کے دم قدم سے خیر و بھلائی کا بول بالا ہوا

حبیب اشرف صبوحی

پاکستانیات

کہا جاتا ہے انسان کو دو مواقع پر آزمانا چاہیے: جب وہ اقتدار میں ہو یا اس کے پاس دولت آ جائے۔ دیکھنا چاہیے کہ تب اس کا رویہ ماتحتوں، غریب رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ کیسا رہتا ہے۔ وہ اگر اعلیٰ عہدیدار ہے تو انصاف کے تقاضے پورے کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ دولت اور عہدہ آنی جانی چیزیں ہیں۔ صرف انسان کا اخلاق اور نیکی یاد رہ جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں کچھ کردار میری زندگی میں آئے جنھیں ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔

شریف النفس انسپکٹر

میں ایک ادارے میں بطور منیجر کام کر رہا تھا اور میری تعیناتی شیخوپورہ میں تھی۔ فاروق آباد، ننکانہ صاحب، شاہ کوٹ وغیرہ میں

www.pdfbooksfree.pk

ہمارے دفاتر تھے اور ان کی نگرانی بھی میرے ذمے تھی۔

ایک دفعہ مجھے اطلاع ملی کہ شاہ کوٹ کے دفتر میں رات کو ایک ڈاکو آیا۔ عملے کو یرغمال بنا کر ان سے نقدی و موٹر سائیکل چھینی اور فرار ہوگیا۔ واردات کی رپورٹ شاہ کوٹ تھانہ میں کرادی گئی۔ کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ مجرم موٹر سائیکل سمیت گرفتار ہوچکا اور پولیس کی تحویل میں ہے۔

چھان بین سے معلوم ہوا کہ انسپکٹر سے ملاقات کے بعد ہی دفتر کی موٹر سائیکل مل سکے گی۔ چناں چہ ایک روز میں اپنے ماتحت کے ساتھ شاہ کوٹ تھانے پہنچا۔ پہلے عملے سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ موٹر سائیکل صرف انسپکٹر کی اجازت سے ملے گی۔ پتا چلا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹا ان کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آئے تو ہمت کرکے ان کے کمرے تک گیا اور دستک دی۔

میرا خیال یہی تھا کہ میرا استقبال منفی جذبات سے ہوگا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا، لیکن جب انسپکٹر نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی تو مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اخلاقاً معذرت کی کہ ان کی نیند اور آرام میں خلل ڈال دیا۔ انھوں نے بڑے شائستہ طریقے سے بتایا "یہ میرا سونے کا وقت نہیں، آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اٹھا دیا۔ دیر تک سونے کی وجہ یہ تھی کہ میں ساری رات گشت پر تھا۔ اس لیے نیند پوری نہ ہوسکی۔ دوسرے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ کے عملے نے ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجرم کو گرفتار کرلیا ہے۔ یہ آپ کی احساس ذمے داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب آپ یہ مہربانی کریں کہ ہماری موٹر سائیکل واپس کروادیں۔

انھوں نے اس سلسلے میں کچھ تحریریں وغیرہ لکھوائیں اور بتایا کہ کل انشاءاللہ آپ کو موٹر سائیکل مل جائے گی۔ اس کے بعد ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ جب چائے آئی تو انھوں نے الماری میں سے مٹھائی کا ڈبا کھول کر رکھ دیا۔ میں نے معذرت کی اور بتایا کہ میں شوگر کا مریض ہوں، مٹھائی نہیں کھا سکتا۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی میز نکالی جس پر ایک پیزا رکھا تھا۔ کہنے لگے، اس سے تو انکار نہیں ہوگا؟

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب میں تھانے آیا ہوا ہوں یا کسی دعوت میں؟ میری آنکھیں اور کان گومگوں کی کیفیت میں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تھانے اور تھانیدار کا جو تصور ہے آپ اس سے ہٹ کر نظر آئے ہیں۔ کاش ہمارے ملک کی ساری پولیس آپ جیسی شائستہ اور فرض شناس ہوجائے تو تمام جرائم تقریباً ختم ہوجائیں۔"

وہ کہنے لگے "اچھے اور برے انسان ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس فانی دنیا کی حقیقت سمجھ لے تو برائی کا خیال اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہمیں اگلے جہان میں اپنے ہر قول و فعل کا جواب دینا ہے۔"

انسپکٹر کی باتیں اتنی دل نشیں تھیں کہ میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب میں نے ان سے نام پوچھا تو انھوں نے جو نام بتایا اس کے آخر میں "عاصی" (یعنی گناہ گار) آتا تھا۔ میں نے پوچھا کیا آپ شعر و شاعری کرتے ہیں کہ یہ تخلص رکھ لیا؟

کہنے لگے "میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت میں عاجزی اور انکسار پیدا کروں۔ اسی وجہ سے نام کے ساتھ "عاصی" کا اضافہ کرلیا۔"

www.pdfbooksfree.pk

بعد میں جب محلے سے انسپکٹر کے متعلق پوچھا تو سبھی نے بتایا کہ وہ انتہائی نیک دل، خدا ترس اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے والا افسر ہے۔ بدمعاش، چوروں اور اٹھائی گیروں کے لیے سخت گیر ہے۔ اپنے عملے کا بہت خیال کرتا اور ان سے عزت سے پیش آتا ہے۔ تمام عملہ اس سے بہت خوش ہے۔ میں اس انسپکٹر کی شخصیت اور کردار کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ایمان دار چیف انجینئر

چند سال قبل ہمارے محلے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور بتایا میٹر ریڈر نے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ آپ سب لوگ ایک ہزار روپے مہینا مجھے دیا کریں تو آپ کو بجلی کا بل آدھا آیا کرے گا۔ میں نے پڑوسیوں سے معذرت کی اور کہا کہ میں آپ کی اس غیر قانونی حرکت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ایک دو دفعہ مزید کہلوایا لیکن میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ اس پر مجھے میٹر ریڈر کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے کہلوایا کہ میں نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔

کچھ عرصہ بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ دو ماہ کے لیے کراچی چلا گیا۔ واپس آیا تو ایک روز محکمہ بجلی کا آدمی آیا اور کہنے لگا "آپ کا میٹر بہت آہستہ چل رہا ہے اور دو ماہ سے آپ کا بل بہت کم آ رہا ہے۔"

میں نے اُسے بتایا کہ ہم لوگ کراچی گئے ہوئے تھے۔ آپ محلے والوں سے پوچھ لیں۔ دفتر والوں سے بھی تصدیق کروا دیتا ہوں کہ میں لاہور نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے چھاپہ مارا ہے اور آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بجلی چوری کرتے ہیں۔ وہ یہ پیغام دے کر چلا گیا۔

دوسرے روز محکمے کی طرف سے ایک خط آیا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے آپ کے گھر چھاپا مارا تھا۔ آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی پائی گئی۔ لہٰذا آپ کو ۱۸۰۰۰ روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ یہ نوٹس دیکھ کر میں بہت تلملایا۔ محکمہ کے ایس۔ ڈی۔ او سے ملا اور ساری صورت حال سمجھائی لیکن اس نے بے بسی ظاہر کی اور کہا کہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ رقم بھرنی پڑے گی۔ میں ایکسین سے ملا تو انھوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔

آخر میں چیف انجینئر کے پاس چلا گیا۔ انھیں گزشتہ پانچ سال کے بجلی کے بل دکھائے اور بتایا کہ میرا خاندان صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ میرے گھر دو میٹر لگے ہوئے ہیں۔ ہم بہت محتاط طریقے سے بجلی استعمال کرتے ہیں۔ اب ہم پر میٹر کی سیل توڑنے کا الزام لگا کر ۱۸ ہزار روپے جرمانہ کر دیا گیا جو سراسر ناانصافی ہے۔

> آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو تنگ کرتے ہوں گے۔ یہ آپ کی سزا ہے۔

انھوں نے تمام باتیں تفصیل سے سنیں۔ اس کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کے تمام عملے کو بلوا لیا اور انھیں کہا "میں نے ساری بات سن لی۔ ان پر ۱۸ ہزار کا جرمانہ سازش کے تحت ڈالا گیا ہے۔ یہ جرمانہ آپ لوگ دیں گے، یہ صاحب نہیں۔" پھر خاص طور پر میٹر ریڈر سے کہا کہ آدھا جرمانہ آپ دیں اور باقی آدھا جرمانہ عملہ مل کر دے۔ یہ فیصلہ سُن کر وہ لوگ بہت پریشان ہوئے۔ جب ہم باہر نکلے تو وہ مجھ سے معافیاں مانگنے لگے۔

میں نے کہا کہ یہ فیصلہ آپ کے افسر نے کیا ہے۔ میں جس طرح پریشان رہا ہوں، آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو

www.pdfbooksfree.pk

تنگ کرتے ہوں گے۔ آپ کی سزا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی یونین والے آگئے اور منت سماجت کرکے کہنے لگے کہ آپ چیف انجینئر سے کہہ کر مسئلہ ختم کروائیے۔ وہ آپ کی سفارش ضرور مانیں گے۔ آخر میں چیف انجینئر سے پھر ملا اور کہا کہ وہ اپنی غلطی مان گئے ہیں۔ اب ان پر نظر کرم کیجیے۔

انھوں نے متعلقہ لوگوں سے تحریر لکھوائی کہ آئندہ ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم اپنا کام ایمانداری اور محنت سے کریں گے۔ تب انھوں نے جرمانہ معاف کر دیا۔ چیف انجینئر کا نام رانا محمد اسماعیل تھا۔ ایسے نیک لوگوں کا وجود صارفین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس شخصیت کا میں احسان مند ہوں اور ان کی نیکی کبھی نہیں بھول سکتا۔

نذر سے بے نیاز پیر

میں اپنے دفتری کام کے سلسلے میں ایبٹ آباد مقیم تھا۔ میرے ایک ساتھی جو پیروں اور فقیروں کو ماننے والے تھے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے "ہری پور میں ایک پیر صاحب کی نیکی و پارسائی کے واقعات زبان زد عام ہیں۔ ان کے پاس پاکستان کے صدر غلام اسحاق خان مع اہل خانہ بھی آتے تھے۔ ان سے ملا جائے۔

چناں چہ ایک روز راولپنڈی جاتے ہوئے راستے میں ہم نے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے ان کے پیر خانے تک پہنچ گئے۔ بہت بڑے احاطے میں پیر خانہ تھا۔ جب ہم گاڑی سے اترے تو ان کا ایک ملازم بھاگا ہوا آیا اور کہا کہ آپ کس سے ملنا ہے اور کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا کہ ایبٹ آباد سے آئے ہیں اور پیر صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ پیر صاحب کا حکم ہے کہ جو کوئی بھی آئے، پہلے اسے کھانا وغیرہ کھلاؤ اور اس کے بعد مجھ سے ملواؤ۔

ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں پانی وغیرہ لے کر آیا اور کہا کہ آپ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں، میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ اور آگئے۔ انھیں بھی ہمارے ساتھ بٹھایا گیا۔ دسترخوان بچھا تو اس پر گوشت اور سبزی کا سالن چن دیا گیا۔ دونوں سالن تازہ پکے ہوئے تھے۔ جلد گرما گرم روٹیاں بھی آگئیں۔ کھانا بڑا ذائقے دار تھا۔ کھانے کے دوران کچھ لوگ اور آگئے۔ وہ بھی شامل طعام ہوئے۔ کھانے کے بعد حلوہ پیش کیا گیا اور آخر میں سبز چائے۔

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب کے ملازم نے کہا کہ اب نماز ظہر کا وقت ہو چکا۔ آپ سب لوگ مسجد پہنچیں۔ پیر صاحب وہیں آئیں گے۔ اسی احاطے میں ایک خوبصورت مسجد واقع تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ پیر صاحب نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی، پھر سب سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔

نماز کے بعد سب لوگ پیر صاحب سے ملنے ان کے کمرے میں گئے۔ کمرا بالکل سادہ تھا۔ جب سب لوگ آگئے تو پیر صاحب نے مختصر سی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ عزت اور وہی ذلت دیتا ہے۔ اس کی ذات سب کی مشکل کشائی کرتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اجتماعی دعا مانگی جو بڑی رقت آمیز اور دل نشین تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اپنے مسائل مختصر ترین الفاظ میں بتائیے۔ وہ فرداً فرداً سب کو بلاتے، نماز کی تلقین کرتے اور اللہ کا کلام بتاتے کہ یہ پڑھیے۔ کسی کو کوئی مشورہ دینا ہوتا تو وہ بھی دیتے۔

مجھے سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا کہ ان

www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے نہ تو کوئی صندوقچی رکھی ہوئی تھی کہ نیاز یا نذرانہ اس میں ڈالا جائے اور نہ وہ کسی سے کوئی رقم لیتے تھے۔ بلکہ واضح الفاظ میں جگہ جگہ لکھا تھا ”یہاں نذر اور نیاز دینے کی کوشش نہ کریں۔“ میں نے زندگی میں پہلا ایسا پیر دیکھا جو ان تمام چیزوں سے مستثنیٰ تھا۔ ورنہ بیشتر پیروں کا یہ اصول ہوتا ہے کہ آؤ گے تو کیا لے کر جاؤ گے تو کیا دے کر!؟ میں یہ کردار بھی نہیں بھول سکتا۔

غریب دوست صنعت کار

کچھ عرصہ قبل اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ لاہور کے ایک پسماندہ علاقے بدامی باغ میں ایک صنعت کار نے واٹر منرل پلانٹ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے لگایا ہے جس کا مقصد لوگوں کو صاف شفاف پانی مہیا کرنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ لوگ ان تمام بیماریوں سے بچ سکیں جو صاف پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ یہ پانی بغیر کسی معاوضے کے صبح تا شام ملتا ہے۔

خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ لوگوں کو واٹر کین کے کنستر بھی بالکل مفت مہیا کیے گئے ہیں تاکہ پانی لے جانے میں آسانی ہو۔ اس صنعت کار نے اپنا نام پوشیدہ رکھا۔ بجلی جانے کی صورت میں دو عدد بڑے جنریٹر بھی لگائے گئے تاکہ آنے والوں کو پانی لینے میں دشواری نہ ہو۔

خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ صنعت کار نے پہلے وہاں کے اہل ثروت لوگوں سے مدد مانگی لیکن جب کسی نے تعاون نہ کیا اور کوئی دلچسپی نہیں لی تو انھوں نے تنہا ہی اس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ پلانٹ جدید ترین مشینری سے مزین ہے۔

پلانٹ پر جو عملہ دن رات اس کام میں مصروف ہے، وہ بھی خدمت خلق کے جذبے سے عوام الناس کی خدمت کر رہا ہے۔ میرے ایک دوست اس محلے میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ پلانٹ ہمارے علاقے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم اس صنعت کار کا احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔

اتفاق سے کچھ عرصہ قبل اس علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ پانی لینے والوں کی پرسکون قطاریں لگی ہیں اور لوگ بڑے اطمینان سے پانی بھر رہے ہیں۔ اس صنعت کار سے بھی ملاقات ہوئی جن کا نام محمود رمضان چشتی ہے۔ وہ بہت مخیر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لاہور میں دو اور جگہوں پر ایسے پلانٹ لگا رہے ہیں: ایک جوڑے پل پر اور دوسرا عیسائیوں کی بستی، یوحنا آباد میں۔

جوڑے پل پر پلانٹ کے لیے ۳۲ لاکھ روپے کی زمین خریدی جا چکی اور وہاں پانی کے لیے بورنگ ہو رہی ہے۔ یوحنا آباد میں چند ہفتوں تک کام شروع ہو جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں کسی نیک کام کا ارادہ کروں تو اللہ تعالیٰ میری مدد کرتا اور مجھے غیبی امداد ملنے لگتی ہے۔

میں اس شخصیت سے بہت متاثر ہوا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا ”خدمت خلق“ ہے۔

کراچی کا بے نام مخیر

چند سال قبل میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ کراچی میں ایک شخص نے اپنے دو بنگلے جو ڈیفنس میں واقع ہیں اور جن کی مالیت میں کروڑ روپے ہے، ایدھی ٹرسٹ کو تحفتاً دے دیے اور کہا ہے کہ اس کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ بعد میں بنگلوں کی تصاویر اخبارات میں آئیں اور ان کی تفصیل بھی۔ ان بنگلوں میں جدید ترین آرائش کی گئی ہے۔ اس کے فرش ٹیک کی لکڑی کے ہیں اور تمام درآمدی سامان لگا ہوا ہے۔

حکم یہ ہے کہ اللہ کے نام پر وہ چیز خیرات کرو جو تمھیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ عظیم اور یادگار ہیں ایسے لوگ جو ”خدمت خلق“ کا جذبہ رکھتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

دور جدید کا انوکھا دھندا

تہمت لگا، پیسا کما

ایک بیروزگار اپنا ضمیر مار کر عجب انداز میں روکڑا کمانے لگا

کنہیالال کپور

ہمارا خیال ہے، آپ ہم سے غائبانہ طور پر متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہو گا۔ آخر ہم بھی کوئی معمولی انسان نہیں، ہفتہ وار "تہمت" کے ایڈیٹر ہیں۔

ہم نے یہ اخبار کیوں نکالا؟ یہ مت پوچھیے۔ نہایت دردبھری داستان ہے۔ بی۔ اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپراسی تک کی نوکری دینے سے انکار کیا، تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ہفتہ وار "تہمت" کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا، تو اب تک ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب گھوڑا گاڑی ہی غنیمت ہے۔ ان شاء اللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی۔

ہمارے اخبار میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خرابی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگا یا چپکا دو۔ آخر ذات خد کے علاوہ کون عیوب سے مبرا ہے؟ بڑے سے بڑے دیش بھگت کو بگلا بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ صاحب جنھوں نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے، ان کے متعلق لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود یتیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی پھیلاتے ہیں، تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔ اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہما مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے، تو اس ضمن میں عرض

www.pdfbooksfree.pk

ہے، ہم واعظ ہیں نہ ناصح۔ ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر سمجھدار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجیے۔ اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں، سیکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر احساس جرم سوار رہتا ہے۔ جنھیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہی لوگ ہمارے ان داتا ہیں کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔ آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سرخی چھاپی: "شہر کے معزز ترین رئیس کی کارستانی۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر۔" اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے، ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار، منیجر اور ایڈیٹر بھی ہیں) ہاں تو ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ حالانکہ اس کی آمدنی دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔ سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ بڑا بیٹا بھی شامل ہے۔ ممکن ہے، اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو۔ مزید انکشاف کی توقع ہے۔

جس دن یہ خبر چھپی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ایک درجن روسا اخبار "تہمت" کے دفتر میں (جو ہمارا فسل خانہ بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے آ پہنچے۔ لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو معزز ترین سمجھتا تھا۔ قریب قریب ہر ایک نے منت سماجت کے لہجے میں درخواست کی "ہم اس کا نام اور پتا اخبار میں شائع نہ کریں نہیں تو غضب ہو جائے گا۔"

اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کا معاوضہ طلب کرتے، ہر کسی نے بڑی شرافت سے معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے یعنی اخبار "تہمت" کے ہاتھ میں ہے۔

دو ہفتے قبل کا ذکر ہے، ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی "نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش۔" دو کالمی اس چٹ پٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا "محض اس لیے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لائی تھی، جبکہ ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین تفصیل کا انتظار کریں۔"

یہ خبر پڑھ کر ایک معزز صاحب ہانپتے کانپتے وارد ہوئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہنے لگے "ایڈیٹر صاحب! خدا کے لیے اس قصے کی تفصیل چھاپنے سے احتراز کیجیے نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا۔ اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لائی ہے، تو میں اسی پر قناعت کر لوں گا۔

ہم نے کہا "یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن آپ کو معلوم ہے، جب اخبار "تہمت" اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں نا یعنی"

"جی ہاں! میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پچاس ہزار روپے کی حقیر رقم حاضر ہے۔ اگر یہ کافی نہیں تو کچھ اور۔"

www.pdfbooksfree.pk

"بس پچیس ہزار روپے اور بھجوا دیجیے، معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔"

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس قصے کی مزید تفصیل پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا؟ تو صاحب، وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا "چوہے مارنے کی دلچسپ مثال۔"

"پنسلین کے بجائے پانی کے ٹیکے۔" دوسرے کی سرخی تھی "قیمہ چھپرانے کے لیے افیم کی گولیوں کا استعمال۔" ظاہر ہے کہ جب قارئین ایسے چٹخارے دار خبریں پڑھتے رہیں، تو وہ ساس اور بہو کے جھگڑے میں کیوں دلچسپی لیں گے! اپنے خاص الخاص نامہ نگار (یعنی اپنی) کی وساطت سے ہم نے ایک ڈاکٹر کی خباثت کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھا کہ وہ مریضوں کو پنسلین کے بجائے پانی کے ٹیکے لگاتا ہے۔ ہم نے حکومت سے معاملے کی فوری تحقیق کر کے بدبخت ڈاکٹر کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ موخر الذکر خبر میں ہم نے ایک یونانی حکیم کی قلعی کھولتے ہوئے بتایا کہ وہ قیمہ چھپرانے کے لیے افیم کی گولیوں کو کشتوں کے بجائے کس طرح استعمال کراتا ہے۔ اب آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اور حکیم معاملے کو رفع دفع کرنے کی خاطر ہمارے پاس پہنچے اور کس کس چیز کا واسطہ دے کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم ان کے تجارتی راز فاش کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ ہم نے انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ "تہمت" کے بھونچال فنڈ میں تین تین سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ "تہمت بھونچال فنڈ" ہماری جدت اور ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس "بھونچال" کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا دولت کمانے کا طریقہ! آپ کی دعا سے ایسا دماغ پایا ہے کہ ہر روز نئی نئی سرخیاں سوجھتی ہیں۔ قارئین کو سنسنی خیز خبریں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ چکا کہ اخبار ملنے میں دیر ہو جائے تو کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہے جیسا ہونا چاہیے۔ آخر "تہمت" کے علاوہ کون سا اخبار ہے جو انھیں اس پائے کی سرخیاں دے سکے؟ ایک کمسن پروفیسر کا تیسرا معاشقہ ... بوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی کا پراسرار فرار ... خادمہ سے محبت کرنے کا شاخسانہ، وغیرہ وغیرہ۔

ہم جانتے ہیں، آپ کے ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہے کہ ہمارا ضمیر یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دیتا ہے؟ تو صاحب اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم ضمیر کو خدا بخشے، ہمیں مدتوں سمجھاتا رہا۔ ہم نے اس کی باتیں صرف ایک کان سے سن کر فراموش کر دیں۔ اب وہ تو آرام سے گزر رہی ہے۔

ویسے منطقی نکتہ نظر سے دیکھا جائے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ ضمیر کی ضرورت سے زیادہ پروا کریں، عموماً بزدل ہونے کے علاوہ تنگدست بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے، ہم پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی اور ہم نے دین و دنیا میں سے موخر الذکر کا انتخاب کیا ہے۔ صاحب ہمارا تو تجربہ ہے کہ آدمی ضمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ آپ کے مرنے پر سنگ لحد پر یہ شعر کھدوا دیا جائے گا:

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے، ہم سو کر چلے

اچھا صاحب تو یونہی سہی، مگر کم از کم آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اتنے اچھے شعر کا! ہماری مانیے تو لوگوں کو یہ شعر گنگنانے دیجیے اور خود سکون سے قبر میں آرام کیجیے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ملی شاعر، مفکرِ اسلام اور **علامہ** مصورِ پاکستان ہیں۔ انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی، عالمِ اسلام تباہ حال تھا۔

اپنے فاضل استاد، مولوی سید میر حسن کی فکری راہنمائی میں انھوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا مطالعہ کیا اور ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت زار کو دیکھ، تو گہرا تاثر لیا۔ انھیں مبدأ فیض سے سخن فہمی اور شعر گوئی کا وافر حصہ عطا ہوا تھا جسے انھوں نے ملت کی ترجمانی، اتحادِ امت، اسلامی فکر اجاگر کرنے، مغربی فکر اور فرنگی سامراج پر تنقید، مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے جگانے اور انھیں ملی شعور سے آشنا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔

علامہ اقبال نے دیکھا کہ کریمیا، چیچنیا، ہندوستان، عدن (یمن)، ترکستان، انڈونیشیا، ملایا، الجزائر اور دیگر کئی اسلامی خطوں پر یورپی مسیحی اقوام قابض ہو چکی ہیں اور مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کھو چکے۔ اس کا اقبال کو بڑا قلق تھا۔ وہ ''یادِ ایامِ سلف'' سے اپنا دل تڑپاتے تھے اور ''تصویرِ درد'' میں تمام عالمِ اسلام کا درد ان کے اس شعر میں سمٹ آیا:

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا!
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

علامہ نے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کی فکر کرنے، فرقہ آرائی اور تعصب سے بچنے اور ''راہِ عمل میں گامزن'' ہونے کی تلقین کرتے ہوئے انتباہ کیا:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

شعرِ اقبال راہنمائے ملت ہے

''بانگِ درا'' سے ولولہ انگیز اور سیرت ساز اشعار کا خوبصورت انتخاب

محسن فارانی

www.pdfbooksfree.pk

اقبال کے نزدیک "قوم رسول ہاشمی ﷺ" کی بنیاد عقیدۂ توحید اور دین اسلام ہے، چناں چہ وہ وطنیت (نیشنلزم) کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بذریعہ بحری جہاز انگلستان روانہ ہوئے۔ بحیرۂ روم کے اطالوی جزیرے، سسلی (صقلیہ) کے قریب سے گزرے، تو وہ بے اختیار وہاں کے اسلامی دور (۸۲۷ء تا ۱۰۹۱ء) کی یاد میں تڑپ اٹھے اور کہنے لگے۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
نغموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

مغرب کے یہود و نصاریٰ کو شاعر قوم نے یوں انتباہ کیا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

علامہ اقبال وطنیت اور قوم پرستی کے شدید مخالف تھے۔ وہ اسے "بت تراشیدۂ تہذیب نوی" اور "غارت گر کاشانۂ نبوی" قرار دیتے۔ ان کے نزدیک وطنیت کا پیرہن مذہب کا کفن ہے، فرماتے ہیں۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

"خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں علامہ اقبال "نوجوان مسلم" کو غور و تدبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں، تو دل ہوتا ہے سیپارا

انہی دنوں مصطفیٰ کمال پاشا نے ملت اسلامیہ کی وحدت کی علامت عثمانی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس پر اقبال نے بڑی دردمندی سے کہا۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

طویل نظم "شکوہ و شاعر" میں علامہ نے مسلمانانِ ہند کے ہندوانہ رسوم اپنانے پر یوں دکھ کا اظہار کیا

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اگلے بند میں قوم کو اتحادِ ملت کی اہمیت اور ضرورت کا

www.pdfbooksfree.pk

احساس دلاتے ہیں۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

آخری بند میں وہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہونے کا منظر یوں دکھاتے ہیں۔

آملیں گے سینہ چاکان وطن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

توحید اور اس پر کاربند رہنا کلام اقبال کا خاص موضوع ہے۔ وہ نظم "مسلم" (جون ۱۹۱۲ء) میں کہتے ہیں۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

علامہ اقبال تصور میں رسالت مآب ﷺ کے حضور جا پہنچتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پوچھتے ہیں "ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے آئے؟" اقبال عرض کرتے ہیں "حضور! ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی

بادشاہی مسجد لاہور کے مجمع میں اقبال نے جب یہ شعر پڑھا، تو لوگ چونک اٹھے کہ بھلا وہ کیا شے ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔ علامہ نے پھر نہایت دلسوزی سے یہ شعر پڑھا

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

راوی لکھتے ہیں کہ اس شعر پر حاضرین دھاڑیں مار مار کر رونے اور دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے کہ انہی دنوں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر قبضہ کرنے کے لیے وحشیانہ فوجی قوت استعمال کرتے ہوئے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔

علامہ اپنی شہرۂ آفاق نظم، جواب شکوہ کے ایک بند میں فرائض دین کی پابندی اور اتحاد ملت کا سبق یوں دیتے ہیں۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضان بھاری ہے
تمھی کہہ دو کہ وفاداری ہے!
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

فرقہ بندی اور ذات پات کے افتراق اور قبر پرستی سے نجات پانے کی اس طرح تلقین کرتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال نہایت دردمندی سے مسلمانوں کو اغیار کے طور طریق اپنانے سے باز رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

وہ ہمارے "سراپا کردار" اسلاف کا موجودہ "سراپا

www.pdfbooksfree.pk

گفتار" مسلمانوں سے تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اگلے اشعار میں "ابراہیمی ایمان" رکھنے اور "نورِ توحید" کو دنیا بھر میں پھیلانے کی تاکید کرتے ہوئے فرمانِ الٰہی ان الفاظ میں سناتے ہیں۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے عالمِ اسلام پر مسلط شدہ مغربی نظامِ تعلیم کے مضر اثرات سے نجات پانے پر یوں توجہ دلائی۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم!
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

۱۹۱۲ء ہی میں اقبالؒ نے "فاطمہ بنت عبداللہ" نامی مجاہدہ پر نظم لکھی جو معرکۂ طرابلس (لیبیا) میں غازیانِ اسلام کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ اس میں کہتے ہیں۔

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

فردوس میں ایک مکالمہ" میں اقبالؒ جدید مغربی تعلیم کے منفی پہلو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
باقی نہ رہا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

"بانگِ درا" کی طویل نظم "خضرِ راہ" میں خضر کی زبانی اقبالؒ نے مروجہ جمہوری نظام پر شدید تنقید کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

جب علامہ نے یہ نظم لکھی، وہ جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ـ۱۹۱۸ء) کا زمانہ تھا۔ ترکی جرمنی کا حلیف تھا اور انگریز جاسوس لارنس آف عریبیا نے شریفِ مکہ حسین بن علی ہاشمی اور اس کے بیٹوں عبداللہ، فیصل اور زید کو ترکی کے خلاف غداری پر آمادہ کر لیا جس کے نتیجے میں ترکوں کو حجاز، فلسطین، اردن، شام اور عراق خالی کرنے پڑے اور ان پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کر لیا۔ البتہ حجاز میں غدارِ ملت حسین ہاشمی کی بادشاہت قائم ہوئی۔ اس پر اقبالؒ نے "خضرِ راہ" میں کہا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

www.pdfbooksfree.pk

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

خضر نے اقبال کو "رازِ دوامِ زندگی" بتاتے ہوئے کہا۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ!
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

خضر "میراثِ خلیل" یعنی بیت المقدس (فلسطین) پر برطانوی صلیبیوں کے قبضے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

ان ناساز گار حالات میں خضر نے مسلمانوں کی نجات کا جو گر بتایا وہ آج بھی اُمت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

"بانگِ درا" کی آخری طویل نظم "طلوعِ اسلام" میں علامہ نے مردِ مسلماں کو تلقین کی ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
بُتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

سنہری باتیں

☆ اے ایمان والو! تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔
☆ بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔
☆ اپنے رب سے گڑگڑا کر چپکے چپکے دعا کرو۔
☆ ہمیشہ انصاف کی بات کرو چاہے تمھارے کسی عزیز کو نقصان نہ پہنچ جائے۔
☆ تم نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
☆ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔
☆ مسلمانو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

(ماریہ ملک، لاہور)

www.pdfbooksfree.pk

ایک بچے کا انوکھا سفر

مجھے سمندر کی تلاش ہے

اس دور کا فسانہ عجب جب انسان کائنات کی وسعتوں میں منتشر ہو چکا

ملک محمد شاہد اقبال

"مجھے سمندر دیکھنا ہے۔ میں اسے دیکھے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔" اس نے اپنے آپ سے عہد کیا اور صبح سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کئی دن سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری اور وہ تمام ضروری اشیا اپنے بیگ میں رکھ لیں جن کی طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنتا تھا۔ آج یہی ضد اسے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔

صبح پانچ بجے اس نے آہستہ سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ والدین ابھی سو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا۔

اس کا گھر وسیع میدان پر واقع تھا۔ گھر سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ "سمندر کس سمت ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا، کتاب میں پڑھا

www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ سورج مغرب میں سمندر کے اندر غروب ہوتا ہے۔ لہٰذا مغرب کی سمت چلنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ طلوع ہونے کے بعد سورج کی طرف اس کی پشت رہتی۔ یوں وہ سورج کی براہ راست تمازت سے محفوظ رہتا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت تیزی سے چلنے لگا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن آنکھوں میں نوجوان کا عزم صاف جھلکتا۔ اس نے اپنی درسی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان کے مطابق سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہ آتا۔ اس کے شفاف پانی میں وہیل اور شارک جیسے دیوہیکل حیوان گھومتے پھرتے۔ اس نے تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی ننھی مچھلیوں کے غولوں کی تصاویر بھی دیکھیں۔ سمندر میں تیرتے ایسے بڑے بحری جہاز بھی دیکھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے۔

وہ سوچتا کہ حدِنگاہ تک پھیلا پانی، اٹکھیلیاں کرتی موجیں اور ساحل پر بکھری خوبصورت سیپیاں کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔ وہ سوچتا کہ ساحل پر کھڑے ہو کر حدِنگاہ تک پھیلے سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش لگتا ہوگا۔ اس کا ننھا دماغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے دماغ میں وسیع نیلے سمندر کا یہ تصور لیے وہ پختہ عزم کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب قصبے کی حدود سے باہر نکلا، تو صبح کا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا لیکن سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ سڑک کنارے چہرہ آسمان کو تکتا رہتا۔ بوڑھے کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''شاید یہ مجھے روکنے کی کوشش کرے۔'' اس نے سوچا اور قدموں کی رفتار کچھ تیز کر لی، لیکن اسی وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

''اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''سمندر دیکھنے۔'' لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''سمندر؟'' بوڑھے نے پوپلا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ ''اچھا خیال ہے۔ مگر تمھیں اوپر جانا ہوگا۔'' اس نے کپکپاتی انگلی سے دور واقع اونچے پہاڑ کی سمت اشارہ کیا۔

> وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔

لڑکے نے اوپر دیکھا، آسمان پر ستارے غائب ہو چکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے دوڑ لگا دی۔ ''اس بوڑھے کا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ سمندر پہاڑ پر کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ پہاڑ مغرب کی سمت ہی واقع تھا لہٰذا اس کا سفر جاری رہا۔

کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، بوڑھا پہاڑ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''یہ واقعی سٹھیا گیا ہے۔'' لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا اور زبان خشک ہو گئی۔ اس نے رک کر بیگ سے بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پیا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنا کھانا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ''نجانے سمندر کتنی دور ہو، مجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی۔'' لڑکے نے سوچا۔

جلد وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ چوٹی پر

www.pdfbooksfree.pk

کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی بھی سمت سمندر کی علامت نظر نہ آئی۔ اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ لڑکے کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پشت پر لدا بیگ اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھایا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد سامنے ایک وسیع چٹیل میدان اور دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ میدان عبور کر کے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا، تو سورج ڈھلنے لگا تھا۔

"یقیناً ان پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہوگا جس میں یہ سورج غروب ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے پہاڑی سلسلہ عبور کرنے لگا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا، تو یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے کہ سامنے ایک اور وسیع و عریض چٹیل میدان موجود تھا۔ اسی کے کنارے وہ بلند پہاڑ واقع تھا۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں وہ بڑا عظیم الشان لگ رہا تھا۔

لڑکے نے چلنا جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنے طویل سفر کے دوران راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی کسی انسان کی شکل دکھائی دی۔ خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ بہرحال وہ چلتا اور مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ راستے میں کتنی بار سویا۔ سوتے جاگتے اس کے ننھے ذہن میں صرف سمندر دیکھنے کی تمنا بسی تھی۔ اسے کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

تکان کی وجہ سے جب بھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیرتی مچھلیاں دیکھتا، خود کو لہروں سے کھیلتا پاتا اور نیلگوں پانی میں تیرتے ہوئے لطف اٹھاتا۔ اسے ارد گرد رنگ برنگی مچھلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتیں۔

سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا، تو اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی؟ تب کیا سمندر کی لہریں بپھری ہوں گی یا پانی خاموش کھڑا ہوگا؟ کیا ساحل پر اسے اپنے جیسے کچھ اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے اور اس کی خوبصورتی دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے؟

ٹانگوں میں چلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت بھینچے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھیلا راستے ہی میں پھینک دیا۔ یوں کاندھوں کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ مزید کچھ دیر چلنے کے قابل ہو گیا۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی سے کچھ ہی دور تھا، تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چٹیل میدان کی سرخ مٹی حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کرنے لگا۔ اس کے خلائی لباس میں موجود آکسیجن کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا۔

اسی لمحے لڑکے کو جانب مغرب عجب نظارہ نظر آیا۔ وہاں ایک نیلا تارہ افق پر چمک رہا تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ رات کو پہاڑ کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔

یہ زمین تھی اور سمندر بھی وہیں واقع تھا۔ جو اسے دور نظر آیا۔ لیکن لڑکا کبھی وہاں نہ پہنچ سکا۔ اب مریخ سے کسی انسان کے لیے واپس زمین پر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ قدرتی آفات کے باعث وہاں سے نوع انسانی مٹ چکی تھی۔ اور مریخ پہ آباد انسان ایسے ذرائع نہیں رکھتے تھے کہ اپنی جنم بھومی لوٹ جاتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سقراط نے کہا تھا کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں سب کو بدل بدل کر بانٹی جائیں، تو جو لوگ اس وقت خود کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ فی تقسیم کو مصیبت اور پہلی کو نعمت سمجھیں گے۔ اسی موضوع پر ایک انگریز ادیب، جوزف ایڈیسن نے مضمون لکھا "The Endeavour of mankind to get rid of their burden"۔ اسی سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے ایک تمثیلی مضمون لکھا "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔" یہ مضمون اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے میں نئے انداز اور خیال سے لکھا گیا۔

شادی شدہ جوڑے کسی حال میں خوش نہیں رہتے

مغربی بے غیرتی اختیار کرنے سے بھی نتیجہ ڈھاک کے تین پات نکلا!

خادم حسین مجاہد

ہم نے اس عالم رنگ و بو میں جس میاں بیوی کو دیکھا، وہ ایک دوسرے سے تنگ ہی نظر آئے۔ بظاہر خوش و خرم نظر آنے والے جوڑے کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی کہ میاں بیوی واقعی ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ لیکن جب ذرا قریب ہو کے حقیقت حال دریافت کیا، تو یہی پتا چلا، اگر دنیا میں مصیبت کی کوئی مجسم شکل ہے، تو وہ اس کا ساتھی ہے۔

یہ طرفہ تماشا بھی دیکھا کہ ہر کوئی اپنے ساتھی کو، تو مصیبت اور دوسرے کے ساتھی کو، نعمت سمجھتے ہوئے حسد میں بھی مبتلا ہے۔ وہ تمنائی ہے کہ کاش میں کسی طریقے سے اپنا ساتھی بدل سکتا۔ یورپ میں اسی سوچ کے تحت ایسے کلب قائم ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو کر جسے پسند کریں، اس کے ساتھ ناچ بھی سکتے

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اگر دل مل جائیں، تو اکٹھے وقت بھی گزار سکتے ہیں۔ بس کلب کی رکنیت لیجیے اور فائدہ اٹھائیں، طلاق کی ضرورت نہ نئے معاہدہ نکاح کی! چونکہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے اور مرغ بھی روز مے، تو دال کی خواہش کرنے لگتا ہے، اسی انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر کلب والے نوٹ چھاپتے ہیں۔

شاید انہی مغربی اثرات کے تحت حکومت آزادستان کی پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے بل پیش کیا کہ ہر شادی شدہ مرد و عورت کو زندگی میں کم از کم ایک بار باہمی رضامندی سے ساتھی بدلنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بعض بزرگ اور کنوارے ارکان نے اس بل کی مخالفت کی مگر شادی شدہ مرد اور عورتیں اکثریت میں تھے۔ چونکہ جمہوریت میں دو احمقوں کی رائے ایک دانا کی رائے سے برتر ہوتی ہے، اسی لیے بل پاس ہی نہیں بلکہ نافذ بھی ہو گیا۔

پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مذہب پسندوں نے بہت ہنگامہ کیا کہ جب طلاق اور عقد ثانی کا باعزت راستہ موجود ہے، تو اس مغربی بے غیرتی کی کیا ضرورت؟ چونکہ وہ اقلیت میں تھے، اس لیے ڈنڈوں کے زور پہ انھیں خاموش کرا دیا گیا۔

جلد ہی ہر شہر میں بڑے بڑے پنڈال، میدان، ہال، کنونشن سنٹر، اسٹیڈیم اور آڈیٹوریم وغیرہ آباد ہو گئے جہاں لوگ اپنے ناپسندیدہ ساتھی کو چھوڑ کر مرضی کا ساتھی چن سکتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ کسی مرد نے اپنی بدزبان بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے لگائی بجھائی کی ماہر کو۔ کسی نے بدصورت بیوی چھوڑی، تو کسی نے سیاہ رنگت والی۔ کسی نے مسکین بیوی چھوڑی، تو کسی نے غیبت کرنے والی۔ کسی نے لڑاکا بیوی چھوڑی، تو کسی نے حاکمانہ مزاج والی۔ کسی نے پھوہڑ بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے بدکردار کو۔ کسی نے سازشی بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے جاہل کو۔ کسی نے ان پڑھ بیوی کو خیرباد کہا، تو کسی نے زیادہ پڑھی لکھی کو۔ کسی نے ملازمت پیشہ بیوی چھوڑی، تو کسی نے چیخم دھاڑ کرنے والی کو!

اسی طرح کسی عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، تو کسی نے فضول خرچ کو، کسی نے کالے مرد کو چھوڑا، تو کسی نے گھنگنے کو۔ کسی نے شکی مزاج مرد چھوڑا، تو کسی نے بزدل۔ کسی نے سخت گیر مرد سے چھٹکارا پایا، تو کسی نے ہتھ چھٹ سے۔ کسی نے نکھٹو شوہر چھوڑا، تو کسی نے دل پھینک! کسی نے ان پڑھ مرد چھوڑا، تو کسی نے غریب! کسی عورت نے نشئی مرد چھوڑا، تو کسی نے جواری! کسی نے بدتہذیب مرد کو چھوڑا، تو کسی نے ظالم کو! غرض ہر کسی نے کسی ناپسندیدہ خصلت یا خامی کے سبب اپنا جیون ساتھی چھوڑ دیا۔

یہ قدم اٹھانے والے سبھی مرد و زن نے نہایت خوشی و آزادی محسوس کی۔ حتیٰ کہ اکثریت تنہا ہی واپس جانے لگی، مگر حکومتی کارندوں نے روک لیا کہ بدلے میں ساتھی ضرور منتخب کرنا پڑے گا کہ قانون یہی کہتا ہے۔ اکثریت اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی مگر حاکم حکم مرگ مفاجات سے مجبور ہو کر لوگ نئے ساتھی تلاش کرنے لگے۔

اب ہوا یوں کہ جس مرد نے کانی بیوی چھوڑی تھی اس نے گوری چٹی کا انتخاب کیا۔ مگر جلد ہی اس کے نخروں سے عاجز آ گیا۔ جس نے بدزبان بیوی چھوڑ کر خاموش طبع بیوی پسند کی، وہ لگائی بجھائی کی ماہر اور سازشی نکلی۔ جس نے بدصورت بیوی چھوڑ کر خوب صورت کا انتخاب کیا، وہ بدکردار نکلی۔ اسے ہر وقت اس کا پہرہ دینا پڑا۔ جس نے سادہ مزاج بیوی چھوڑی تھی، اس کی نئی بیوی حد سے زیادہ لڑاکا نکلی۔ جس نے پھوہڑ بیوی چھوڑی تھی اس کی نئی بیوی

www.pdfbooksfree.pk

حاکمانہ مزاج والی اور خود سر نکلی۔ جس نے ان پڑھ بیوی چھوڑ کر پڑھی لکھی پسند کی، اس نے چند ہی دن میں بحث و تکرار سے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔

جس نے گھریلو بیوی چھوڑ کر ملازمت پیشہ پسند کی، موصوفہ نے اس کی اور گھر والوں کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا۔ الٹا اسے اس کی خدمت کرنا پڑتی تھی کہ ناشتہ تک بنا کے دینا پڑتا اور کبھی کبھی تو اس کا سر اور ٹانگیں بھی دبانا پڑتیں۔ جس نے علم دشمن بیوی کو چھوڑ کر مطالعے کی شوقین عورت کا انتخاب کیا، وہ ہر وقت کتابوں اور رسالوں میں گھسی رہتی تھی کہ دودھ اور ہانڈی چولھے پر ابل جاتی۔

اسی طرح جس عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، اس کا نیا شوہر فضول خرچ نکلا۔ جس نے فضول خرچ کو چھوڑا تھا، اسے کنجوس مل گیا۔ جس نے کالے کو چھوڑ کر گورے کا انتخاب کیا، لڑکیاں اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی تھیں۔ جس نے ٹھگنے مرد کو چھوڑ کر اونچے لمبے مرد کا انتخاب کیا، وہ اس کے ساتھ چلتی خود کو چھوٹا محسوس کرتی۔ ٹھگنا مرد، تو اس سے دب کر رہتا تھا مگر لمبو جی اسے خاطر ہی میں نہ لاتے۔

جس عورت نے شکی مزاج مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر حد سے زیادہ لاپروا نکلا۔ جس نے بزدل خاوند کو چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد ظالم اور جھگڑالو نکلا۔ جس نے سخت گیر مرد کو چھوڑا تھا، اسے بے غیرت مل گیا۔ جس نے نکھٹو شوہر چھوڑ کر کماؤ ڈھونڈا، وہ اتنا مصروف رہتا کہ اس کے پاس بیوی کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ جس عورت نے ان پڑھ مرد کی جگہ عالم فاضل مرد چنا، وہ اتنا بڑا دانشور تھا کہ اسے اندرون و بیرون ملک دوروں اور لیکچرز ہی سے فرصت نہ تھی۔

جس عورت نے دل پھینک مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر سنگدل نکلا۔ جس نے غریب خاوند چھوڑ کر امیر پسند کیا، وہ اس کی ضروریات تو پوری کرتا، مگر اسے ذرا برابر اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ جس نے نشئی مرد چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد جواری نکلا۔ جس نے جواری چھوڑا تھا، اس کا نیا خاوند نشئی نکلا۔ جس نے سادہ مزاج مرد چھوڑا تھا، اسے جو مرد ملا وہ چالاک و بدکردار تھا۔ اگر کسی عورت کا پرانا مرد زن مرید تھا، تو نیا مرد عورت ذات ہی کے خلاف نکلا۔ اگر کسی کا پرانا مرد بے روزگار تھا، تو نیا سسرال میں پڑا رہتا اور خود کوئی کام کرنا گناہ سمجھتا۔

غرض جس نے بھی کسی خامی کی وجہ سے پرانے ساتھی کو چھوڑا تھا، نئے ساتھی میں بھی کوئی نہ کوئی خرابی پائی۔ وہ اکثر حالات میں پرانی سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے سبھی اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد کرنے لگے کیونکہ اب وہ انھیں نئے ساتھیوں سے بہتر لگے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نئے جوڑے ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہو گئے۔ ان کے لیے ساتھ ساتھ چند لمحے گزارنا دوبھر ہو گیا۔ دراصل سبھی اپنے پرانے ساتھی کے عادی تھے، چاہے وہ جیسے بھی ہوں۔ جو جوڑا اللہ تعالیٰ تخلیق کرے، اکثر اوقات انھیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ ہر انسان میں خامیاں ہی نہیں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کو تحسین کی نظر سے دیکھا جائے، تو خامیاں بھی قابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ بہرحال یہ لاوا ایک دن پھوٹ پڑا۔ مختلف شہروں میں جگہ جگہ ہنگامے اور احتجاجی جلوس شروع ہو گئے۔ سبھی کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یہ بے ہودہ بل ختم کر کے سابقہ جوڑوں کو بحال کیا جائے۔ اب وہ لوگ بھی اس کے خلاف ہو گئے جنھوں نے اسے منظور کرایا تھا۔ لہٰذا بل ختم کر کے پرانے رشتے بحال کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس پر سب نے کلمہ شکر پڑھا اور خوشی خوشی پرانے ساتھیوں کو لیے گھر روانہ ہو گئے۔

◆●●

www.pdfbooksfree.pk

رنگ برنگ

نوع بہ نوع تحریروں میں سے انتخاب

ہاتھ رہتا تھا دعا کی طرح سر پہ

(بیگم صفدر بیگ، لاہور)

ماں اپنے بچوں کی پرورش ایثار، قربانی، محنت اور محبت سے کرتی ہے۔ میری امی جان بھی ایسی ہی ماں تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی انھیں دن رات محنت کرتے دیکھا۔ وہ ایک استاد تھیں، اپنے اسکول کی صدر مدرس اور کچھ اسکولوں کی انتظامی ذمے دار بھی رہیں۔ اس طرح انھوں نے دہری ذمے داریاں ادا کیں۔ والد صاحب کے ساتھ گھر کا معاشی بوجھ بھی بانٹا۔ وہ محنتی استاد تھیں، پڑھائی میں کمزور طالبات پر خصوصی توجہ دیتیں اور دوسری اساتذہ کو بھی اس کی تلقین کرتیں۔

وہ صبح سویرے بیدار ہو کر پہلے نماز فجر ادا کرتیں، تلاوت کلام پاک کرتیں اور پھر ہمارے لیے ناشتا بناتیں۔ گھر کے دیگر کام بھی انجام دیتیں۔ بعض اوقات صبح سویرے کپڑے بھی دھوتیں۔ اس زمانے میں کپڑے ہاتھ سے دھلتے۔ پانی کے لیے ہاتھ سے چلنے والا نل ہوتا۔ گھر کے کام کاج کرنے کے بعد اسکول چلی جاتیں۔ کچھ عرصہ تو ایسا بھی ہوا کہ اسکول دوسرے گاؤں میں ہونے کی وجہ سے مجھے چھے میل روزانہ پیدل چلنا پڑتا۔ اسکول سے واپسی پر عموماً کسی عزیز سے ملنے چلی جاتیں یا کوئی اور معاشرتی مصروفیت ہوتی۔

گھر واپس آ کر کھانا پکاتیں اور بچوں کو سنبھالتیں۔ اس کے علاوہ سلائی کڑھائی بھی کرتیں۔ ہمارے بچپن میں انھیں اپنی والدہ سے مدد حاصل رہی۔ لیکن ظاہر ہے، زیادہ ذمے داری تو انھی کی تھی۔ ہماری پڑھائی کا خیال رکھنا، تربیت اور گھر کی جملہ ذمے داری انھی کے کاندھوں پر تھی کیونکہ والد صاحب تو روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں رہے۔ ہماری ضروریات بن مانگے پوری کرتیں۔ محبت کا زبانی اظہار کم لیکن عملی مظاہرہ زیادہ تھا۔ بچوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنا، تو ہر ماں کا خاصہ ہے۔ لیکن

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے اس سے بڑھ کر ہماری تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ بچوں کی پڑھائی میں سستی یا کمزوری سے بھی مایوس نہ ہوئیں۔ جہاں تک ممکن ہوا، پڑھائی جاری رکھی۔

والدہ کی زندگی میں بڑا صدمہ چھوٹی بہن، بہنوئی اور ان کے چار بچوں کا ریل میں بم پھٹنے سے انتقال ہو جانا تھا۔ اس صدمے نے تو ان کی کمر ہمت پر کاری ضرب لگائی۔ اس حادثے کے کچھ عرصے بعد وہ بیمار ہو گئیں۔ چھے سات سال بعد ہمارے والد کا انتقال ہوا، تو وہ تنہا رہ گئیں۔ بیماری بڑھتی گئی اور وہ کمزور ہوتی گئیں۔ ان کی زندگی کا آخری صدمہ بھی دوسری بہن کا انتقال تھا۔ اس وقت وہ خود بھی بیمار تھیں۔ کمزور صحت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے بہن کی وفات کی خبر انھیں نہ ہونے دی۔

وہ اس دن بہت بے چین تھیں اور بار بار بہن کو یاد کرتیں۔ بعد میں انھیں بتایا گیا تو بہت صبر کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دل کا دکھ اشعار کی صورت اختیار کر گیا۔ انھیں اپنی بہنوں سے بہت محبت تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دو ماہ اسی بہن کے گھر گزارے اور انہی کی بیٹی نے امی کی خدمت کی۔ میں جو اپنے پانچ بچوں کی پیدائش کے مواقع پر ان کی شفقت کا فائدہ اٹھاتی رہی، ان کی خدمت نہ کر سکی۔ اس بات کا ہمیشہ دکھ رہا۔

اک ہاتھ جو رہتا تھا دعا کی طرح سر پر
سایہ تھا وہ ماں کا کہ جو اب اٹھ گیا سر سے

پنجرے کھول دیجیے

(محمد طاہر ضیا، اسلام آباد)

بنی نوع انسان کی طرح بقیہ کائنات کے اندر بھی آزادی پسند ہے۔ ایک تتلی کو چند لمحوں کے لیے پکڑ لیجیے، آزاد ہونے کے لیے وہ بے طرح پھڑ پھڑائے گی۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں نے محض شوقیہ معصوم پرندوں کو پکڑ کر قفس میں ڈال رکھا ہے جہاں وہ ہم جولیوں سے دور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

یہ کس قدر فضول اور بے رحمانہ شوق ہے جس نے ہمیں بے حد خودغرض اور سنگ دل بنا کر رکھ دیا۔ اپنے اس فضول شوق کی تکمیل کی خاطر ہم ان معصوم پرندوں کی آزادی کے دشمن بن بیٹھے جنھیں قدرت نے آزاد پیدا کیا اور کھلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے بال و پر عنایت فرمائے۔ اپنی قبیح حرکت پر نادم ہونے کے بجائے ہم قدرت کی طرف سے عطا کردہ ان معصوم پرندوں کی آزادی سلب کر کے خوش ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو پرندوں کی آوازوں سے پیار ہے، تو کوہساروں اور نخلستانوں کا رخ کریں اور قدرت کی خوبصورتیوں کے مظاہر دیکھنے کے علاوہ حسین اور رنگ برنگے پرندوں کی میٹھی بولیوں سے محظوظ ہونا سیکھیں۔ گھروں کے اندر پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے ہم نادانستہ فطرت کے ساتھ سرد جنگ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیا اس جنگ میں ہم فطرت کو شکست دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن قانون قدرت کی گرفت میں ضرور آ سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام لوگ جو نادانستگی میں اس گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، آج ہی پہلا کام یہ کریں کہ گھروں میں قید پرندوں کے پنجرے کھول دیں تاکہ معصوم اور بے گناہ پرندے اس آزادی سے مستفید ہوں جو قدرت نے ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔

آئیے یہ عہد کریں کہ ہم پرندوں سے سچی دوستی کریں گے۔ اس کے لیے گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے دانہ دنکا اور پانی سے بھری پراتیں رکھوائیے۔ معصوم پرندے قید کرنے والوں کو پیار سے سمجھائیے

www.pdfbooksfree.pk

اور انھیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مقید پرندوں کو آزاد کر دیں۔ میرا حکومت سے مطالبہ ہے، وہ ایسا قانون بنائے کہ لوگ پرندوں کو پکڑ کر ان کا کاروبار نہ کر سکیں۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے، عدالت اسے قرار واقعی سزا دے۔

مسح اور پاؤں دھونے کی حکمتیں

(علامہ محمد الیاس مظفر، ڈی جی خان)

سر اور گردن کے درمیان ''حبل الورید'' یعنی شہ رگ واقع ہے۔ اس کا تعلق ریڑھ کی ہڈی اور حرام مغز اور جسم کے تمام تر جوڑوں سے ہے۔ جب وضو کرنے والا گردن کا مسح کرے، تو ہاتھوں کے ذریعے برقی رو نکل کر شہ رگ میں ذخیرہ ہو جاتی ہے۔ یوں ریڑھ کی ہڈی کے ذریعے ہمارے پورے اعصابی نظام کو توانائی ملتی ہے۔

پاؤں سب سے زیادہ گرد آلود ہوتے ہیں۔ پہلے پہل چھوت پاؤں کی انگلیوں کے درمیانی حصے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وضو میں پاؤں دھونے سے گرد وغبار، جراثیم اور بچے کھچے گندگی کے ذرات پاؤں کی انگلیوں کے درمیان سے نکل جاتے ہیں۔ لہٰذا وضو میں سنت کے مطابق پاؤں دھونے سے نیند کی کمی، دماغی خشکی، گھبراہٹ اور مایوسی (Depression) جیسے پریشان کن امراض دور ہو جاتے ہیں۔

آٹزم... بچوں کی بیماری

آٹزم دماغی نشوونما سے وابستہ بچوں کی بیماری ہے۔ اس میں مبتلا بچے لوگوں سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتے اور ایک ہی طرح کا رویہ یا حرکت بار بار دہراتے ہیں۔ ان بچوں کو رویے اور خیالات عیاں کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ آٹزم ایک بیماری نہیں بلکہ مختلف طبی علامات کا ایک مجموعہ ہے جن میں دماغ وصحت کے مسئلے، توجہ کی کمی اور حرکات میں مشکلات کے مسائل شامل ہیں۔

آٹزم کی علامات 3 سال کی عمر تک کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کچھ بچوں میں 2 سال تک یہ علامات ظاہر نہیں ہوتیں اور وہ اس عرصہ میں جو کچھ سیکھتے ہیں، بھول جاتے ہیں۔

تحقیق کے مطابق لڑکوں میں یہ بیماری لڑکیوں کے مقابلے میں چار پانچ گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 350,000 بچے آٹزم کا شکار ہیں اور یہ تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس بیماری کی خاص علامات یہ ہیں:

- بے چین رہنا یا حرکت کرنے کی خواہش نہ کرنا۔
- کسی سے چھونے سے الجھن محسوس کرنا۔
- ایک ہی حرکت کو بار بار دہرانا جیسے کسی چیز کے گرد گھومنا۔
- بہت آہستہ یا بہت اونچا سننا۔
- بے مقصد رونا اور ہنسنا۔
- ڈر اور خطرے کی سمجھ نہ رکھنا۔

پاکستان ناگزیر تھا

([illegible] خان، گورنمنٹ ڈگری کالج، بٹ خیلہ)

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا، تو بھارتی مسلمانوں کے ساتھ پاکستانی حصے کے مسلمان بھی مل کر موثر اقلیت بن جاتے اور یوں بہتر طور پر اپنے مفادات کی حفاظت کرتے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، بھارت میں ہندوؤں ہی کی اکثریت ہوتی۔ وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرتے اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

بھارت میں مسلمان اب بھی مؤثر اقلیت یعنی آبادی کے 19 فیصد ہیں لیکن ان کا معیار زندگی شودروں سے بھی بدتر ہے۔ ان پر ترقی کا ہر دروازہ بند ہے۔ سرکاری ملازمین میں ان کا حصہ ایک فیصد بھی نہیں۔ تعلیم، معیشت، صحت، صنعت تجارت کسی جگہ ان کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ اور یہ بات خود بھارتی حکومت کے قائم کردہ سچر کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے کہ مسلمان بدترین حالات سے دوچار ہیں۔

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں پاکستان ملا اور ہم مسلمان یہاں سکون سے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔

قرآن پاک اور سائنس
(ڈاکٹر ندیم اکرام، راولپنڈی)

سائنس کے موضوعات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا محتاط روش کا متقاضی ہے۔ لیکن یقیناً یہ تحقیق رجوع الی القرآن کی دعوت دیتی ہے۔ بقول اقبال:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
صد جہان تازہ در آیات اوست
عصر ہا پیچیدہ در آیات اوست
بندۂ مومن ز آیات خدا است
ایں جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآں جہانے دیگرش
یک جہانے عصر حاضر را بس است
گیرا گر در سینہ دل معنی رس است

(اگر تو مخلص مسلمان کی زندگی گزارنا چاہتا ہے، تو وہ قرآن کو چھوڑ کر ممکن نہیں۔ کیا میں تجھے اپنے دل کی سچائی بتاؤں؟ قرآن پاک صرف ایک کتاب نہیں بلکہ یہ تو کچھ اور ہی ہے۔ ہزارہا جہان تازہ اس کی آیات میں پوشیدہ ہیں اور اس کی آیات ہزاروں سالوں کے رازوں کو آشکار کرتی ہیں۔ بندہ مومن اللہ کی آیات میں سے ایک ہے اور اس کے اعمال اس کے مطابق ہیں، جب بھی مسلمان کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ہے، تو قرآن اس کے سامنے اس کے نئے نئے حوالے کھولتا ہے، اس میں دی ہوئی راہنمائی انسانیت کے تمام مسائل کا حل ہے۔ اگر تیرے سینے میں دل زندہ ہے، تو اس کی راہنمائی کو تھام لے۔)

حمد وثنا کی فضیلت
(گل رسول، سیدو شریف)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ترجمہ: ''بے شک نوح ہمارے شکرگزار بندے تھے۔'' بعض مفسرین نے فرمایا ہے، حضرت نوح ہر حالت میں اللہ کی تسبیح وتحمید بیان کرتے تھے۔ کھانے پینے اور لباس غرض ہر نعمت وغیر نعمت پر اللہ کا شکر ادا فرماتے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''بے شک اللہ ایسے شخص کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ عطا فرما دیتے ہیں جو ہر کھانے اور پینے پر اللہ کی حمد وثنا بیان کرے۔''

آپ کا ایک نام شاکر بھی تھا۔ شاکر اس شخص کو کہتے ہیں جو دل اور اپنے اعمال سے ہمہ تن اور ہمہ وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں مصروف ومنہمک رہے۔

www.pdfbooksfree.pk

کرپشن کا خاتمہ بذریعہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی

(غضنفر علی، کراچی)

پاکستان میں کرپشن کا زہر سرکاری اداروں میں سرطان کی طرح سرایت کر چکا۔ کئی عام شہری یا کاروباری حضرات بھی ٹیکسوں کی بچت، غیر قانونی ذرائع یا غیر دستاویزی کاروبار سے جو دولت اکٹھی کرتے ہیں، ان کا حساب بے حد مشکل ہو چکا۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم کاروبار اور معیشت کو دستاویزی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان جرائم کی تفتیش اور پھر عدالتوں میں کرپشن کو ثابت کرنا کیس میں ممکن نہیں ہوتا۔

سرکاری اداروں اور نجی کاروبار میں کرپشن اور غیر قانونی معاملات کی روک تھام کے لیے ستر کی دہائی میں ایف آئی آر اور نوے کی دہائی میں احتساب بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اداروں نے پچھلے کئی عشروں میں تفتیش کو جدید خطوط پر استوار کیا اور چالان عدالتوں میں پیش کیے۔ لیکن دستاویزی ثبوت کی کمی کی بنا پر زیادہ تر کیسوں میں عدالتیں ملزمان کو سزا نہیں دے سکیں۔ بلکہ کئی کیسوں میں ملزمان یا تو ضمانتوں پر رہا ہوئے یا الزامات سے بری ہو گئے۔ ظاہر ہے جو شواہد عدالتوں میں پیش کیے گئے تھے، وہ دستاویزات کے ساتھ مکمل ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں ضروری ہے کہ وطن عزیز میں آمدن اور خرچ کے طریقہ کار کو مکمل طور پر دستاویزی بنایا جائے تاکہ غیر قانونی کام کی گرفت آسان ہو اور انھیں عدالتوں میں بھی قابل قبول بنایا جائے۔ یہ طریقہ قابل عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے مدد لیں۔ اس کے لیے ہم نادرا کے ریکارڈ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس میں تمام پاکستانیوں کا ریکارڈ (Record Data Base) موجود ہے۔ اس طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ تمام پاکستانیوں سے ایک فارم پر کرایا جائے جس میں درج ذیل تفصیلات پوچھی جائیں:

۱۔ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی تفصیل۔

۲۔ ہر قسم کی آمدنی کے ذرائع۔ ۳۔ اخراجات۔ ۴۔ بینک اکاؤنٹس۔ ۵۔ ٹیکس کی ادائیگی، ۶۔ کریڈٹ کارڈ، ۷۔ کلب کی ممبر شپ اگر کسی کی ہے، ۸۔ تعلیمی اخراجات، ۹۔ انشورنس، ۱۰۔ ملکی و غیر ملکی سفر، ۱۱۔ واجبات کی ادائیگی، ۱۲۔ نوکری یا کاروبار کی تفصیلات۔

یہ فارم پر ہونے سے ہر پاکستانی کے اثاثہ جات، آمدنی و اخراجات، نوکری و کاروبار وغیرہ کی تفصیلات نادرا کے ریکارڈ میں شامل ہو جائیں گی۔ پھر کرپشن کے ذریعے حاصل کردہ اثاثہ جات، آمدنی اور اخراجات کو چھپانا ممکن نہ ہو گا بلکہ بلیک اکانومی بھی دستاویزی ہو جائے گی۔ اس پروگرام کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام بے نام و گمنام اثاثہ جات کو دستاویزی بنایا جائے۔ انتقال جائیداد کا طریقہ کار تیز رفتار، سادہ اور کم خرچ کیا جائے تاکہ تمام جائیداد کی تفصیلات موجود ہوں۔

پھر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کر کے جائیداد بناتا ہے اور اس کے اخراجات آمدن سے زیادہ ہیں تو ایسے شخص پر قانونی گرفت نہ صرف آسان ہو گی بلکہ عدالت سے اسے سزا دلانا بھی سہل ہو گا۔ امید ہے ارباب اختیار تجویز کردہ طریقہ کار پر سنجیدگی سے غور کریں گے تاکہ ملک سے نہ صرف کرپشن کا خاتمہ ہو بلکہ ملزموں کو عدالتوں سے سزا دلانا بھی یقینی بن سکے۔

www.pdfbooksfree.pk

دکھی شوہر کی فریاد سن کر

شاکی بیوی کا جواب

ازدواجی زندگی میں تلخیاں گھولنے والے عیاں و مستور نکتے...... ایک قاریہ کے قلم سے

پروفیسر شبانہ اصغر

شمارہ مارچ میں جناب سراج دین کا تحریر کردہ مضمون "ایک دکھی شوہر کی فریاد" زیر مطالعہ رہا۔ موضوع اہم تھا، آغاز دلچسپ اور اختتام اثر انگیز۔ تاہم تحریر پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس ہوا جس کی وجہ غالباً صورت حال کی جانبدارانہ پیشکش تھی۔

صاحب مضمون نے روایتی انداز اپناتے ہوئے مسئلے کی تمام تر ذمے داری صنف نازک کے کاندھوں پر ڈال نہ صرف شوہر حضرات کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنی زود رنج اور زود حساس بیویوں کے لیے بھی "نام نہاد" بیوی کو ذمے دار قرار دینے کی خاطر اپنی چوٹی کا زور لگا ڈالا۔ غالباً وہ اس اصول سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے "پروپیگنڈے میں جیت پہل کرنے والے کی ہوتی ہے۔"

میرے محدود علم اور مشاہدے کی روشنی میں یہ صورت حال جنم لینے کے اسباب کا مختصر جائزہ پیش ہے۔ وہ اس اہم مضمون کا مکمل احاطہ تو شاید نہ کر پائے تاہم دوسرے اہم فریق کے نقطہ نظر کی ترجمانی کا حق کسی حد تک ادا ہو جائے گا۔

ہمارا معاشرتی اور خاندانی نظام اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود چند نقائص کا حامل بھی ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی کے ذہنی تعلق اور خلوت (Privacy) کا خیال کسی بھی سطح پر نہیں رکھا جاتا۔ واضح دینی احکامات کے باوجود ذاتی کمروں میں آمدورفت کی اخلاقیات (Ethics) کا تصور ہی ناپید ہے۔ بہت سے تجربہ کار (شادی شدہ) اور صاحبان علم بھی بنیادی اخلاقی اقدار سے لاعلم ہیں یا ان پر عمل درآمد سے قصداً پہلوتہی اختیار کرتے ہیں۔

خلوت کی کمی اور اس خاندانی مداخلت میاں بیوی کے

www.pdfbooksfree.pk

خصوصی تعلق کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں غلط فہمیاں اور رنجشیں بھی پیدا کرتی ہے۔ نتیجتاً ان کے درمیان غیر محسوس خلیج جنم لیتی ہے۔ جب غلط فہمیاں دور نہ ہوں، تو بدقسمتی سے خلیج بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے، بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کی محبت اور توجہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن تقسیم کا یہ عمل اس لحاظ سے نہایت منفرد ہے کہ پیار اور وفاداری کے خمیر سے گندھے نسوانی وجود میں محبت کا عنصر کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ بدقسمتی سے خود مرد کی ذات کم از کم اظہار کی حد تک ان خوبصورت جذبوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے آغاز میں چاند تارے توڑ کر لانے کی باتیں کرنے والے چھوٹی چھوٹی مگر اہم خوشیوں کے مواقع پر تحائف دینا تو درکنار، تاریخیں یاد رکھنا بھی بھول جاتے ہیں۔ احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ تحائف کا لین دین آپس میں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے اور یقیناً میاں بیوی کا تعلق اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحائف سے مراد قیمتی زیورات یا لباس نہیں۔ خلوص نیت سے کہے گئے چند الفاظ اور مسکراہٹ بھی اظہار محبت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ حقیقتاً یہ ایسا نسخہ ہے کہ "ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آوے۔"

روزمرہ زندگی میں جیون ساتھی سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، تعریف اور حوصلہ افزائی خاتون کو خوش رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مزاج کی خوشگواری گھر کا ماحول آسودہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے تعلق کو مضبوط بناتی ہے۔ کسی قیمت کے بغیر حاصل ہونے والی یہ خوشی بھی ہمارے ہاں نایاب ہو چکی۔

ایک اہم وجہ کی نشاندہی صاحب مضمون نے تحریر میں خود ہی کر ڈالی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے موصوف ایک نامعلوم پیغام موصول ہونے پر گزرے۔ بلند کرداری کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے پیغام نظر انداز کر دیا، لیکن مستقبل میں کسی خوش آئند توقع کے پیش نظر اسے موبائل سے حذف نہیں کیا۔ مردوں کی اکثریت (معذرت کے ساتھ) ایسے مواقع پر علی الاعلان یا پوشیدہ طور پر بیوی کے ساتھ بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے۔ جبکہ عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ شوہر کی عدم توجہی کے باوجود، نیز تمام تر گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے بعد تھکے جسم اور ناخوش ذہن کے ساتھ اس "ذمے داری" کو بھی فرض کی طرح (محض مشین کے مانند) پورا کرے جو درحقیقت میاں بیوی کے درمیان تعلق مضبوط بنانے کا ذریعہ ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ہم قرآن و احادیث نبوی ﷺ سے ایسے حوالے تلاش کرنے میں بہت ماہر ہیں جو ہمارے مفاد اور نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہوں۔ اس قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے "عورت مرد کی کھیتی ہے" ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راہنمائی فراہم کرنے والی اس کتاب روشن میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اسی کتاب ہدایت کی تفسیر قرار دی گئی ہستی مبارک ﷺ نے بھی عورت کو آبگینہ قرار دیا اور ازدواجی تعلق کی پائیداری کے لیے مختلف مواقع پر بحیثیت شوہر بہترین مثالیں قائم کیں۔

مثال کے طور پر ایک حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے: "تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے اور بے شک میں اپنے عیال کے ساتھ سب سے اچھا ہوں۔"

بات ختم وہیں ہوتی ہے کہ شاہراہ زندگی کے طویل سفر میں ہمسفر کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں، تو وقت خوشگوار گزرتا ہے۔ سفر غیر دلچسپ اور پرتکان لگنے لگے، تو روزمرہ کی مصروفیات سے وقت نکال کر شریک حیات پر کچھ توجہ دیجیے تاکہ "حادثات" سے بچا جا سکے۔ سب سے اہم بات یہ کہ گاڑی کے پہیوں میں توازن ضرور رہنا چاہیے ورنہ وہ ہچکولے کھا سکتی ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

آئیے......! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

کتابوں کی کہکشاں

نام کتاب: نبی ﷺ کا اندازِ تعلیم و تربیت، مصنف: قاضی محمد مطیع الرحمن، ناشر: نقش بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، قیمت: ۱۴۰ روپے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تبلیغ کا آغاز فرمایا تو آپ ﷺ کے ساتھی مٹھی بھر صحابہ ہی تھے۔ لیکن محض چند سال بعد ہی لاکھ مربع میل رقبے پر اللہ اکبر کی آواز گونجنے لگی اور عرب کے طول و عرض میں لاکھوں لوگ مسلمان ہو گئے۔ یہ معجزہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت کے سبب ہی رونما ہوا۔ یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کا

فیض تھا جس میں ہمارے لیے دنیا و آخرت کی کامیابیاں پوشیدہ ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے دورانِ تبلیغ کفارِ عرب کو راہِ راست پر لانے کے لیے تعلیم و تربیت کے مختلف انداز اختیار فرمائے۔ جناب مطیع الرحمن نے اپنی تصنیف میں انہی کو عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ شروع کے ابواب اسلامی تعلیم کی تعریف و تاریخ کے لیے مخصوص ہیں۔ اگلے ابواب میں تربیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔

کتاب کے اہم باب ملاحظہ فرمائیے "اسلام میں علم کی اہمیت، تعلیم کے اجزائے ترکیبی، تعلیم و تربیت کی پہلی درس گاہ، طالبانِ صفہ کی مالی حالت، شفقت و رحم دلی، عورتوں کی تعلیم، سوالیہ اندازِ تعلیم، تربیت بذریعہ قصہ گوئی، تربیت بذریعہ شدت و سختی اور تربیت میں حکیمانہ انداز" کتاب میں احادیث نبوی ﷺ، متن کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔

یہ کتاب خوبصورت انداز میں معیاری کاغذ پر طبع

www.pdfbooksfree.pk

ہوئی ہے۔ قیمت کم رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

نام کتاب: حافظان سیری ملوال، مصنف: محمد رشید موی۔ ملنے کا پتا: مکان نمبر ۲۳۸، بلاک ۲، سیکٹر بی ۱۱، ٹاؤن شپ، لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔

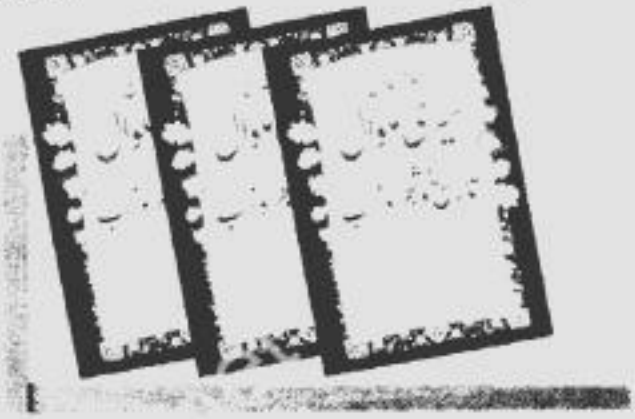

سیری ملوال سابق ریاست لعب کا ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ حافظ برخوردار نامی دینی

شخصیت نے بسایا تھا۔ ان کی اولاد خوب پھلی پھولی اور "حافظان سیری ملوال" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مصنف کے اجداد بھی اس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ اب انھوں نے زیر تبصرہ کتاب میں اپنے خاندان، ریاست لعب اور سیری ملوال سے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

کتاب کی رو سے سلطان محمود غزنوی کے ایک نامور فوجی سردار، میر قطب حیدر شاہ، حضرت علی کے تیسرے بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ جب محمود غزنوی نے ہندوستان فتح کیا، تو میر قطب وادی سون سکیسر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان کی اولاد ہی پھر "اعوان" کہلائی۔ حافظ برخوردار بھی انھی کی اولاد میں شامل تھے۔

مرتب نے متفرق کتب سے استفادہ کرتے ہوئے قیمتی معلومات جمع کی ہیں۔ اس کی طباعت معیاری ہے اور کاغذ عمدہ۔ ہزارہ اور ریاست لعب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اسے مفید کتاب پائیں گے۔

٭٭٭

نام کتاب: پلیز مسٹر پریذیڈنٹ اور علف الف ل م، مصنف: محمد شاہد، ناشر: ۵-۲، پہلی منزل، اندرون فریئر مارکیٹ، ذایف اینڈ ومپ سنٹر، شاہراہ لیاقت، کراچی۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

ایک حساس اور دردمند پاکستانی ملکی حالات پر کڑھتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قلم کار بھی ہو، تو وہ اپنے خیالات و جذبات صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کا شمار بھی انھی پاکستانیوں میں ہوتا ہے۔

جناب محمد شاہد وطن عزیز کے سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات سے خوش نہیں۔ لہٰذا انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور غور و فکر کے موتی صفحات پر بکھیر دیے۔ کتاب کے مضامین میں ارباب علم و دانش کے لیے

مشورے ہیں اور نصیحتیں بھی۔ کتاب کی طباعت و کاغذ معیاری ہے۔

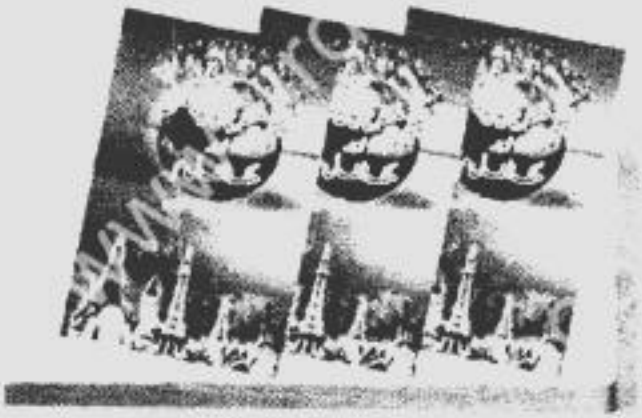

٭٭٭

نام کتاب: تاریخ جھجر، مصنف: مرزا بشارت علی۔ ملنے کا پتا: ۳/۵۲۹، لیاقت آباد، کراچی۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے جب ۱۸۱۳ء میں ریاست جھجر کی بنیاد پڑی۔ یہ دہلی کے قریب ہی علاقہ

www.pdfbooksfree.pk

ہریانہ میں واقع تھی۔ ریاست کا پہلا حکمران، نواب نجابت علی خان اور آخری نواب عبدالرحمن خان تھا۔ ان نوابوں نے ریاست میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں جو اب بھی قائم ہیں۔

نواب عبدالرحمن خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنرل بخت خان سے قبل جنرل عبدالصمد خان دہلی میں شاہی افواج کے کمانڈر تھے۔ ان کا تعلق ریاست جھجر ہی سے تھا۔

بدقسمتی سے جنگ میں انگریز فتح یاب ہوئے۔ انھوں نے نواب عبدالرحمن کو پھانسی دے کر شہید کیا اور ان کی ریاست سکھ سرداروں میں تقسیم کر دی۔

زیر تبصرہ کتاب اسی ریاست جھجر کی تاریخ ہے۔ مصنف اسی ریاست میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، پاکستان چلے آئے۔ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں ریاست جھجر کے محل وقوع، قدیم عمارات، نظام حکومت، اہم شخصیات، ایام جنگ آزادی، حالات بزرگان دین، تذکرہ مشاہیر اور ثقافت و معاشرت کے بارے میں سیر حاصل معلومات دی گئی ہیں۔

طباعت و پیشکش معیاری ہے۔ اسلامی تاریخ و تہذیب سے رغبت رکھنے والے اسے دلچسپ و معلومات افزا کتاب پائیں گے۔

نام کتاب: ہم... ملن آدم!

مصنف: ذیشان شاہد۔ ناشر: ماورا پبلشرز۔ ۶۰ دی مال، لاہور۔ فون ۳۷۳۰۳۳۹۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

حساس اور سوچنے والا انسان اپنے من میں نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ اس نرالی دنیا میں نت نئے خیالات اور نظریات ملتے ہیں۔ بعض انسان اپنی بسائی دنیا پہ چل بستے ہیں۔ کچھ اسے صفحۂ قرطاس پر اتار کر سبھی کے سامنے لے آتے ہیں۔ انھی ہستیوں میں ذیشان شاہد کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ذیشان شاہد معلم ہیں۔ نیز پنجاب یونیورسٹی سے سالماتی حیاتیات میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ معلمی کے ساتھ زیر تبصرہ کتاب بھی تخلیق کر ڈالی۔ اس میں واصف علی واصف کی طرح انھوں نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کیا ہے۔ یہ جملے انسان کو غور و فکر

پر ابھارتے اور اسے حق سے قریب کرتے ہیں۔ چند جملے بطور نمونہ پیش ہیں:

٭ معلوم نہیں، متکبروں نے تکبر کو عاجزوں کے احساس کمتری نے بڑھایا یا اسی احساس کی وجہ سے ان کے تکبر نے جنم لیا۔

٭ انسان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اشیا پرکھنے کے لیے سائنس کا معیار مل گیا اور یہ بدنصیبی کہ وہ ہر چیز کو

www.pdfbooksfree.pk

سائنس سے پرکھنے لگا۔

٭ میں جانتا ہوں وہ بات سمجھ سکتا ہوں لیکن کر عمر شخص کو میرے حوالے نہ کرنا ... میں اسے نہیں سمجھا پاؤں گا۔

کتاب میں اسی قسم کے جملے بکھرے پڑے ہیں جو قاری کو نئے جہان میں لے جاتے ہیں۔ کتاب کی پیشکش عمدہ ہے اور قیمت مناسب! سنجیدہ تحریریں پسند کرنے والوں کے لیے یہ عمدہ تحفہ ہے۔

٭٭

نام کتاب: معصوم اور پریچے

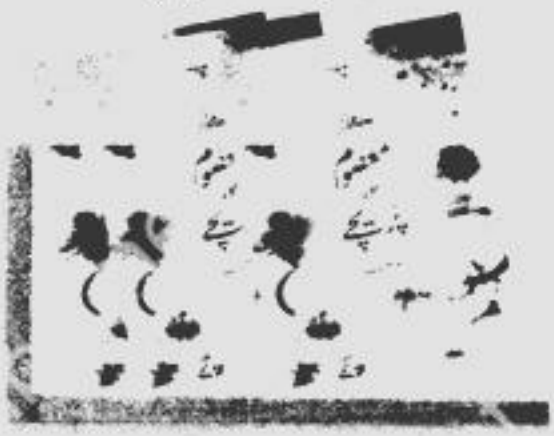

مصنف: گلزار۔ ناشر: بک کارنر، بالمقابل اقبال لائبریری، بک اسٹریٹ جہلم، فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔ قیمت: ۶۰۰ روپے۔

بھارت میں اردو جن لوگوں کے دم قدم سے زندہ ہے، ان میں سمپورن سنگھ اور معروف گلزار کا نام نامی نمایاں ہے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود اردو بولتے، لکھتے پڑھتے اور اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ ہرفن مولا شخصیت ہیں۔ شاعری کرتے، افسانے لکھتے اور فلموں کے ہدایت کار بھی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں گلزار کی دو فلموں ''معصوم اور ''پریچے'' کے منظر نامے طبع ہوئے ہیں۔ منظر نامے سے مراد ایسی کہانی ہے جو مناظر میں بیان کی جائے۔ انگریزی میں یہ اصطلاح ''سینیریو'' (Scenerio) کہلاتی ہے۔ اگر منظر نامے میں ہدایت کار کی خاطر تکنیکی ہدایات مثلاً ''کٹ'' وغیرہ لکھ دی جائیں، تو وہ ''اسکرین پلے'' کہلاتا ہے۔

پریچے فلم ۱۹۷۲ء میں سامنے آئی۔ اس کا اسکرین پلے گلزار صاحب نے لکھا اور ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ فلم معصوم ۱۹۸۲ء میں بنی۔ اس کا اسکرین پلے بھی گلزار نے تحریر کیا۔ ان دونوں فلموں نے بہت شہرت پائی۔ چناں چہ اب ان کا منظر نامہ پڑھنا قاری کو گلزار کی تحریری چاشنی اور ندرت فکر سے آشنا کراتا ہے۔ کتاب میں گویا یہ دو مختصر ناولوں کا روپ دھار چکے۔

کتاب خوبصورت انداز میں طبع ہوئی ہے۔ کاغذ معیاری ہے۔ خوش فکر و خوش رنگ کتب کے شائقین اسے عمدہ پائیں گے۔

٭٭

نام کتاب: نوآبادیاتی عہد میں مسلمانان جنوبی ایشیا کے سیاسی افکار کی جدید تشکیل

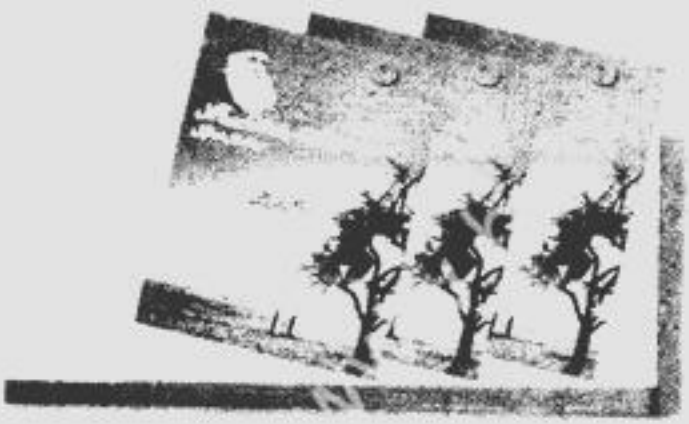

مصنف: ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ڈی-۳۵، بلاک ۵، ایف بی ایریا کراچی، فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰۔ قیمت درج نہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے آٹھ برس تک حکومت

www.pdfbooksfree.pk

کی اور اس ملک کے چپے چپے پر اپنی تہذیب و ثقافت کے نشان چھوڑے۔ جب وہ زوال پذیر ہوئے، تو انگریز آن دھمکے۔ یہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے اقدامات کرنے لگے۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا، ہندوستان سے مسلمان مٹ جائیں گے۔

ایسی گھمبیر صورت حال میں سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو ترقی کی راہ دکھائی۔ ان کی سعی سے مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے لیے بغض و نفرت کم ہوئی۔ سرسید نے مسلمانوں کو زوال سے بچایا، تو ایک اور محسنِ قوم، علامہ اقبال نے انھیں ترقی و عروج کی راہ دکھائی۔ گویا مسلمانانِ ہند کے جدید سیاسی و فکری افکار کی تشکیل میں سرسید اور علامہ اقبال نے نمایاں کردار ادا کیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں دونوں مصلحین کے افکار و نظریات پر گہرائی و گیرائی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ممتاز دانشور، نقاد اور معلم ہیں۔ انھوں نے بڑے مدلل اور دلنشیں انداز میں کتاب کے مضمون سے پورا انصاف کیا ہے۔ کتاب معیاری انداز میں طبع ہوئی ہے۔

نام کتاب: کلیاتِ فراق گورکھپوری۔ مرتب: مطرب نظامی۔ ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ جہلم۔ فون ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔ قیمت درج نہیں۔

اردو غزل کے بہترین شعرا کا انتخاب کیا جائے تو اس میں فراق گورکھپوری لازماً شامل ہوں گے۔ یہ عظیم اردو شاعر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود عمر بھر اردو کی ترقی و ترویج میں سرگرم رہے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ فراق بھارتی سول سروس کے لیے منتخب ہو گئے تھے۔ مگر جب گاندھی جی نے تحریکِ عدم تعاون شروع کی تو انھوں نے سرکاری ملازمت کو لات دے ماری۔ وہ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بطور پروفیسر منسلک ہو گئے اور انگریزی ادب پڑھانے لگے۔

فراق صاحب زود نویس تھے۔ غزل کے علاوہ نظم، رباعی اور قطعے بھی کہے۔ ان کی شاعری کے درجن سے زائد مجموعے شائع ہوئے۔ نثر کی بھی کتب چھپیں۔ انگریزی اور ہندی زبان میں بھی شاعری کی۔ گل نغمہ، رمز، شبستان آپ کی شاعری کے مقبول مجموعے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب فراق گورکھپوری کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا انتخاب ہے۔ اسے بھارت کے ممتاز شاعر

مطرب نظامی نے مرتب کیا ہے۔ پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں فراق کی بہترین شاعری جمع کر دی گئی ہے۔ مرتب لکھتے ہیں کہ غزل کو جو گہرائی و گیرائی، نرمی، معصومیت اور سوز فراق نے عطا کیا، وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

ناشر نے کتاب خوبصورتی و عمدگی سے شائع کی ہے۔ فونٹ بڑا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے۔ طباعت معیاری ہے۔ کلاسیک رنگ میں شاعری کے شوقین اسے دل پسند کتاب پائیں گے۔ (تبصرہ نگار: سید عاصم محمود)

www.pdfbooksfree.pk

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۲۲۵۔ بی** [illegible] **لاہور**

ماہِ اپریل میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۷۳ء (ب) [illegible] مسجد (بادشاہی مسجد)

قصہ کوئز ۲۔ (الف) بابری مسجد (ب) ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء

قصہ کوئز ۳۔ (الف) قطب الدین ایبک (ب) قطب مینار، دہلی

درست جوابات دینے والوں کے نام

[illegible]

مجھی معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

[illegible]

یہی ہے قصہ کوئز

[illegible]

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- [illegible] (مظفر گڑھ)
- احمد [illegible] (بہاولنگر)

[illegible]

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام، پتا اور موبائل [illegible] ضرور لکھا کریں۔ [illegible] (ادارہ)

www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز/۱

بابا فرید، صوفی بزرگ، فرید الدین لقب۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس قصبے کا موجودہ نام چاوٗلی مشائخ ہے۔ والد جمال الدین سلیمان بھی صوفی تھے۔ والدہ قرسم خاتون زہد و تقویٰ کی بنا پر رابعہ عصر کہلاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کھوتووال میں اور پھر ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے ان کی مسجد میں اسلامی فقہ کی مشہور کتاب ''النافع'' پڑھی۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی۔ چناں چہ انھی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ علوم ظاہری و باطنی کے لیے غزنی، بغداد، سیوستان، بدخشاں اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور اس زمانے کے مشہور صوفیا سے اکتساب فیض کیا۔ ۱۲۳۹ء میں آپ کو خرقۂ خلافت ملا، تو آپ نے پاک پتن کو، جو اس زمانے میں اجودھن کہلاتا تھا، مستقل اقامت بنایا۔ زیادہ تر وقت جنگلوں میں گزارا۔

(الف) آپ کا اصل نام کیا تھا اور آپ کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ کہاں مدفن ہیں اور آپ کا مزار کس نے بنوایا؟

قصہ کوئز/۲

بابر ظہیر الدین، مغل بادشاہ۔ ماں پیار سے بابر (ببر) کہتی تھی۔ باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ (ترکستان) کا حاکم تھا۔ بابر باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چغتائی چنگیزی تھا۔ بارہ برس کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ چچا اور ماموں نے شورش برپا کر دی، جس کی وجہ سے گیارہ سال تک پریشان رہا۔ بالآخر ۱۵۰۴ء میں کابل اور غزنی کا حاکم بن گیا۔ فتح سمرقند کے بعد قندھار پر حملہ کیا تاکہ آبائی مقبوضات ہاتھ آ جائیں۔ آخری ناکامی کے بعد ہندوستان کا رخ کر لیا۔ پہلے باجوڑ، علاقہ سرحد بھیرہ، سیالکوٹ فتح کیا۔ ۱۵۲۴ء میں دولت خان لودھی کی دعوت پر لاہور آیا اور دیپالپور فتح کر لیا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو (پانی پت کی پہلی لڑائی میں) شکست دے کر دہلی و آگرہ پر قابض ہوا۔

(الف) تاریخ پیدائش بتائیں اور مشہور خودنوشت کا نام بتائیں؟

(ب) کب اور کہاں وفات پائی؟

قصہ کوئز/۳

فیلڈ مارشل، ایوب خان، سابق صدر پاکستان۔ قیام پاکستان کے بعد وزیرستان میں بریگیڈیر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں میجر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں پاکستان آرمی کے ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷/جنوری ۱۹۵۱ء کو پاک آرمی کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں ملک غلام محمد گورنر جنرل کی سفارش پر وزیر دفاع مقرر ہوئے۔ اسی وزارت نے ''ون یونٹ'' کا منصوبہ تیار کیا۔ ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر مملکت سکندر مرزا نے مارشل لا نافذ کیا اور جنرل محمد ایوب خان کا تقرر سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا گیا، لیکن یہ دوعملی آپ کو پسند نہ آئی اور تین روز بعد ۲۸/اکتوبر کو آپ نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ سکندر مرزا کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ اب جنرل محمد ایوب خان پاکستان کے صدر بھی تھے۔

(الف) کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ نے کب وفات پائی اور کہاں دفن ہیں؟

اشاعت کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت و معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

قدرتی وسائل سے مالا مال "بدقسمت" پاکستان

وطن عزیز قدرتی وسائل کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ممالک میں شامل ہے۔ پاکستان میں کوئلے اور تیل کے وسیع ذخائر واقع ہیں، لیکن ہم لوڈشیڈنگ کے عذاب سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تانبے اور سونے کی کانیں بھی ہیں لیکن ہماری معیشت آئی ایم ایف کے دیے گئے قرضوں سے چلتی ہے۔

پاکستان میں پانچ دریا واقع ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان پر ڈیم بنا کر ۵۰ ہزار میگاواٹ بجلی بن سکتی ہے۔ مگر ہم بجلی کی کمی رو رہے ہیں۔ ہم ایٹمی طاقت اور بہترین فوج رکھتے ہیں مگر کئی برس سے دہشت گردوں سے برسرِپیکار ہیں۔ گندم اور چاول کی پیداوار میں ہمارا شمار بہترین ممالک میں ہوتا ہے۔ لیکن آج ہم کئی لوگ بھوک اور غربت کے باعث خودکشیاں کرتے ہیں۔

مگر ان خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اب تک ایماندار قیادت میسر نہ آسکی۔ حکمرانوں کی توجہ اپنے مفادات کی سمت مرکوز رہی اور وہ ملک کا اچھا انتظام (گڈ گورننس) نہیں کر سکے۔ اب بھی ہمیں محبِ وطن حکمران مل جائیں جو قدرتی وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھائیں، تو پاکستان ترقی و خوشحالی کی راہ پہ گامزن ہو سکتا ہے۔ (سارہ خالد، کراچی)

قومی تمغے یا مذاق

ہم سنتے آئے ہیں کہ حکومت کے کارپرداز ہر سال من پسند شخصیات میں قومی تمغے تقسیم کرتے ہیں۔ ایک شخصیت کے کارناموں اور خدمات کی جانچ پرکھ کا کوئی معیار نہیں اور یہ ایوارڈ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر ریوڑیوں کے مانند بانٹے جاتے ہیں۔ اس سال یہ بات درست ثابت ہوئی۔

روزنامہ ڈان کی خبر کے مطابق اس سال پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ اپلائیڈ سائنسز کے ایک ایسے پروفیسر کو تمغۂ امتیاز دیا گیا جو سرقے میں ملوث ہے۔ ان کو ہائر ایجوکیشن کمیشن بلیک لسٹ قرار دے چکا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی   ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا!
(سعید احمد، لاہور)

اسلام آباد میں "ون ڈش"

۲۰۰۶ء میں سپریم کورٹ پاکستان نے حکومت کو حکم دیا تھا کہ اسلام آباد کے وفاقی علاقے میں تمام شادی ہالوں میں ایک کھانے (ون ڈش) کو رواج دیا جائے۔ لیکن بااثر و طاقتور انتظامیہ نے اس حکم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب نواز شریف حکومت نے حکم دیا ہے کہ عدالتی فیصلے پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔

پاکستان میں شادی کی تقریبات میں بے انتہا فضول خرچی ہوتی ہے۔ کئی طرح کے کھانے پکتے اور غیر ضروری بتیاں لگائی جاتی ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ پورے پاکستان پر ون ڈش کا عدالتی فیصلہ لاگو کیا جائے۔ ہم ایک غریب ملک کے باسی ہیں اور سادگی کو رواج دینے سے سبھی کا بھلا ہوگا۔
(خان اعظم، اسلام آباد)

قارئین کے تبصرے

اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ پڑھتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرتا ہوں۔ شمارہ اپریل میں سرورق کی کرامات والی بات اور [illegible] کی تمام عمدہ تحریریں تھیں۔
(محمد اکبر روحی انصاری، چونگی، لاہور)

شمارہ پسند آیا

شمارہ اپریل پسند آیا۔ "مشورہ دیں ہم" نے شروع کر کے ہماری خواہش کی تکمیل کر دی۔ شکریات اور [illegible] بھی تحریریں دیجیے۔
(محمد نور خان، [illegible] میانی، سرگودھا)

پاکستان کو بلبن مل گیا

ہندوستانی بادشاہ غیاث الدین بلبن کے زمانے (۶۶ ـ ۱۲۸۶ء) میں منگول ارمغانوں نے ہندوستان پر یلغار کیے رکھی۔ تب بلبن نے سب سے زیادہ اندرونی استحکام کی طرف توجہ دی تاکہ بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

پاکستانی قوم کو خوش خبری ملے کہ جنرل راحیل شریف کی صورت ہمیں بھی ایک بلبن مل گیا۔ ۲۳ مارچ کو ان کی زیر قیادت پاک افواج نے اپنی طاقت و صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ اب پاکستان اندرونی و بیرونی دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔

آئی ایس پی آر کے سابق سربراہ، میجر جنرل (ر) اطہر عباس کا یہ بیان چشم کشا ہے کہ سابق سربراہ جنرل اشفاق کیانی جنوبی وزیرستان میں عسکری آپریشن شروع کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ اس ہچکچاہٹ کو تحریک طالبان نے بزدلی سمجھا اور وہ بدولیری سے پاکستانی قوم پر حملہ آور ہو گئے۔

اب یہ امر خوش آئند ہے کہ سیاسی اور عسکری قیادت شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ ان کی کوششوں سے عوام کا اعتماد بحال ہوا ہے۔ نیز حکومت کی بھرپور سعی ہے کہ ملک میں امن و امان قائم کیا جائے۔
(محب زیدی، لاہور)

محمد علی نیکوکارا کی برطرفی

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت کو دیانت دار اور اہل سرکاری افسروں کی تلاش میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ دوسری طرف اسلام آباد کے نیک نام ایس ایس پی، محمد علی نیکوکارا کو برطرف کر دیا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پچھلے دو سال میں اسلام آباد کے آئی جی دو بار تبدیل ہو چکے۔

وزیراعظم نواز شریف کے پہلے دورِ حکومت میں صدر غلام اسحاق خان سے اختلافات رہے۔ دوسرے دورِ حکومت میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ، صدر فاروق لغاری اور پھر جنرل جہانگیر کرامت سے تعلقات خراب رہے۔ جنرل پرویز مشرف سے مجادلہ ہوا، تو انھوں نے ان کا بوریا بستر ہی گول کر دیا۔

اب تک وزیراعظم کو سمجھ جانا چاہیے کہ ملک "ون مین

www.pdfbooksfree.pk

سفارش کی بنیاد پر نہیں چلائے جاتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں آزاد و خودمختار سرکاری ادارے قائم ہوں جن کی سربراہی ایمان دار و اہل افسروں کے ذمے لگائی جائے۔ پھر کسی افسر کی تعیناتی، تبادلے اور برطرفی کے فیصلے متعلقہ ادارے ہی کریں، یہ وزیراعظم یا صدر کا کام نہیں۔

(محمد نواز، کوئٹہ)

والدہ کا انتقال

میری والدہ شرافت، دیانت اور محنت کا حسین مرقع تھیں۔ ہوتیں، وہ پچھلے دنوں وفات پا گئیں۔ لگتا ہے کہ ہم ایک گھنے سایہ دار شجر سے محروم ہو گئے۔ میرا سائبان مجھ سے چھن گیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے اور مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(رانا محمد شاہد، گلستان کالونی، بورے والا)

ٹی وی چینلوں کا معیار

پچھلے دنوں یہ سننے میں آیا کہ حکومت ٹی وی چینلوں کو اخلاقیات و اصولوں کے دائرے میں لانے کے لیے ایک قانون بنا رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کس قسم کا قانون ہو گا، مگر یہ حقیقت ہے کہ ابھی پاکستانی ٹی وی چینل ناپختہ اور ناتجربے کار ہیں۔ یہ بی بی سی اور سی این این کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن نتیجہ اس ضرب المثل کے مطابق نکلتا ہے: "کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔"

مثال کے طور پر انھیں "بریکنگ نیوز" کا پتا تو چل گیا مگر اب تک اسے نہیں سمجھ سکے۔ وہ ہر خبر کے ساتھ "بریکنگ نیوز" کی پٹی ایک آدھ گھنٹے تک مسلسل چلاتے ہیں۔ انھیں اس کی تمیز نہیں ہوتی کہ کوئی خبر اس معیار پر پوری اترتی بھی ہے یا نہیں۔ بریکنگ نیوز چند منٹ ہی کی ہوا کرتی ہے۔

مزید برآں پیش کار عموماً مہذب اور پرسکون انداز میں خبریں نہیں پڑھتے۔ چہرے کے تاثرات اور آواز کے زیر و بم سے لگتا ہے کہ ابھی آسمان گرنے والا ہے۔ حتیٰ کہ سنجیدہ خبریں بھی بے چینی اور گھبراہٹ میں سنائی جاتی ہیں۔

جرائم کی خبروں کو خوب اہمیت دی جاتی ہے۔ انھیں مرچ مسالا لگا کر سنایا جاتا ہے۔ لیکن جرائم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا نئی نسل کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔

مجھے یاد ہے، پی ٹی وی کے زمانے میں خبرنامہ آدھے گھنٹے کا ہوتا تھا۔ تب شروع میں قومی اور عالمی نوعیت کی خبریں سنائی جاتیں۔ پھر صوبائی خبروں کا نمبر آتا۔ آخر میں کھیل اور فلم کی خبریں سننے کو ملتیں۔

اب یہ ہو رہا ہے کہ ٹی وی چینل سب سے پہلے کھیلوں اور فلموں کی خبریں سناتے ہیں۔ کیا ہمارا ذوق اتنا خراب ہو چکا؟ ٹی وی چینلوں کی یہ روش دیکھ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں "گھوڑے کو دانہ دو، ٹی وی چینلوں کو لگام ضرور دو۔"

(شفیق احمد خان، حیدرآباد)

وطن عزیز کا نظام تعلیم

ایک قوم کو ترقی یافتہ اور خوشحال بنانے کے لیے معیاری تعلیمی نظام انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ پچھلے تین چار برس کے دوران گلی محلوں میں اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور اکیڈمیاں کھل چکیں۔ ان میں سے بیشتر کا مقصد پیسہ کمانا ہے، اچھے طلبہ و طالبات پیدا کرنا نہیں۔

یہی وجہ ہے، طلبہ کی اکثریت رٹا لگا کر پاس ہوتی ہے۔ وہ تحریری یا عملی تعلیمی قابلیت رکھتے ہیں، مگر دولت یا سفارش کے بل پر ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یوں محنت کر کے کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کی حق تلفی ہوتی ہے۔

حکومت پاکستان سے میرا مطالبہ ہے کہ قومی نظام تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ اسے عصر حاضر کے ترقی یافتہ ممالک جیسا بنایا جائے، ہر سو علم اور تعلیم و دانش کی شمع روشن ہو جائے۔

(مریم، گجرات)

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ اپریل میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱ (الف) ابو جہل (ب) جنگ یمامہ   اسلامی کوئز ۲ (الف) ابوذر غفاری (ب) مدینہ منورہ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ عمار نذر (ر) محمد سلیمان (اٹک) 2۔ شازیہ الیاس (منڈی بہاؤالدین) 3۔ حمزہ خلیل (جہلم) 4۔ حسن امجد (اسلام آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

محمد صدیق عرفان (واہ کینٹ)، اولوالعزمت حنیف احمد (کراچی)، محمد حنیف احمد (کراچی)، کوثر حنیف احمد (کراچی)، کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک)، نعمہ توقیم (کراچی)، منظر حسین (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، طہ حسنین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، حیان کاشف (حیدرآباد)، ولی حسنین (حیدرآباد)، توصیف احمد (حیدرآباد)، عاطف ممتاز (چکوال)، محسن حبیب (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، حمزہ و شمشاد خان (سرگودھا)، محمد بلال حسین (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس (سرگودھا)، محمد مبشر عباس (سرگودھا)، محمد خلیل عباس (سرگودھا)، شازیہ الیاس (منڈی بہاؤالدین)، حمزہ خلیل (جہلم)، رضوان اکرم (حیدرآباد)، فیصل قریشی (راولپنڈی)، سلام مظفر (راولپنڈی)، احسن روحانی (گوجرانوالہ)، حسن امجد (اسلام آباد)، مریم شیخ (ملتان)

اسلامی کوئز ۱

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہوئے ہیں لیکن چند سال بعد وہ غالب آ جائیں گے اور لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوگا کہ اب ان کی سلطنت کا خاتمہ قریب ہے۔ وہی وقت مسلمانوں کے لیے اپنے دشمنوں پر غلبے کا ہوگا۔ اس سورہ میں مذہب اسلام کی صحت پیش کی ایک مفرد مت ممکنہ کے لیے کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد غالب آنے کی پیشگوئی کر کے اس کی معیاد نو سال قرار دے کر اس بات کی تصدیق کر دی گئی کہ مسلمانوں کی کامیابی کا وقت بھی یہی ہوگا۔

(الف) اس سورہ میں کتنے رکوع ہیں؟ (ب) یہ سورہ قرآن پاک کے کس سے پارے میں ہے؟

اسلامی کوئز ۲

جلال الدین رومی ۶۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلطان العلماء بہاؤالدین مشہور و معروف عالم تھے۔ انھیں ترک وطن کر کے روم (اناطولیہ ترکی) کے شہر قونیہ میں آباد ہونا پڑا۔ والد اور سید برہان الدین محقق سے علوم معقول و منقول پڑھے۔ حصول علم کے لیے حلب اور دمشق میں بھی سفر کیا۔ ۶۴۲ھ میں شمس تبریز سے ملاقات ہوئی جس سے رومی کی زندگی میں ایک روحانی انقلاب آیا۔ علوم کو چھوڑ کر تصوف و عرفان میں ڈوب گئے۔ شمس تبریز سے جدائی کے بعد ان کی یاد میں پرسوز غزلیں لکھیں۔ مولانا کا شاہکار "مثنوی معنوی" ہے۔ اس میں حقائق و معرفت، تصوف کے پیچیدہ مسائل اور اس میں بہت سے اخلاقی مضامین بیان کیے گئے۔

(الف) آپ کی تاریخ پیدائش و وفات کیا ہیں؟ (ب) آپ کے دیوان کا نام کیا ہے؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام، پتا اور TCS آفس کے درست کوائف [illegible] TCS [illegible] TCS [illegible] (مدیر اردو ڈائجسٹ)

انعامات کے لیے تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

www.pdfbooksfree.pk